رجسٹرڈ نمبر اے ۲۱۳۱۲

شمع

اُردو زبان کا ماہوار رسالہ

مدیران

محمد حبیب۔ آکسن۔ بیرسٹرایٹ لا۔ ایم آر۔ اے۔ ایس

پروفیسر مسلم یونیورسٹی۔ علیگڈھ

حسن عابد جعفری۔ آکسن بیرسٹرایٹ لا۔ آگرہ

دارالاشاعت

حسن منزل۔ شاہ گنج آگرہ

قواعد وضوابط

رسالہ شمع ہر ماہ انگریزی کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوتا ہے۔

۲۰ تاریخ تک اگر رسالہ نہ پہونچے تو دوبارہ طلب فرمائیے ورنہ رسالہ قیمتاً روانہ ہوگا۔

قیمت سالانہ ہے ماہوار [illegible] ششماہی ہے ممالک غیر سے سالانہ عہ ششماہی ہے جو ہر حال میں پیشگی لی جائے گی۔

ایک پرچہ کی قیمت [illegible] ممالک غیر سے عہ نمونہ کا پرچہ مفت نہ روانہ ہوگا چھ ماہ سے کم کے واسطے رسالہ جاری نہیں ہو سکتا ہے۔

تین ماہ سے کم کے واسطے پتہ تبدیل نہیں ہو سکتا ہے خریداران اپنے مقامی ڈاک خانوں سے خود انتظام فرما لیں۔

رسالہ کے متعلق ہر قسم کی خط وکتابت و ترسیل زر چندہ و اجرت اشتہارات براہ راست منیجر رسالہ کے ذیل کے پتہ پر فرمائیے۔

مضامین و خطوط متعلق مضامین اڈیٹر شمع کے پاس بمقام آگرہ روانہ فرمائیے۔

نوٹ ۔ چونکہ رسالہ شمع کسی ذاتی منفعت یا ذاتی فائدہ کی غرض سے جاری نہیں کیا گیا ہے اسلئے زر چندہ بذریعہ منی آرڈر پیشگی مرحمت فرما کر کارکنان شمع کو ممنون فرمائیے۔ اور وی۔ پی منگوا کر واپس نہ فرمائیے۔

تین ماہ	معہ	ہے	مہ
چھ ماہ	عہ	صہ	للعہ
یک سال	معہ	ہ	للعہ

پتہ: منیجر رسالہ شمع حسن منزل شاہگنج آگرہ

جلد ۳ ‖ فہرست مضامین رسالہ شمع ماہ فروری ۱۹۲۶ء ‖ نمبر ۲

تصاویر (۱) اکبر فتحپور سیکری کے محل میں پچیسی کھیل رہا ہے (۲) مقبرہ شیخ سلیم چشتیؒ واسلام خاں فتحپور سیکری - آگرہ (۳) دیوان خاص فتحپور سیکری - آگرہ

ضروری اطلاع

شمع کی ڈاک میں بہت ترقی ہو گئی ہے جس کی وجہ سے رسالہ کو ہر ماہ مالی نقصان پہنچتا ہے۔ چونکہ شمع تجارتی اصول پر جاری نہیں ہے اس لئے بادب التماس ہے۔ کہ جواب طلب امور کے لئے ۱ر کا ٹکٹ آنا چاہیئے۔ ورنہ جواب کا انتظار نہ فرمائیے۔

متعدد مرتبہ اعلان کیا گیا ہے کہ شمع کا پرچہ مفت بھیجنے کا قاعدہ نہیں ہے۔ لیکن شمع کے قدردان نمونہ کو مفت طلب کرتے ہیں۔ ہم اُن کو یقین دلاتے ہیں کہ اگر شمع کے اخراجات کثیر نہ ہوتے تو ہم نہ صرف نمونہ کا پرچہ مفت روانہ کیا کرتے بلکہ مستحق حضرات کی خدمت میں اس کو بلا معاوضہ جاری کر دیا کرتے۔ اس بنا پر شمع کو ابتدا ہی سے تجارتی ڈھنگ پر نہیں ڈالا گیا۔ مجبوراً پھر اطلاع کیجاتی ہے کہ (۱) شمع کا نمونہ ۱ر کے ٹکٹ آنے پر یا وی۔ پی بھیجا جائیگا۔ مفت روانہ نہیں ہوگا (۲) مضمون نگار حضرات کو صرف وہی رسالہ مفت دیا جائیگا جس میں اُن کا مضمون ہوگا۔

یقین ہے کہ قارئین کرام ہماری مجبوریوں پر توجہ فرما کر اپنی اعانت اور وسعت اخلاق سے ہمارے لئے سہولتیں پیدا فرمائیں گے ہماری طرف سے وعدہ ہے کہ جس وقت شمع اپنے اصلی معیار پر پہنچ جائیگا وہ سب مراعات جاری کر دی جائینگی جنکی رسالہ اور مدیران رسالہ کی ذات سے توقع کیجاتی ہے۔

سخت ندامت کیساتھ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ جنوری کا پرچہ ایسی حالت میں شائع ہوا جبکہ آگرہ میں طاعون تھا۔ کاتب فرار ہو گئے تھے اور خود منیجر بھی علیل تھا۔ اسی باعث کتابت کی غلطیاں درست نہ ہو سکیں اس نمبر میں غلطنامہ لگا دیا گیا ہے تاکہ قارئین کرام موٹی موٹی غلطیوں کی اصلاح فرمالیں۔ منیجر "شمع"

رسالہ

شمع

بابتہ ماہ فروری سنہ ۱۹۲۶ء

تزک جہانگیری

(بہ سلسلہ ماہ جنوری سنہ رواں)

از جناب مولوی محمد معشوق حسین خاں صاحب بی۔اے (علیگ)

(۲)

شکار کا شوق اور قدر اندازی شکار کا جہانگیر کو اسقدر شوق تھا کہ تزک میں ہر دوسرے تیسرے صفحہ پر اسی کا ذکر ہے۔ آخری زمانہ میں بھی جبکہ مرض غلبہ پاتا جارہا تھا ضعف بہت بڑھ گیا تھا اس وقت بھی جی بہلانے کے لئے شکار کی طرف توجہ فرماتے تھے۔ یہی شوق تھا جس نے بائیس سال اس بادشاہ کو سفر کی تکالیف محسوس نہ ہونے دیں۔ وہ لکھتا ہے:۔

"از اجمیر شریف تا ماندو کہ یکصد و پنجاہ و نہ کروہ بود در عرض چہار ماہ و دو روز"
"بہ چہل و شش کوچ و ہفتاد و ہشت مقام نور دیدہ آمدریں چہل و شش"
"کوچ منازل بہ حسب اتفاق درجاہائے دلکش برکنار تالاب ہا یا جوئیہا و"
"نہر ہائے عظیم کہ پر درخت ہا و سبزہا و خشخاش زار ہا گل کردہ داشت"
"واقع میگشت و روزے نہ گذشت کہ در مقام و کوچ سکار نہ شدہ باشد"
"تمام راہ براسپ و فیل سوار سیر کناں و شکار افگناں می آمدیم و مشقت"
"سفر اصلاً ظاہر نہ شد گویا کہ از باغے نقل می افتاد"

مگر جمعرات اور اتوار کو کوئی شکار نہیں کرتا تھا اس لئے کہ جمعرات اس کے جلوس کا دن تھا اور شب یکشنبہ کو اکبر پیدا ہوا تھا اس لئے اس نے عہد کیا تھا کہ ان دو دن کسی جاندار کا سکار نہ کرونگا۔ وہ اکثر بندوق کا شکار پسند کرتا تھا اور وہ بھی اس طرح کہ تین طرف سے گھیر کر جانوروں کو کھدیرا جاتا اور سامنے لایا جاتا۔ اسے قمرغہ یعنی ہانکا کہتے تھے۔ اس کے علاوہ چیتے۔ باز و جرہ اور جال سے بھی شکار کرتا تھا۔

ذیل میں اس کے سیر و شکار اور قدر اندازی کے چند واقعات تزک سے انتخاب کرکے نقل کئے جاتے ہیں:۔

جلوس کے پہلے ہی سال کا وہ واقعہ لکھا ہے کہ

"مدت سہ ماہ و شش روز اوقات بہ مشغولے سکار گذشت۔ بالضرور"
"ہشتاد و یک جانور بہ تفنگ و یوز و دام و قمرغہ سکار شد۔ ازیں جملہ"
"یکصد و پنجاہ و ہشت جانور خود بہ تفنگ زدہ بودم۔ دو مرتبہ قمرغہ"
"واقع شد۔ یک مرتبہ در گرجہاک کہ پردگیان حرم سرائے عصمت بودند"

"یکصد و پنجاہ و پنج جانور کشتہ شد و مرتبۂ دوم در تتد نہ یکصد و دہ تفصیل "
" مجموع جانوران کہ شکار شدہ بود تورج (یعنی مینڈھا) کوہی یکصد دہشتا د "
" بزکوہی بست دنہ - گورخر دہ - نیلہ گاو نہ - آہو وغیرہ سی صد و چہل وہشت "
جب شکار کرتا تو شمار کرتا جاتا - کبھی کبھی جانور کا پیٹ چیر کر پوٹا دیکھتا کہ کیا کھاتے ہیں اور اُن کے اوضاع ترکیبی پر نگاہ رکھتا - ذرا سا بھی فرق اگر ہوتا تو بھی اس کی نظر سے نہیں چوکتا تھا اکثر تبہ کا ذکر کرتا ہے کہ :-

" دریں تاریخ مرغابے شکار شد فرمودم کہ در حضور پاک کردند - از چینہ دان اوّل "
" ماہیک خورد برآمد - بعد ازاں بقہ کلانے ظاہر شد بمرتبہ کلاں بود کہ تا بچشم خود "
" دیدہ نشود قبول نتواں کرد کہ بایں کلانی تواند فرو برد .... باسوئے "
" زمیندار تلوارہ جانورے بہ نظر در آورد کہ مردم کوہستان ازاجان ہین "
" خوانند - مانند قرقاول (بھٹ تیتر) است تدرو و نیز گویند - رنگش بعینہ "
" برنگ مادہ قرقاول است "

اسی جانور کا حال لکھتا ہے کہ قرقاول سے جثہ میں ڈیوڑھا ہوتا ہے گو تیتر کے آنکھوں کے حلقے سفید ہوتے ہیں مگر اس پرند کے سُرخ ہوتے ہیں - یہ برفستانی پہاڑوں پر رہتا ہے اور علف اور سبزہ اس کی غذا ہے -

ایک مرتبہ شیر کے شکار میں ایک بہت خطرناک صورت پیدا ہو گئی - قصہ طویل ہے مگر تزک سے اقتباس کر کے لکھا جاتا ہے -

" انوپ رائے جو میرے نزدیک کے خدمتگاروں میں سے ہے اُن لوگوں کو جو "
" شکار میں ہمراہ رہا کرتے ہیں مجھ سے کسی قدر فاصلہ پر لیجا رہا تھا - ناگہاں ایک "

"درخت کے پاس پہونچا جس پر چند چیلیں بیٹھی ہوئی تھیں جب ان چیلوں کو "
"اس نے دیکھا تو کمان اور چند منڈے تیر لیکر ان کی طرف بڑھا - اتفاقاً اس "
"درخت کے پاس ایک نیم خوردہ گائے پڑی ہوئی نظر آئی اور اس کے قریب "
"دیکھا کہ ایک بڑا ہیبت ناک قوی الجثہ شیر چند جھاڑیوں میں سے جو نزدیک "
"ہی تھیں اُٹھ کر آگے آرہا ہے گو اس وقت دن صرف دو گھڑی سے زیادہ "
"نہیں رہگیا تھا لیکن چونکہ وہ میرے شکار کے شوق کو جانتا تھا اس لئے خود "
"ہمراہیوں کے ساتھ شیر کو گھیر کر کھڑا رہا اور ایک شخص کو میرے اطلاع "
"کرنے کے لئے روانہ کیا اور مجھے شیر کی خبر دی - جس وقت مجھے خبر پہونچی "
"فوراً گھوڑے پر سوار ہو کر اضطراب کی حالت میں سرپٹ روانہ ہوا - بابا خرم "
"(شاہجہاں) رامداس - اعتماد رائے اور حیات خاں اور دو ایک آدمی اور "
"میرے ہمراہ تھے - میں نے چاہا کہ گھوڑے کی پیٹھ ہی پر سے بندوق چلاؤں "
"مگر یہ دیکھ کر کہ وہ بے طاقتی کر رہا ہے اتر پڑا اور بندوق کا نشانہ جما کر مارا "
"چونکہ میں بلندی پر کھڑا ہوا تھا اور شیر پستی میں تھا یہ نہ معلوم ہوا کہ گولی لگی یا "
"نہیں لگی - اسی وقت مضطربانہ دوسری بندوق ماری معلوم ہوتا ہے کہ یہ "
"لگی - شیر نے اُٹھ کر حملہ کیا - میر شکاری کو جس کے ہاتھ پر شاہین تھا اور اُسکے "
"سامنے ہی اتفاق سے کھڑا ہوا تھا زخمی کر کے اپنی جگہ پر بیٹھ گیا - اس حالت "
"میں ایک دوسری بندوق ایک تپائی پر رکھ کر نشانہ تاکا - انوپ رائے "
"تپائی کو پکڑے کھڑا تھا اس کی کمر میں ایک تلوار اور ہاتھ میں چھوٹا ڈنڈا (کتکہ) "
"تھا بابا خرم بائیں طرف تھوڑی دور کھڑے تھے اور رامداس اور دوسرے "

ملازم ان کے پس پشت تھے اور کمال قراول بندوق بھر بھر کر میرے ہاتھ میں
دیتا جاتا تھا۔ جب میں نے چاہا کہ بندوق سر کروں شیر غراتا ہوا ہماری
طرف چلا اور حملہ آور ہوا اس کے ساتھ ہی میں نے بندوق سر کی اور گولی شیر
کے دہان اور دندان کے سامنے سے نکل گئی۔ بندوق کی آواز سے وہ اور
تیز ہو گیا اور نوکروں کی ایک جماعت جو ایک جگہ اکٹھی کھڑی تھی اس حملہ کو
برداشت نہ کر سکی اور ایک کے اوپر ایک گرنے لگا چنانچہ میں بھی اُن کے دھکہ
اور صدمہ سے اپنی جگہ سے دو ایک قدم پیچھے ہٹ کر گر پڑا۔ مجھے بالتحقیق
معلوم ہے کہ دو تین آدمی میرے سینہ پر پیر رکھ کر میرے اوپر سے گذر گئے
اعتماد رائے اور کمال قراول کی مدد سے میں اُٹھ کھڑا ہوا اس وقت شیر
نے ان لوگوں کی طرف رُخ کیا جو بائیں ہاتھ کی طرف کھڑے تھے۔ انوپ رائے
تپائی کو ہاتھ سے چھوڑ کر شیر کی طرف چلا۔ شیر بھی جس چستی و چالاکی
کے ساتھ حملہ آور ہوا تھا اس کی طرف جھکا۔ وہ بھی مردانہ وار شیر کے
سامنے آیا اور اس ڈنڈے کو جو اس کے ہاتھ میں تھا دونوں ہاتھوں سے
پکڑ کر دو مرتبہ اس کے سر پر مارا۔ شیر نے موہنہ کھول کر انوپ رائے کے
دونوں ہاتھ موہنہ میں لے لئے اور اس طرح چبایا کہ اس کے دانت انوپ رائے
کے دونوں ہاتھوں کے دوسری طرف نکل آئے۔ لیکن وہ ڈنڈا اور چند
انگوٹھیاں جو اس کے ہاتھ میں تھیں بہت کام آئیں۔ اور یہ نوبت نہ آئی کہ اسکے
ہاتھ بیکار ہو جائیں۔ شیر کے حملہ اور دھکہ سے انوپ رائے اس کے
سامنے چاروں خانے چت گرا اس طرح پر کہ اس کا موہنہ شیر کے سینے

کے محاذی تھا۔ اسوقت باباخرم اور رامداس آگے بڑھے تاکہ انوپ رائے کی مدد کریں شہزادے
نے شیر کی کمر پر ایک تلوار ماری اور رامداس نے بھی تلوار کے دو وار کئے ایک وار جو شیر کے
شانے پر پڑا وہ فی الجملہ کارگر ہوا اور حیات خاں نے جو ڈنڈا اسکے ہاتھ میں تھا چند بار شیر کے
سر پر مارا اور انوپ رائے نے بھی زور کرکے شیر کے منہ سے اپنے ہاتھ چھڑائے اور دو چار
گھونسے اس کے کلہ پر مارے اور پہلو کی طرف لوٹ لگا کر زانوں پر سہارا دیکر
سیدھا کھڑا ہو گیا۔ جسوقت اس نے شیر کے مونہہ سے اپنے ہاتھ
نکالے تو چونکہ دانت دوسری طرف نکل آئے تھے اس لئے کچھ گوشت
چر گیا اور شیر کے دونوں پنجے اس کے مونڈھوں پر سے (زخم کرتے
ہوئے) گذرے۔ جس وقت یہ کھڑا ہوا تو شیر بھی کھڑا ہو گیا اور اسکے
سینہ کو ناخن و چنگل سے مجروح کیا چنانچہ ان زخموں سے چند روز تک
اُسے بڑی تکلیف رہی۔ چونکہ زمین ناہموار تھی دونوں دو پہلوانوں کے
مانند ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو کر تلے اوپر غٹ پٹ ہو گئے۔ میں
جہاں کھڑا ہوا تھا وہاں زمین فی الجملہ ہموار تھی۔ انوپ رائے کہتا ہے
کہ اللہ تعالےٰ نے اسقدر سمجھ مجھے دی کہ شیر کو عمداً اس طرف لیگیا
اس کے بعد مجھے خود اپنی خبر نہ رہی۔ اس اثنا میں شیر اسے چھوڑ کر
روانہ ہوا اور وہ اسی بے خبری کے عالم میں تلوار بلند کرکے اس کے
پیچھے دوڑا اور اس کے سر پر وار کیا۔ شیر نے جب اس طرف مونہہ
پھیرا تو دوسرا وار اس کے چہرہ پر لگایا چنانچہ اس کے دونوں آنکھیں کٹ
گئیں اور بھوں پر کی کھال تلوار سے جدا ہو کر اس کی آنکھوں پر الٹ کر

"آ گئے۔ اس حالت میں صالح نام مشعلچی چراغ کا وقت ہونے کی وجہ سے "
"مضطربانہ اندھوں کی طرح شیر کے سامنے آ گیا۔ شیر نے ایک تپانچہ مار کر "
"اُسے گرا دیا اُس کا گرنا اور جان دینا سب گویا ایک ہی واقعہ تھا اتنے "
"میں دوسرے لوگ پہونچ گئے اور شیر کا کام تمام کر دیا۔ چونکہ انوپ رائے "
"سے اس قسم کی خدمت ظاہر ہوئی اور اُس کی جانسپاری خود میں نے "
"اپنی آنکھ سے دیکھ لی اس لئے جب وہ زخموں کی تکلیف سے اچھا "
"ہو گیا اور سعادت ملازمت سے سرافراز ہوا تو میں نے انی رائے سنگھ دلن "
"کا خطاب اُسے بخشا۔ ہندی زبان میں انی رائے کے معنی سردار فوج "
"کے ہیں اور سنگھ دلن سے شیر مار مراد ہے (اس کے علاوہ) شمشیر "
"خاصہ اُسے عنایت کر کے اُس کے منصب میں بھی کسی قدر اضافہ کیا۔"

ہاتھی کے شکار کا ایک دفعہ ذکر کرتا ہے:۔

"کہ با جمعے از بندہ ہائے خاص بہ شکار فیل متوجہ شدم ..... ہر دو "
"فیل را نام کردم۔"

مگر اس شکار کا زیادہ شوق نہیں تھا۔ اس زمانہ میں ہاتھیوں کو گھیر کر کئی طریقے سے گرفتار کرتے تھے، جس طرح اس زمانہ میں بہت طاقتور بندوقوں سے ہاتھی کا شکار کرتے ہیں۔ اُس زمانہ میں بندوق یا تیر سے نہیں کرتے تھے صرف گھیر کر گرفتار کرتے۔ اس شکار کے کئی طریقے بیان کئے ہیں جن کا لطف اصل کتاب میں پڑھنے سے زیادہ آئیگا۔ لیکن شیر کے شکار کا بہت شوق تھا۔ خود کہتا ہے کہ:۔

"ہچناں طبیعت بہ شکار شیر مائل ہست کہ تا شکار آں میسر باشد بہ شکار"
"دیگر دستورے نمی دہد"

پھر سلطان مسعودؒ ابن سلطان محمودؒ کے تلوار سے شیر مارنے کا قصہ بیان کرکے کہتا ہے کہ:-

"مجھے بھی شہزادگی کے زمانہ میں ایسا ہی اتفاق ہوا تھا۔ پنجاب کے حدود"
"میں شیر کے شکار کے لئے گیا تھا۔ وہاں ایک قوی الجثہ شیر باہر"
"نکل کر سامنے آیا۔ ہاتھی پر سے میں نے اس پر بندوق چلائی۔ شیر غصہ"
"کے جھال میں اپنی جگہ سے اُٹھ کر ہاتھی کے سر پر آیا اب اتنا وقت نہ تھا"
"کہ بندوق کو چھوڑ کر تلوار سے کام لیتا۔ بندوق کے سرے کو پھیر کر رانوں"
"کے بل بیٹھ گیا اور دونوں ہاتھوں سے سر بندوق کو اس زور سے شیر"
"کے سر اور مونھ پر مارا کہ اس کے صدمہ سے وہ زمین پر نیچے گر پڑا اور"
"مر گیا"

اسی طرح علیگڈھ کے قریب ایک بڑے بھیڑیے کو تیر سے مارا تھا تیر ایک بالشت اس کے سر میں گھس گیا تھا۔ یہ واقعہ لکھ کر شرماتا ہے اور کہتا ہے کہ:-

"چونکہ خود لکھنا اچھا نہیں معلوم ہوتا اس لئے ان واقعات کے بیان"
"کرنے سے میں قلم کے زبان کو کوتاہ رکھتا ہوں"

اپنی قدر اندازی کا اُسے خود بھی احساس تھا اور کہتا تھا کہ میں بندوق میں اپنے والد کا شاگرد رشید ہوں۔ اودے پور کے رانا امر سنگھ کا بیٹا کرن جب اس کے پاس سے رخصت ہونے لگا تو اُسے اپنی نشانہ بازی دکھانی چاہی ۔ چنانچہ اس واقعہ کو بیان

کرتا ہے :-

"چونکہ کنور کرن کے رخصت ہونے کی گھڑی قریب آگئی تھی میں نے چاہا"
"کہ اپنے تفنگ اندازی کا تماشہ کچھ اُسے دکھلادوں - اس اثنا میں قراولوں"
"نے ایک مادہ شیر کی خبر دی - گو کہ میرا معمول یہ ہے کہ بغیر شیر نر کے"
"شکار نہیں کرتا لیکن اس خیال سے کہ ممکن ہے اُس کے چلے جانے تک اور"
"کوئی شیر دستیاب نہ ہو اس لئے اسی شیرنی کی طرف کرن کو ساتھ لیکر"
"چلا - میں نے کہا کہ جہاں کہو حکمی گولی ماروں - اس قرارداد کے بعد اس جگہ"
"پہونچا جہاں کہ شیر کو گھیر کر رکھا تھا - اتفاقاً ہوا تیز اور تند چل رہی تھی"
"اور جس ہتنی پر میں سوار تھا اُسے شیر کا خوف بے چین کر رہا تھا اور ایک"
"جگہ جم کر وہ نہیں کھڑی ہوتی تھی - ان دو موانع کے باوجود میں نے"
"اُسکی آنکھ کی طرف نشانہ کرکے بندوق سر کی اللہ تعالٰے نے اپنے کرم"
"سے اس راجہ زادہ کے سامنے مجھے شرمندہ نہ کیا اور جیسا کہ قرارداد"
"ہوا تھا اس کی آنکھ میں گولی مار کر میں نے گرا دیا"

ایک روز کا اور اسی طرح شیر کے شکار کا واقعہ بیان کرتا ہے :-

"شیر درخت کے تلے بیٹھا ہوا تھا - ہاتھی پر سے اُس کے مونھ کو تاک کر جو"
"نیم باز تھا میں نے بندوق چلائی اتفاق یہ ہوا کہ گولی اُس کے مونہہ میں لگی -"
"وہاں سے کلّہ میں سے ہوتے ہی بھیجے میں ٹھیر گئی اسی ایک ضرب میں اس کا"
"کام تمام ہو گیا"

ایک اپنے نشانہ بازی کا اور واقعہ بیان کرتا ہے جس کا نقل کرنا دلچسپی سے خالی نہیں ہے -

کہتا ہے:-

"امروز بندوق نمایانی انداختم۔ قضارا در درون دولت خانہ درخت کہرنی واقع"
"شدہ بود قریشیہ (ہرا کبوتر) آمدہ بر سر شاخ بلندی نشست وہمین میانہ"
"سینہ اش بنظر در می آمد بندوق را بروئے دست گرفتہ در میان سینہ اد"
"زدم و از جائیکہ استادہ بودم تا سر شاخ بست و دو گز بود"

جہانگیر نے اپنے شکار کی فہرستیں تیار کی تھیں چنانچہ جب شکار کا سلسلہ ایک بار ختم ہوتا ہے تو بتاتا ہے کہ میں نے کسقدر شکار کئے ایک دفعہ کا حال لکھتا ہے کہ چھپن ۵۶ دن میں ایک ہزار تین سو باسٹھ ۱۳۶۲ جانور شکار کئے جن کی تفصیل یہ ہے :-

"شیر (۷) نیل گاؤ ونر و مادہ (۷۰) سیاہ ہرن (۵۱) پہاڑی بکریاں"
"اور روج (ہرن) وغیرہ (۸۲) کلنگ مور و سرخاب وغیرہ (۱۲۹)"

"مچھلیاں (۱۰۲۳)"

اسی طرح متعدد فہرستیں ہیں لیکن سب میں دلچسپ فہرست یہ ہے :-

"دل میں یہ خیال آیا کہ سن تمیز سے اسوقت تک جسقدر شکار کیا گیا ہے"
"اسی کا شمار کرنا چاہئے .... معلوم ہوا کہ بارہ سال کی عمر یعنے"
"۹۸۸ھ نوسو اٹھاسی ہجری سے اس سال اخیر تک کہ جلوس مبارک"
"کا گیارہواں سال ہے اور میرا سن پچاس قمری سال تک پہنچا ہے۔"
"اٹھائیس ہزار پانسو بتیس ۲۸۵۳۲ شکار میرے حضور میں ہوئے ہیں"
"انمیں سے سترہ ہزار ایک سو سٹھہ ۱۷۱۶۷ جانور خود میں نے بندوق وغیرہ"
"سے شکار کئے ہیں۔ ان میں چرندہ جانور تین ہزار دو سو تین ۳۲۰۳ راس و"

"قلادہ وغیرہ تھے۔ شیر چھیاسی [۸۶]۔ ریچھ۔ چیتے۔ لومڑیاں۔ اُود بلاؤ اور لکڑ بگھے
(کفتار) نو عدد [۹]۔ نیل گاؤ آٹھ سو نواسی [۸۸۹]۔ مہاکہ جو ایک قسم کا ہرن ہے اور نیل گائے
کے برابر بڑا ہوتا ہے پینتیس [۳۵] راس۔ آہو نر و مادہ۔ چکارے۔ چیتل۔ پہاڑی
بکریاں وغیرہ ایک ہزار چھ سو ستر [۱۶۷۰]۔ جنگلی مینڈھے (قوچ) اور آہوئے سُرخ
دو سو پندرہ [۲۱۵]۔ بھیڑیے چونسٹھ [۶۴]۔ جنگلی بھینس چھتیس [۳۶]۔ سور نوے [۹۰]۔ بُنگ
(جو ہرن کی ایک قسم ہوتی ہے) چھبیس [۲۶]۔ پہاڑی بھیڑیں بائیس [۲۲]۔ ارغلی
بتیس [۳۲]۔ گورخر چھ [۶]۔ خرگوش تیئیس [۲۳]۔ پرند جانور تیرہ ہزار نو سو چونسٹھ [۱۳۹۶۴]۔
کبوتر دس ہزار تین سو اڑتالیس [۱۰۳۴۸]۔ لگڑ جھگڑ (شکاری پرند کی ایک قسم ہے)
تین [۳]۔ عقاب دو [۲]۔ قلیواج (ایک قسم کی چیل) تینتیس [۳۳]۔ چغد انتالیس [۳۹]۔ قوطان
(ایک قسم کا خوبصورت پرند) بارہ [۱۲]۔ چیل (موش خوار) پانچ [۵]۔ کنجشک اکتالیس [۴۱]
فاختہ پچیس [۲۵]۔ بوم (اُلو) تین [۳]۔ مرغابی و قاز و کلنگ (قراقل) وغیرہ ایک سو
پچاس [۱۵۰]۔ کوے تین ہزار دو سو چھتر [۳۲۷۶]۔ آبی جانوروں میں مگرمچھ جس سے نہنگ
مراد ہے دس [۱۰] عدد۔"

جانوروں کے حالات کی تحقیق

شکار کے بعد جانوروں کو غور سے دیکھتا اور اُن کے حالات کی تحقیق کرتا رہتا تھا۔ چنانچہ ذیل میں بعض مقامات سے اقتباس کر کے ہم چند جانوروں کے حالات درج کرتے ہیں جو جہانگیر اپنے نظر سے گذرے اور اُس نے تزک میں درج کئے ہیں اس سے اُس کے بیان کی صرف یہی نہیں معلوم ہوگی بلکہ واضح ہوگا کہ نیچرل ہسٹری سے اُسے کس قدر طبعی دلچسپی تھی۔

"اس زمانہ میں سارس کے جفتی کھانے کا واقعہ نظر میں آیا جو اُس وقت تک نہیں"

"دیکھا تھا اور لوگوں میں مشہور ہے کہ ہرگز کسی کے نظر سے یہ نہیں گذرا ہے"
"یہ کلنگ کے جنس سے ایک جانور ہوتا ہے۔ کلنگ سے تقریباً بجم حصہ کلاں تر"
"اس کے سر کے اوپر پر نہیں ہوتے اور جلد ہڈی کے اوپر چپی ہوئی ہوتی ہے"
"پشت چشم سے گردن کا حصہ چھ انگل تک سرخ ہوتا ہے۔ جنگل میں اکثر"
"جوڑے کے ساتھ تنہا رہا کرتا ہے اور کبھی کبھی جھنڈ کے ساتھ بھی نظر آتا"
"ہے۔ اس کے جوڑے کو لوگ جنگل سے گھر میں لاکر پالتے ہیں اور یہ"
"آدمی کے ساتھ ہل جاتا ہے۔ القصہ میری سرکار میں سارس کا ایک جوڑا"
"ہے جس کا میں نے لیلیٰ مجنوں نام رکھا ہے۔ ایک خواجہ سرا نے عرض کی کہ"
"میرے سامنے انھوں نے جوڑا کھایا ہے۔ میں نے حکم دیا کہ اب پھر جب"
"جوڑا کھانے کا ارادہ کریں مجھے خبر کریں (چنانچہ اس نے) سپیدہ"
"صبح کے وقت آکر عرض کی کہ اب پھر جوڑا کھانا چاہتے ہیں۔ یہ سن کر میں اسی"
"وقت تماشا دیکھنے روانہ ہوا .... ممکن ہے کہ مادہ انڈے دے"
"اور بچے بھی نکالے۔ سارس کے اپنے جوڑے سے الفت و محبت کے بہت"
"سے عجیب و غریب قصے سننے میں آئے ہیں۔ چونکہ متواتر لوگوں نے بیان"
"کئے ہیں اور حیرت انگیز ہیں اس لئے ان میں سے ایک یہاں بیان کیا جاتا ہے"
"قیام خاں نے جو اس درگاہ کا خانہ زاد ہے اور فن شکار اور قراولی"
"(یعنی شکار کو گھیر کر لانے) میں بہت واقفیت رکھتا ہے عرض کی کہ ایک"
"روز شکار کو گیا ہوا تھا کہ ایک سارس کو بیٹھا ہوا دیکھا۔ جب میں قریب تر گیا"
"تو وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر چلنے لگا۔ اس کے چال سے ضعف و درد کا اثر"

"معلوم ہوتا تھا۔ جہاں وہ بیٹھا ہوا تھا وہاں جاکر میں نے جو دیکھا تو مٹھی بھر"
" پر ادر ہڈیاں نظر آئیں جنہیں سارس اپنے پیچے رکھ کر بیٹھا ہوا تھا۔ اسکے "
" گرد جال بچھا کر میں ایک کونے میں ہو گیا۔ جب اس نے چاہا کہ اپنی جگہ آ کر "
" پھر بیٹھے تو اس کا پاؤں جال میں پھنس گیا۔ آگے بڑھ کر میں نے اُسے "
" پکڑا۔ جب اٹھایا تو بہت ہلکا معلوم ہوا۔ جب غور کر کے دیکھا تو معلوم ہوا "
" کہ سینہ اور شکم میں بالکل پر باقی نہیں رہے ہیں اور گوشت و پوست "
" جدا ہو کر گر گیا ہے اور کیڑے پڑ گئے ہیں بلکہ تمام بدن میں گوشت نام کو "
" نہیں رہا ہے صرف ایک مٹھی بھر پر اور چند ہڈیاں ہاتھ میں معلوم ہوئیں "
" معلوم ہوا کہ اسکا جوڑا مر گیا ہے اور اس کے فراق میں آج تک اس طرح "
" یہ بیٹھا ہوا ہے ۵ "

" بگداخت تن از ہجر دل افروز مرا افروخت چو شمع آہ جانسوز مرا "
" روز طرم سیاہ شد چو شب غم بہ نشاند فراق تو بدیں روز مرا "

اسی سلسلہ میں آگے چل کر لکھتا ہے :۔

" جس سارس کے جنتی کھانے کا واقعہ میں نے گذشتہ اوراق میں درج "
" کیا ہے اس نے باغیچہ میں خس و خاشاک جمع کر کے پہلے ایک انڈا دیا "
" تیسرے روز دوسرا انڈا دیا۔ سارس کا یہ جوڑا ایک (یا شش؟) ماہ "
" کا تھا جب پکڑا گیا تھا۔ پانچ سال یہاں سرکار میں رہا القصہ شاڑ ہے "
" پانچ سال بعد جوڑا کھایا اور ایک ماہ تک برابر جوڑا کھاتے رہے۔ اور پہلی "
" ماہ امرواد کو جسے اہل ہند کے اصطلاح میں ساون کا مہینہ کہتے ہیں انڈے "

"دیے۔ انڈوں پر مادہ تمام رات بیٹھی رہتی اور نر مادہ کے پاس کھڑا ہوا پہرہ"
"دیتا اور اسقدر چوکنا رہتا کہ کسی جانور کی مجال نہ ہوتی کہ اس کے نزدیک جا سکے۔"
"ایک مرتبہ ایک بڑا نیولا وکھائی دیا نر نہایت زور سے اُس کی طرف دوڑا اور"
"جب تک نیولا سوراخ میں گھس نہ گیا اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔ جب آفتاب عالمتاب"
"نے اپنے نور سے عالم کو منور کیا تو نر نے مادہ کے پاس آکر اس کے پیٹ کو"
"چونچ سے کھجانا شروع کیا۔ اس کے بعد مادہ اُٹھ کھڑی ہوئی اور نر اس کی"
"جگہ بیٹھ گیا۔ پھر مادہ لوٹ کر آئی اور اسی طرح اُسے اُٹھایا اور خود بیٹھ گئی۔"
"مختصر یہ کہ مادہ تمام رات انڈوں پر بیٹھ کر انہیں پرورش کرتی اور دن کے"
"وقت نر و مادہ دونوں باری باری سے بیٹھتے اور اُٹھتے اور بیٹھنے کے وقت"
"نہایت احتیاط سے کام لیتے کہ کہیں انڈوں کو کوئی صدمہ نہ پہونچ جائے۔"
ابھی اس قصہ کو ختم نہیں کرتا بلکہ آگے چل کر کہتا ہے کہ :-
"عجیب بات یہ ہے کہ اور روز تو سارس کا جوڑا پانچ چھ مرتبہ باری باری سے"
"انڈوں پر بیٹھتا۔ لیکن اس رات دن میں کہ مسلسل پانی برستا رہا اور ہوا میں"
"خنکی تھی انڈوں کو گرم رکھنے کے لئے اول صبح سے دوپہر تک برابر نر بیٹھا"
"رہتا اور اس روز سے دوسرے دن صبح تک مسلسل مادہ بیٹھی رہتی کہ کہیں"
"اُٹھنے بیٹھنے سے سردی اثر نہ کر جائے اور انڈوں میں نمی نہ لگ جائے"
"اور وہ خراب ہو جائیں"
اب ان سارسوں کے بچے نکلتے ہیں :-
"جمعرات کی رات اکیسویں تاریخ کو سارس نے ایک بچہ نکالا اور پیر کی رات"

"پچیسویں تاریخ کو دوسرا بچہ نکالا۔ مختصر یہ کہ ایک بچہ چونتیس روز بعد اور دوسرا"
"پچتیس روز بعد نکلا جثہ میں قاز کے بچہ سے دس گیارہ ہوگا یا مور کے ایک ماہ"
"کے بچے کے برابر کہہ سکتے ہیں۔ اس کے روئیں نیلے رنگ کے ہیں۔ پہلے دن"
"کچھ نہ کھایا۔ دوسرے روز سے اس کی ماں نے چھوٹے چھوٹے ٹڈے چونچ"
"میں پکڑ کر کبھی کبوتر کی طرح کھلائے اور کبھی مرغ کے مانند بچے کے سامنے"
"ڈال دیئے کہ خود چن کر کھائے۔ اگر ٹڈا چھوٹا ہوتا تو سالم رہنے دیتی اور اگر ذرا"
"بڑا ہوتا تو بعض کو دو ٹکڑے اور بعض کو تین ٹکڑے کر دیتی کہ فراغت سے"
"اس کے بچے کھا سکیں۔ چونکہ مجھے ان کے دیکھنے کا بہت شوق تھا اسلئے"
"حکم دیا کہ بہت احتیاط سے اس طرح پر کہ ان بچوں کو کوئی آزار اور صدمہ"
"نہ پہونچے میرے سامنے لائیں۔ دیکھنے کے بعد میں نے حکم دیا کہ اسی باغیچہ"
"میں دولت خانہ کے اندر لیجا کر بحفاظت تمام نگاہ رکھیں اور جب چلنے پھرنے"
"لگیں تو پھر میرے سامنے لائیں۔"

مقرب خاں بندر کھمبائت سے تحفے لایا تھا اس میں چند جانور بھی تھے جو یورپ کے تھے اور ہندوستان میں گو اب بہت ہیں مگر اس وقت کہیں نظر نہیں آئے تھے ان میں سے ایک پیرو کی تھا جسے فیل مرغ بھی کہتے ہیں۔ اُسے دیکھ کر جہانگیر کو بہت حیرت ہوئی۔ اس کی تصویر کھنچوا کر جہانگیر نامہ (تزک) میں داخل کی اور یہ حال لکھا جو اپنے صفائی بیان کے لحاظ سے اس لائق ہے کہ اسی کی زبان میں پڑھا جائے۔

"جانوروں میں سے ایک جانور جثہ میں مورنی سے بڑا اور نر سے کسی قدر چھوٹا"
"ہوتا ہے۔ جب مستی کی حالت میں جلوہ میں آتا ہے تو اپنی دُم اور دوسرے"

" پروں کو مور کی طرح پھیلا دیتا ہے اور ناچنا شروع کرتا ہے اس کی چونچ اور"
" ٹانگیں مرغ کی چونچ اور ٹانگوں کی طرح ہوتے ہیں۔ اس کا سر اور گردن اور"
" حلق کے نیچے کا حصہ ہر وقت رنگ بدلتا رہتا ہے۔ جب مستی میں ہوتا ہے"
" تو لال بھبوکا ہو جاتا ہے گویا کہ کل (جسم) مرجان سے سجایا گیا ہے اور تھوڑی"
" دیر کے بعد انہیں مقامات پر سفید رنگ ہو جاتا ہے اور روئی کی طرح نظر آتا"
" ہے اور کبھی فیروزی نظر آتا ہے گرگٹ کی طرح ہر وقت دوسرے رنگ میں"
" دکھائی دیتا ہے۔ گوشت کے دو پارچے جو اس کے سر پر ہوتے ہیں مرغ"
" کے کلغی سے مشابہ ہوتے ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ مستی کی حالت میں"
" گوشت مذکور کا ایک پارچہ سونڈ کی طرح سر کے اوپر ایک بالشت نیچے لٹکتا"
" رہتا ہے اور جب وہ اسے بلند کرتا ہے تو گینڈے کے سینگ کی طرح اسکے"
" سر پر دو انگل کے برابر ظاہر ہوتا ہے۔ اس کے آنکھ کے گرداگرد ہمیشہ"
" فیروزی رنگ ہوتا ہے اور اسمیں کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں ہوتا اور اسکے"
" پر برخلاف مور کے رنگ برنگ کے نظر آتے ہیں"

ایک اور جانور کا حال وہ اسطرح لکھتا ہے کہ ان دونوں ملک زیر باد (یعنی جزائر سماترا جاوا وغیرہ) اسے لوگ ایک قسم کا پرند لائے جس کا رنگ طوطی کی طرح اور جثہ کسی قدر چھوٹا تھا اس کی ایک یہ عادت ہے کہ جس شاخ پر اسے بٹھایا جاتا ہے اسے پنجوں سے مضبوط پکڑ لیتا ہے اور الٹا لٹک جاتا ہے اور اسی طرح رات بھر لٹکا رہتا ہے جب دن نکلتا ہے تو پھر سیدھا ہو کر شاخ پر بیٹھ جاتا ہے .... یہ پانی بالکل نہیں پیتا بلکہ پانی اسکے لیے زہر ہلاہل کا کام دیتا ہے گو دوسرے پرندوں کی زندگی اسی پر ہے۔

جانوروں کے حالات سے اسے اتنی واقفیت تھی اور اسقدر مہارت پیدا ہوگئی تھی کہ اس فن کے اُستادوں کو بھی کم ہوگی۔

ایک مرتبہ ایک تیتر اس کے پاس لائے جس کا واقعہ بہت دلچسپ ہے۔ اور جہانگیر کو علم الحیوانات میں جو کمال تھا اُس کا اس واقعہ سے کسی قدر اظہار ہوتا ہے۔

"انھیں ایام میں ایک دن امام وردی نے جو قراولوں کا افسر ہے"
"شکارگاہ میں ایک تیتر پیش کیا جس کے صرف ایک پیر میں خار تھا"
"اور دوسرے پیر میں نہ تھا چونکہ مادہ میں یہی خار یا یہ الامتیاز ہوتا"
"ہے اس لئے امتحان کے طور پر مجھ سے پوچھا کہ یہ نر ہے یا مادہ"
"میں نے بے ساختہ کہا کہ مادہ ہے۔ اس لئے اس کا پیٹ چاک کیا تو اسکے"
"پیٹ سے انڈا نکلا۔ جو لوگ کہ ملازمت میں حاضر تھے حیرت سے پوچھنے"
"لگے کہ کس علامت سے شناخت فرمایا۔ میں نے کہا کہ مادہ کا سر اور"
"چونچ نر سے چھوٹی ہوتی ہے۔ تحقیقات کرنے اور بارہا دیکھنے کی وجہ سے"
"ایک ملکہ پیدا ہوگیا ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ تمام جانوروں کے"
"گلے کی نالی جسے ترک لوگ خق کہتے ہیں گلے کے سرے سے پوٹہ تک ایک"
"ہی ہوتی ہے لیکن چرز (تو غدار) میں سب سے الگ گلے کے سرے"
"سے صرف چار انگل تک ایک ہی خق ہوتا ہے۔ وہاں سے دو شاخیں"
"ہو کر پوٹے تک جاتی ہیں۔ نیز جس مقام سے دو شاخیں ہوتی ہیں وہاں"
"ایک سر بند (اکا دٹ) ہے اور گرہ کی طرح ایک شے ہاتھ کو محسوس"
"ہوتی ہے کلنگ میں سب سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ اسکا"

"دختن یا پیچ کی طرح سینے کی ہڈیوں میں سے ہوتا ہوا دُم کی ہڈی تک"
" جاتا ہے۔ پھر وہاں سے واپس ہو کر گلے سے مل جاتا ہے۔ چرز (توغداً)"
" دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک سیاہ ابلق دوسرا ایک طرح کا گہرا بھورا۔ مجھے"
" یہ اب معلوم ہوا ہے کہ یہ دو قسمیں نہیں ہیں بلکہ جو سیاہ ابلق ہوتا"
" ہے وہ نر ہے اور جو گہرا بھورا ہوتا ہے وہ مادہ ہے اور اسکی دلیل"
" یہ ہے کہ ابلق میں خصیہ نظر آتے ہیں اور بھورے میں انڈے۔ کئی بار"
" اس کا امتحان کیا گیا۔"

جب مندو کی طرف (جو مالوہ کا ایک شہر ہے) دورہ کرتا ہے تو اس ملک کو دیکھ کر لکھتا ہے کہ:-

"یہاں میں نے دو باتیں ایسی دیکھیں جو دوسری جگہ ہندوستان"
" میں کہیں نہیں ہیں۔ ایک جنگلی کیلا اور دوسرا ممولا کا گھونسلا۔ اب تک"
" کسی شکاری نے اس کا گھونسلا نہیں بتایا تھا۔ اتفاق سے جس مکان"
" میں میرا قیام ہوا وہاں اس کا گھونسلا تھا اور ممولا نے دو بچے نکالے"
" تھے۔"

علی مسجد اور غریب خانہ (کابل کی سرحد) پر اس نے ایک بہت بڑی مکڑی دیکھی جسے دیکھکر اس سے رہا نہ گیا۔ چنانچہ تزک میں لکھتا ہے۔

" در حوالی علی مسجد و غریب خانہ عنکبوت کلانے را کہ در جثہ برابر بہ خرچنگے بود دیدم کہ گلوئے مارے را بدرازی یک و نیم گز خفتہ کردہ و اورا"
" نیم جانے ساختہ است بجہت تماشہ ساعتے توقف نمودم بعد از"

"لمه جان واد"

لوگوں نے جب اس کا مذاق معلوم کر لیا تو جہاں جہاں عجیب غریب جانور نظر آتے جہانگیر کے پاس لاتے چنانچہ حکیم مسیح الزماں اس کے پاس ایک بلی لائے جو خنثائے مشکل تھی۔ جہانگیر لکھتا ہے :-

"مسیح الزماں گربہ آوردہ گذرانید کہ این گربہ خنثی است در منزل من"

"بچہا ہم از و تولید یافت وہم گربہ دیگر جفت شدہ بچہ از وہم رسید"

مارخور بکروں اور بربری بکروں سے اس نے میل ملایا۔ لکھتا ہے کہ چھ ماہ بعد انہوں نے فتحپور میں بچے دیئے۔ بہت خوبصورت خوش شکل اور عمدہ رنگ کے تھے انکا حال لکھتا ہے کہ

"از شوخی ودیگر ادائے مضحک وانواع جست وخیز چہ نویسد۔ ادائے"

"چند مشاہدہ میشود کہ بے اختیار خاطر را بہ تماشائے آن رغبت افزاید"

"......... ازبسکہ مرا خوش آمد فرمودم کہ ہمیشہ نزدیک نگاہدارند و"

"ہر کدام را نامے مناسب آنہا نہادہ شد بغائت محظوظم و در فراہم آوردن"

"بکہ مارخور و بز اصیل بنہایت توجہ دارم"

کبوتروں کو نامہ بری کی تعلیم دی جاتی تھی۔ چنانچہ لکھتا ہے :-

"خلفائے بنو عباس کے زمانہ میں بغداد میں نامہ بر کبوتر تھے جو معمولی"

"کبوتروں سے جثہ میں ڈیوڑھے ہوتے تھے۔ میں نے اپنے ہاں تعلیم دینے"

"کے لئے حکم دیا چنانچہ تعلیم دی گئی۔ اگر وہ مانڈو (مالوہ) سے صبح تڑکے"

"اڑائے جاتے تو سخت بارش کی حالت میں برہان پور ڈیڑھ یا ڈھائی"

"پہر میں پہونچ جاتے اور اگر مطلع صاف ہوتا تو ایک پہر میں اور بعض چار"

"گھڑی میں پہونچ جاتے"

مقرب خاں نے اسے ایک افریقہ کا ہاتھی بھیجا جسے دیکھ کر لکھتا ہے کہ :-

"ہندوستانی ہاتھیوں سے اس کے کان زیادہ بڑے اور سونڈ اور"
"دُم زیادہ لمبی ہے"

چیتوں نے جب اس کے ہاں بچے دیئے تو اسے بہت خوشی ہوئی۔ عام طور پر یہ مشہور ہے کہ یہ تو چیتے بچے نہیں دیتے۔ اکبر کے پاس ہزار چیتے تھے اور اسے بہت خواہش تھی کہ یہ جوڑا کھائیں مگر نوبت نہ آئی۔ جہانگیر کے زمانہ میں ایک چیتہ کے گلے سے پٹہ نکل گیا اور وہ چھوٹ گیا اور ایک مادہ تھی اس سے جفتی کھائی اور ڈہائی مہینہ بعد تین بچے پیدا ہوئے اس کے زمانہ میں شیرنی نے بھی بچے دیئے چنانچہ لکھتا ہے کہ :-

"بحسب اتفاق مادہ شیر آبستن شدہ بعد از سہ ماہ بچہ زائید واین ہرگز نہ شدہ"
"کہ شیر جنگلی بعد از گرفتاری بہ جفت خود جمع شدہ باشد"

باغات، پھول و پھل سے جہانگیر کا شوق

باغوں اور پھولوں کو دیکھکر اُسے خاص قسم کی مسرت ہوتی تھی۔ فطرت کے اس بہارسے جس خوبی کے ساتھ یہ لطف اُٹھایا کرتا تھا وہ اُس کے حسن مذاق پر دلالت کرتا ہے۔ منڈو کے سفر میں سبزی اور خودرو پھولوں کی کثرت دیکھ کر کہتا ہے کہ :-

"گُل چمپا و دیگر ریاحین صحرای بدرجہ شگفتہ بود کہ بہر طرف کہ نظر می افتاد عالم سبزہ"
"و گل مشاہدہ می گشت"

اسی سفر میں آگے ایک گاؤں میں نیلوفر کے پھول دیکھتا اور انکا حال بیان کرتا ہے کہ :-

"گل نیلوفر را کہ بزبان ہندی کمودنی گویند بسہ رنگ می شود - سفید و کبود"

"وسرخ پیش ازیں کبود وسفید دیدہ شدہ اما سرخ تا حال بنظر در نیامدہ بود"
"ودریں تال سرخ گل تلاندو و سبز رنگ مشاہدہ شد بے تکلف گلے ہست"
"بغایت نادر و لطیف چنانچہ گفتہ اند:۔ ع۔
"ز سرخی و تری خواہد چکیدن"

"گل کنول از کودنی کلاں ترمیشود۔ رنگش سرخ چہرہ است ومن در"
"کشمیر کنول صد برگ ہم بسیار دیدہ ام ومقرر است کہ کنول روزمی"
"شگفد وشب غنچہ می شود وکودنی بخلاف آں روز غنچہ می گردد وشب"
"می شگفد"

اپنے تزک کے شروع میں جہاں ہندوستان کے پھول اور پھلوں کا اجمالی حال لکھا ہے وہاں
خوشبودار پھولوں کے حال میں چمپہ۔ کیوڑا۔ رائے بیل۔ مولسری۔ کیتکی۔ اور چنبیلی کے پھولوں
کا بطور خاص ذکر کیا ہے۔
کابل کے ایک باغ کی لطافت اور تازگی کو دیکھ کر کہتا ہے کہ سبزہ پر جوتا پہن کر
چلنا گناہ ہے۔
"طراوت آں بدرجہ ایست کہ بہ کفش پائے بصحن آں نہادن از طبع سلیقہ"
"وسلیقہ درست دور است"
کشمیر کے پھولوں کا حال بیان کرتے وقت لکھتا ہے۔
"یاسمن کبود درباغات فراواں ہست ویاسمن سفید کہ اہل ہند چنبیلی گویند"
"خوشبو می شود قسم دیگر صندلی رنگ است۔ آں نیز بغائت خوشبوئے"
"وایں مخصوص کشمیر است"

پھر چند قسم کے گل سُرخ وگل سوسن کا حال لکھتا ہے۔ ایک پھول کو لکھتا ہے کہ صندلی رنگ کا ہوتا ہے۔

"در غائت لطافت ونزاکت از عالم گل سُرخ وتنہ اش نیز بہ گل سُرخ"
"مشابہ"

آگے لکھتا ہے کہ:۔

"گلہائے کہ در ایلاقات (یعنی ممالک محروسہ) کشمیر بنظر در آمدہ از حساب و"
"شمار بیرون ست انچہ نادر العصری استاد منصور نقاش شبیہ کشیدہ"
"از یکصد گل متجاوز ست"

ایک جگہ کشمیر کے حال میں لکھتا ہے کہ:۔

"انواع گلہا واقسام ریاحین ازاں بیشتر است کہ بہ شمار در آید۔ در بہار"
"جاں نگار کوہ ودشت از اقسام شگوفہ مالامال در ودیوار وصحن وبام"
"خانہا از مشعل لالہ بزم افروز وجلگہ ہائے (یعنی مرغزار ہائے) مسطح وسیع"
"بر گہائے مبروج راچہ گوید"

کابل کے سفر میں وہاں کے باغوں کا حال اور وہاں اپنا گھومنا اور چکر لگانا تفصیل سے لکھا ہے۔ ایکدن کا حال لکھتا ہے کہ:۔

"آج میں نے کابل کے سات باغوں کا چکر لگایا"

شہر آرا باغ۔ مہتاب باغ۔ باغ بیگہ بیگم۔ ارتا باغ۔ باغ حضرت مریم مکانی (یعنی والدہ اکبر) اور باغ سورت خانہ اور سب سے آخر میں چار باغ کا چکر لگا کر مکان واپس آتا ہے۔ پھر ان باغوں کا الگ الگ حال لکھتا ہے۔

آگرہ کے قریب ایک باغ تیار کرایا تھا جس کے متعلق لکھتا ہے کہ :-

" چوں تعریف باغ نورمنزل و عمارتے کہ بتازگی احداث یافتہ مکرر بعرض رسیدہ "
" بود روز دوشنبہ بربارگی شوق سوار شدہ درباغ بستان سرائے "
" منزل گردیدم "

وہاں وہ ایک دن بسر کرتا ہے - ایک دن کا حال لکھتا ہے کہ :-

" روز مبارک شنبہ (یعنی جمعرات) بہ سیر باغ گل افشاں کہ برلب آب "
" جمنا واقع ہست رفتہ شد در اثنائے راہ باراں فرو ریخت وخوب بارید "
" چمن را بتازگی طراوت ولطافت بخشید - انناس بکمال رسیدہ بود "
" سیر مستوفی کردہ شد - از عماراتے کہ مشرف بردریا اساس یافتہ چندانکہ "
" نظر کار می کرد غیر از سبزہ و آب رواں ہیچ محسوس نمی شد - ایں ابیات "
" انوری مناسب مقام افتادہ "

" روز عیش و طرب بستان است		روز بازار گل و ریحان است "
" تودہ خاک عبیر آمیز است		دامن باد گلاب افشان است "
" از ملاقات صبا روئے غدیر		راست چوں آزدہ سوہان است "

یہ وہ عمارتیں ہیں جو خواجہ جہاں کے اہتمام سے باغ نورمنزل میں تیار ہوئی تھیں -

ہندوستان کے پھولوں کے متعلق وہ لکھتا ہے کہ :-

" آگرہ اور اس کے نواح میں خربوزہ - آم - اور باقی دوسرے میوے "
" خوب ہوتے ہیں خود مجھے دوسرے میووں سے آم بہت پسند ہے "
" حضرت عرش آشیانی کے وقت میں ممالک غیر کے بہت سے میوے "

"جو اس وقت تک ہندوستان میں نہیں ملا کرتے تھے ملنے لگے تھے"
"کئی قسم کے انگور مثلاً صاحبی، حبشی، کشمشی اب یہاں شہروں میں عام"
"طور پر ملتے ہیں چنانچہ انگور کے موسم میں لاہور کے بازاروں میں جس قدر"
"چاہیں ہر قسم کے انگور مل سکتے ہیں یہاں کے میووں میں ایک میوہ"
"انناس ہے جو فرنگیوں کے بندرگاہوں میں ہوتا ہے نہایت خوشبودار"
"خوش مزا ہوتا ہے اور آگرہ کے گل افشاں باغ میں ہزاروں کی تعداد"
"میں اترتا ہے"

بندر موخا سے منگا کر خواجہ نظام نے اس کے پاس چند انار پیش کئے جن کا ٹھٹھہ کے اناروں سے مقابلہ کر کے لکھتا ہے کہ:-

"گو ٹھٹھہ کے اناروں میں بیج نہیں ہوتے اور ان میں بیج ہیں لیکن یہ"
"بہت لطیف ہیں اور تازگی میں ٹھٹھہ کے اناروں سے بہتر ہیں"

ایک مرتبہ ایران سے یزدی انار اور کاریزی سردے چند سوداگر لائے۔ ان کی تعریف کرتا ہے اور سب کو تقسیم کرتا ہے اور کہتا ہے کہ حضرت عرش آشیانی (اکبر) کو میوے اور پھلوں کی طرف بہت رغبت تھی افسوس ہے کہ ان کے زمانہ میں نہ آئے۔

"در اوائل ماہ دے سوداگران از ولایت آمدند انار یزد و خربزہ"
"کاریزہ کہ سرآمد خربزہ ہائے خراسان است آوردند چنانچہ جمیع بندہ ہائے"
"درگاہ و امرائے سرحد ازیں میوہ حصہ یافتہ بلوازم شکرگزاری منعم"
"حقیقی پرداختند از غایت گویا فرو ملائے خربزہ و انار را دریافتہ"
"بودیم تا آنکہ ہمہ سالہ از بدخشاں خربزہ و از کابل انار می آوردند غالباً"

"آں خربزہ و انار ہیچگونہ مناسبتے بہ انار یزد و خربزہ کاریز نداشتہ۔ حضرت"
"والد بزرگوارم را انار الشہر بہانہ بہ میوہ میل و رغبت تمام بود افسوس بسیار"
"خوردہ شد کہ ایں میوہ ہا کاشکے در ایام فیروزی بخش آنحضرت از ولایت بہ"
"ہندوستان می آمد"

اسی طرح ایک اور دفعہ کا حال لکھتا ہے کہ:۔

"اس مقام پر کاریز جو ہرات کے پاس ہے وہاں سے بکثرت خربوزے"
"آئے۔ خان عالم نے بھی پچاس بار شتر بھیجے۔ سنین ماضیہ میں کبھی اس"
"کثرت سے نہیں آئے تھے ان میں سے ایک کشتی میں متعدد قسم کے پھل لگا کر"
"میرے سامنے لائے گئے۔ خربزہ کاریزی۔ خربزہ بدخشی و کابلی۔ انگور سمرقندی"
"و بدخشی۔ سیب سمرقندی و کشمیری و کابلی و جلال آبادی۔ اناس جو فرنگیوں کے"
"بندر کا ایک میوہ ہے اور اب آگرہ میں کثرت ہوتا ہے ہر سال خالصہ کے"
"باغات میں ہزاروں کی تعداد میں ہوتا ہے۔ ان میوؤں میں کنولہ بھی ہوتا"
"جو نارنگی کے مانند ہوتا ہے اور کسی قدر چھوٹا اور ذائقہ میں اس سے اچھا"
"ہوتا ہے۔ صوبہ بنگال میں یہ بکثرت ہوتا ہے۔ والد بزرگوار کو میوؤں کا"
"بہت شوق تھا۔ خاص کر خربزوں۔ انار اور انگوروں کا ان کے زمانہ میں"
"کاریز کے خربزے جو اپنی قسم میں سب سے اچھے ہوتے ہیں۔ یزد کے"
"انار جو تمام عالم میں مشہور ہیں اور سمرقند کے انگور ہندوستان میں نہیں"
"آئے تھے۔ جب میں انہیں دیکھتا ہوں تو سخت صدمہ ہوتا ہے کہ کاش کے"
"ان کے زمانہ میں آئے ہوتے تا کہ وہ بھی ان سے لطف اٹھاتے"

جنگلی کیلوں کے متعلق لکھا ہے کہ :-

"فقیروں اور غریبوں کی یہ غذا ہے مگر جب میں نے چکھی تو سخت ثقیل"
"اور بے مزہ معلوم ہوئے ان سے ایک قسم کی مٹھائی بنتی ہے جو مزے"
"میں بالکل فالودہ کی طرح ہوتی ہے۔"

سونا کیلا جب اس کے سامنے لائے تو اُسے کھا کر کہتا ہے کہ :-

"میں نے ایسا کیلا کبھی نہیں کھایا تھا - ایک انگلی کے برابر ہوتا ہے اور نہایت شیریں"
"اور خوش ذائقہ ہے اور دوسرے قسم کے کیلوں سے کوئی مشابہت نہیں"
"رکھتا مگر کسی قدر ثقیل الہضم ہے - میں نے دو کھائے تھے پھر بھی گرانی محسوس"
"ہوئی۔"

ایک مرتبہ کابل سے حسینی انگور آئے جن کی تازگی کی تعریف کرکے لکھتا ہے کہ :-

"زبان ایں نیاز مند درگاہ ایزدی از ادائے شکر نعمت ہائے او قاصر است،"
"کہ با وجود سہ ماہ مسافت را انگور کابل در دکن تازہ بتازہ می رسد۔"

آگرہ کے نواح میں خواجہ جہاں کے خربوزوں کی ایک فالیز تھی - وہاں ایک دفعہ تمام بیگمات کو لیکر گیا اور وہیں فالیز پر سارا دن بسر کیا - ٹہلتا جاتا اور ایک ایک کیاری کو غور سے دیکھتا جاتا تھا - رات بھی وہیں کشتیوں پر گذاری - دوسرے دن پھر فالیزوں کا معائنہ کرتا رہا اور شام تک واپس ہوا۔

تمام میووں میں آم اُسے سب سے زیادہ پسند تھا - چنانچہ ایک مرتبہ کا ذکر کرتا ہے کہ :-

"درہمیں روزہا انبہ بسیار سے از اطراف ولائت دکن و برہان پور و"
"گجرات و پرگنات مالوہ بہ میوہ خانہ خاصہ شریفہ آوردہ بودند باآنکہ ایں ولایت"

"بہ خوش آبگی معروف و مشہور اند و شیرینی و کم ریشگی و کلانی انبہ کم جائے برابری"

"بہ انبہ ایں ولایت میکند چنانچہ مکرر در حضور فرمودم کہ بوزن در آید وزنہ یک سیر"

"و یک پاؤ بلکہ چیزے زیادہ ظاہر گشت غایتاً بخوش آبی و لذت و چاشنی و کم تفلی"

"انبہ چپرامئو[1] کہ در حوالی آگرہ واقع است زیادتی بر جمیع انبہ ہائے ایں ولایت"

"و سایر جاہائے ہندوستان دارد"

قدردانیاں اور کثرت انعام واکرام

امرائے دولت اور صاحب علم و فن کی قدردانی جہانگیر سے زیادہ شاید ہی ہندوستان کے کسی بادشاہ نے کی ہو مصداق مشتے نمونہ از خروارے۔ چند مثالیں ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

ایکمرتبہ بادشاہ حافظ نادعلی گوینده پر کچھ بخشش کرنا چاہتا تھا حکم دیا کہ آج (یعنی یکم ربیع الاول یازدہم سنہ جلوس کو) جسقدر نقد و جنس نذرانہ میں داخل ہو حافظ موصوف کو انعام دیدیا جائے کوئی دن ایسا نہ جاتا جو کسی کا منصب نہ بڑھایا جاتا کسی کو انعام و بخشش نہ ہوتی۔ خلعت و سلاح عطا نہ ہوتے اور غریب غربا کو خیرات نہ ملتی۔ اس کی مثالیں تزک میں تقریباً ہر صفحہ پر نظر آئیں گی۔ مُلّا اسد جو میرزا غازی کا ملازم ٹھٹھہ سے ایکبار بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا یہ داستان گو تھا اس کا طرز بیان اتنا شیریں تھا کہ جہانگیر کو اس کی صحبت بہت پسند آئی اور محظوظ خاں کا خطاب ہزار روپئے نقد خلعت۔ گھوڑا۔ ہاتھی اور ایک پالکی بطور انعام عطا فرمائے اور دو صدی منصب اور بیس سوار سے بخشش فرمائی۔

جہانگیر نے ایک قاعدہ مقرر کیا تھا کہ جب دو گھڑی رات گذر جائے تو اس کے سامنے

[1] یہ مقام مغلوں کے زمانہ میں سرکار قنوج میں تھا اور اب فرخ آباد (ممالک متحدہ آگرہ) کے ضلع میں ہے۔ ۱۲

درویش اور اہل حاجت پیش کئے جا یا کریں۔ ان لوگوں کو وہ خود اپنے ہاتھ سے نقد وجنس عطا فرماتا۔ ایک دفعہ کا ذکر کرتا ہے کہ:-

"بدست وحضور خود پنجاہ و پنج ہزار روپیہ و یک لک و نود ہزار بگہہ زمین"
"وچہار دہ موضع در دو بست (یعنی مسلم) و بست و شش قلبہ زراعت"
۳۲
"ویازدہ ہزار خرد ار شالی مرحمت نمودم و ہشتصد و سی و دو و دانہ مرد ارید"
"بقیمت سی و شش ہزار روپیہ بہ جمعے از بندہ ہا کہ از روئے اخلاص"
"گوش خود را سوراخ نمودہ بودند عنایت کردم"

سعیدائے زرگر باشی کو جس نے سلطان سنجر کی مداح امیر معزی کی ایک نظم پر جس کا پہلا شعر یہ ہے ؎

اے آسمان سعر حکم روان تو کیواں پیر بندہ و بخت جوان تو

جہانگیر کی شان میں ایک غزل لکھی تھی حکم دیا کہ سونے میں تول دیں۔ اس غزل کے چند شعر یہ ہیں ؎

اے نہ فلک نمونہ از آستان تو دوران پیر گشتہ جوال در زمان تو
بخشد دل تو فیض و بخوید سبب چو مہر جانہا ہمہ فدائے دل مہربان تو
یارب چہ گوہری تو کہ از درخت در ازل جانہائے قدسیان ہمہ از نور جان تو
باد اجہاں بکام تو اے پادشاہ عہد در سایۂ تو خرم شاہ جہان تو

استاد پورن اور کلیان نے اس کے خنجر کا ایک قبضہ تیار کیا تھا جو اس کی مرضی کے بالکل موافق تیار ہوا۔ حکم دیا کہ استاد پورن کو ایک ہاتھی۔ خلعت اور طلائی کڑا عطا کریں۔ اور کلیان کو "عجیب دست" کا خطاب دیکر منصب بڑھایا۔ خلعت اور جواہر کی ایک پہونچی عطا کی۔

یہی قدر دانیاں تھیں جن سے علم و ہنر کی ترقی ہوتی تھی۔ جس نئے شہر میں جاتا اور

دارالسلطنت سے جب کبھی باہر جاتا اور جب وہاں واپس آتا سواری کے قریب برابر زر نقد نثار کرتا جاتا تھا۔ یہی زمانہ تھے جن میں لوگوں کی کہاوت کے مطابق من (ایک قسم کا طلائی سکہ) برساکرتا تھا۔

عذر پذیری وخطا بخشی

یہ صفت اس خاندان عظیم میں جوہر خاص کے طور پر تھی۔ تزک میں اسقدر کثرت سے جہانگیر کی خطا بخشی کے واقعات درج ہیں کہ خود اصل کتاب ہی میں پڑھنا چاہیے۔ یہاں صرف اشارۃً دو ایک واقعات کا ذکر کیا جاتا ہے۔

خان اعظم میرزا عزیز کوکہ نے ایک خط راجہ علی خاں حاکم خاندیس کے نام لکھا تھا جس میں جہانگیر اور اکبر دونوں کو بہت کچھ برا بھلا کہا تھا۔ جب یہ خط جہانگیر کو ملا تو اس کے غصہ اور حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ وہ شخص جسے اکبر و جہانگیر نے خاک سے اٹھا کر آسمان پر چڑھایا تھا اب انہی اپنے مربیوں کو ایسا برا بھلا کہتا ہے۔ جہانگیر نے اس موقع پر نہایت حلم سے کام لیا اور میرزا کو قلعہ گوالیار میں قید کر دیا۔ کچھ دنوں بعد اکبر کو خواب میں دیکھا کہ میرزا عزیز کی سفارش کرتا ہے۔ چنانچہ اس کے بعد چھوڑ دیا اور جب وہ حاضر ہوا تو پھر قدیم انعام و اکرام شروع کر دیئے اور اسے دیکھ کر ایسا شرمایا کہ گویا خود ہی قصور وار ہے۔

رام چند ربندیلہ نے کئی بار سر اٹھایا تھا۔ ایک بار راجہ باسو کو اس کی سرکوبی کے لئے روانہ کیا۔ چنانچہ وہ گرفتار ہو کر آیا اور سامنے پابزنجیر کھڑا تھا خیال تھا کہ سر قلم کر دیا جائیگا مگر جہانگیر نے راجہ باسو کی سفارش پر خطا معاف کر دی اور حکم دیا کہ زنجیریں کھول دی جائیں اور خلعت عطا کیا جاوے اور نوازشات آیندہ کی توقع دلائی جائے۔

مسلمان اور راجپوت امرا اور ان کے عزیز و اقارب نے جب کبھی سر اٹھایا اور گرفتار

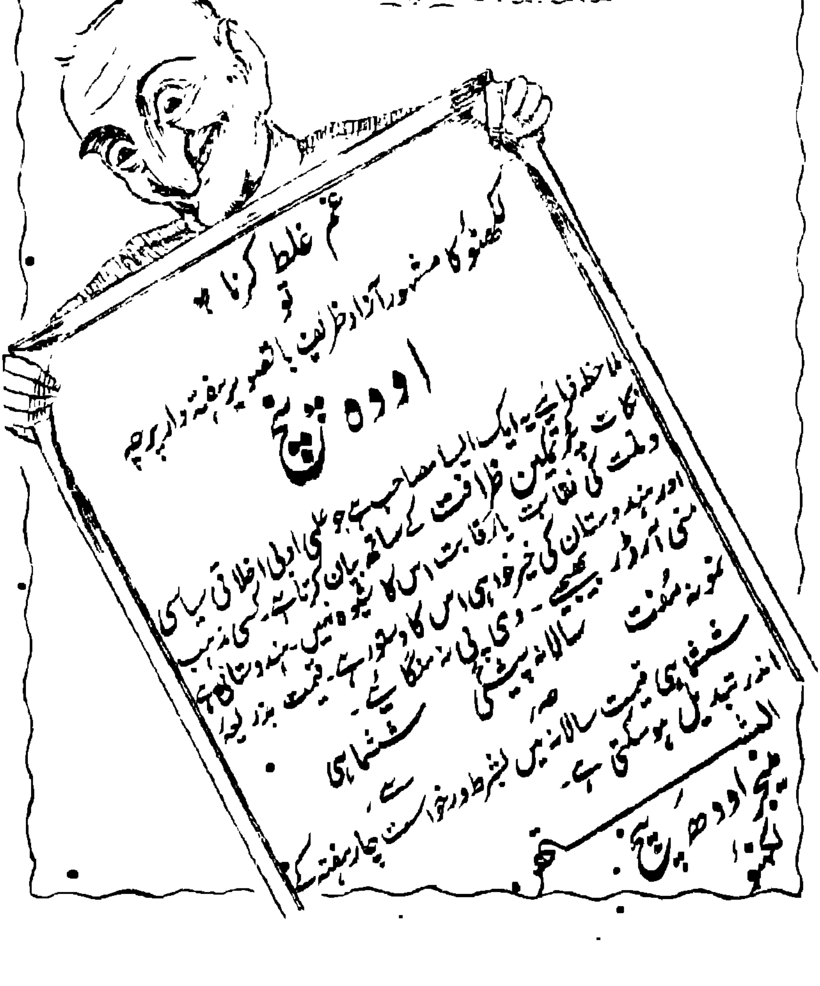
ہو کہ آپ نے تو کم ایسا ہوا ہے کہ عفو تقصیر نہ ہوئی ہو۔ خسرو کی طرفداری کا الزام اکبری جہانگیری بڑے بڑے امرا پر تھا حتیٰ کہ راجہ مان سنگھ بھی اس سے پاک نہ تھے۔ ان میں سے اکثر لوگ یہ چاہتے تھے کہ خسرو تخت نشین ہو اور جہانگیر کو تخت سلطنت نہ ملے۔ جب خسرو کے اور اس کے طرف داروں کی کوششیں ناکام رہیں تو ایک ایسا وقت آیا کہ یہ سب امیر امرا خوف سے لرزاں تھے مگر جہانگیر نے سب کی عفو تقصیر کر دی اور کبھی حرف شکایت زبان پر نہ لایا۔ حتیٰ کہ عبدالرحیم خرو جو سب سے زیادہ خطاوار تھا اس کی بھی آخر میں خطا بخش دی۔

آخیر زمانہ میں جب شاہجہاں سے خفگی تھی تو اس کے طرفداری کا بھی الزام بڑے بڑے امیروں پر آیا حتیٰ کہ عبدالرحیم خاں خانخاناں بھی اس سے نہ بچ سکے اور انکا خطاب و منصب و جاگیر سب ضبط کر لیا گیا اور ان کے لڑکے داراب کو سزائے موت ملی مگر جب خود خانخاناں جہانگیر کے سامنے حاضر ہوئے تو گلے سے لگالیا۔ تمام خطائیں معاف کر دیں اور پھر پرانا منصب و جاگیر و خطاب عطا فرمایا۔ غرض کہ عفو تقصیر اس خاندان کا خاص شیوہ تھا اور کم ایسے بدنصیب ہوں گے جو اس نعمت سے محروم رہتے ہوں۔

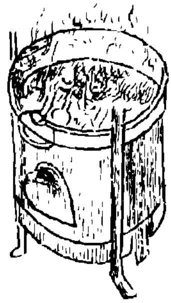
سادگی طبع باوجودیکہ جہانگیر اس طمطراق کا بادشاہ تھا مگر اس کی طبیعت حد درجہ سادہ تھی مذکورۃ الصدر اکثر واقعات سے اس کی سادگی طبیعت کا اظہار ہوتا ہے۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ صوبہ گجرات کے دورہ پر جب گیا تو احمد آباد میں کچھ دن قیام کیا۔ علمادین و مشائخ شہر سے ملا اور ہر ایک پر کچھ نہ کچھ بخشش فرمائی۔ وہاں کے لوگوں کی غذا کے حال میں لکھتا ہے کہ:-

"یہ لوگ: جرہ کی کھچڑی کھایا کرتے ہیں جسے لذیذہ کہتے ہیں باجرہ ایک"
"قسم کا غلہ ہے جو ہندوستان کے سوا کسی اور ملک میں نہیں ہوتا۔ اور"

"بمقابلہ ہندوستان کے دوسرے ملکوں کے گجرات میں بہت زیادہ ہوتا ہے"
"اور اکثر لقولات کے مقابلہ میں سستا بھی ہے چونکہ میں نے یہ کبھی نہیں"
"کھایا تھا اس لئے حکم دیا کہ کچھ کھچڑی پکا کر میرے لئے لائیں۔ میں نے اسے"
"چکھا ذائقہ سے خالی نہیں ہے اور میری طبیعت کے مناسب ہے میں نے"
"حکم دیا کہ جن دنوں میں صوفیانہ غذا کھایا کرتا ہوں اور گوشت نہیں کھاتا"
"باجرے کی کھچڑی اکثر تیار کیا کریں" (باقی آیندہ)



انگیٹھی



(از حضرت ابوالکمال مولوی سید عبدالودود صاحب درد، بریلوی)

یہ انگیٹھی آگ کی رکھی ہے میرے روبرو
میں نے یہ سمجھا کہ بیٹھا ہے یہ کوئی شعلہ رو

ہے یہ میرے سینۂ سوزاں کے شعلوں کی بھڑک؟
ہو رہی ہے وادیٔ ایمن میں یا کچھ پھر چمک

اتفاقاً عنصر ناری ہوا ہے پا بہ گل؟
یا کسی محبوب کا ہے ایک روئے مشتعل؟

آتش سیال کی ہے یا کہ ہلکی سی شعاع؟
تاکہ فی الجملہ ہو محروموں کو اس سے انتفاع؟

یا بصد ساماں حدت ایک قرص آفتاب
کر رہی ہے دل جلوں کا اور بھی سینہ کباب؟

اُڑ رہا ہے یا کسی کا یہ نقاب احمریں؟
آ گئی ہے طیش میں شاید کوئی پردہ نشیں؟

پیر میخانہ بحمد اللہ ہے مہماں نواز
ہو گیا ہے فیض ساقی سے در میخانہ باز

یا یہ اک ادنیٰ نمونہ ہے مزاج یار کا؟
یا کہ خاکہ ہے کسی مہجور قلب زار کا؟

یا کسی فرقت زدہ کا آتشیں بستر کہوں؟
التہاب دل سے اپنے یا اسے تشبیہ دوں؟

لطفِ تشبیہات تاکے ، تبصرہ کچھ اور ہو ۔۔۔ اہلِ معنی کے لئے بھی تاکہ وجہ غور ہو

جس طرح سے یہ انگیٹھی آگ سے لبریز ہے ۔۔۔ اور گردوپیش میں اپنے یہ حدّت بیز ہے
مشتعل ہے جسم خاکی میں بھی مجمر قلب کی ۔۔۔ آپ نے کچھ غور فرمایا ہے اس پر بھی کبھی؟
جبتلک روشن ہے یہ ۔ ہے سب قوی میں انتعاش ۔۔۔ زندگی کا ہے حقیقت میں یہی رنگ تماش
زلیست کہتے ہیں جسے وہ ہے اسی پر منحصر ۔۔۔ اور بغیر اس کے کہاں ہے زندگی کا لطف پھر؟

ہوگیا بدقسمتی سے جب یہ آتش خانہ سرد
پھر نہیں رہتی ہے باقی مرد میں تابِ نبرد

ایک دل میں بھی سلگتی ہو اگر واقع میں آگ ۔۔۔ وہ اڑا دیتا ہے ساری بزم میں بوتل کے کاگ
ایک دل سے آگ لگ جاتی ہے محفل بھر میں پھر ۔۔۔ جمع ہوجاتے ہیں دم بھر میں قوائے منتشر

اس انگیٹھی پر نظر آتی ہے شعلوں کی لپک ۔۔۔ ہے قوائے باصرہ کو جس سے پیہم اک جھپک
ماوراء اس پردۂ لرزاں کے دیکھو غور سے ۔۔۔ صاف لرزندہ سی آتی ہے نظر ہر ایک شے
گو کہ ان اشیا کو فی الواقع نہیں حاصل سکون ۔۔۔ دیکھنے والوں پہ طاری ہے مگر سحر العیون
جب انگیٹھی سامنے سے آپ کے ہٹ جائیگی ۔۔۔ ارتعاشِ چشم کی حالت سعاً مٹ جائیگی

بس نہیں دنیا میں احساسات کا کچھ اعتبار
ہے اضافی حالتوں پر ان کا یکسر انحصار

ایک جنگ عظیم کا احتمال

مشرق اور مغرب سے امیدیں

(از جناب حاجی محمد صادق صاحب صادق۔ ایوبی)

یہ اہم مضمون مشہور انگریزی ریاست داں کمانڈر آنریبل جے ایم کینو وردی آر، این، ایم۔ پی کے مضمون کی تلخیص ہے، غیر ضروری باتیں حذف کردی گئی ہیں۔

مسٹر کینو وردی کے متعلق انگریزی نقطہ نظر یہ ہے "کہ آپ کے لئے برطانوی کابینہ وزارت خالی ہے"۔

اس سے قبل کہ میں نفس مضمون کی حقیقت کے متعلق کچھ کہوں، پہلے مسٹر سید حسین اڈیٹر "نیو اورمنٹ" (امریکہ) کی رائے صائب سُن لیں، فرماتے ہیں کہ "یہ مضمون ایک حقیقت ہے اور وہ بھی کھلی ہوئی جس کا ہر لفظ تجربہ کی بنا پر لکھا گیا ہے"۔

اس مضمون میں مابعد جنگ یورپ، دنیا کے سیاسی حالات پر دلچسپ اور دھندلے اشارے کئے گئے ہیں جس کا ہر اشارہ ایک افسانہ کی حقیقت پنہاں رکھتا ہے۔

بہرکیف اس مضمون کی حقیقت کچھ بھی ہو، لیکن یہ واقعہ ہے کہ یورپ

نہیں بلکہ دُنیا امن کے راگ الاپ رہی اور الاپنا چاہتی ہے، اور نہیں چاہتی کہ امن کو توڑ کر فسادکا ڈنکا بجایا جائے۔

امریکہ صلح کا حامی ہے، ہنگری آزادی کی دنیا لیے ہوئے ساکت اور خاموش ہے۔ ناروے میں ایک وطنی جمعیت اس غرض سے قایم کی گئی ہے کہ بالشوک کے مُضر اثرات کا مقابلہ کیا جائے۔ سویڈن اور صوبجات بالٹک کو سوویٹ پروپگنڈا جو دنیا کے اکثر حصہ میں اپنی سمیت پھیلا چکا ہے، اور پھیلا رہا ہے بے چین کئے دیتا ہو۔ فن لینڈ اپنی محافظت میں یکسر منہمک ہے، اطالیہ برابر کہے جا رہا ہے کہ "جس کی لاٹھی اُس کی بھینس"، فرانس کو اب مظلوم کہلا نہیں آتا ہے، بذات خود ستمگر ہو چلا ہے۔ جرمنی کے سینہ میں مختلف النوع کیفیتیں مستور ہیں۔

روس مستقل ارادہ کر چکا ہے کہ امنیت کی دیوی پر ضرور حملہ کیا جائے۔ دنیائے اسلام میں عجیب افراط تفریط ہے، زخم کے بھرنے تلک پھر ناخن بڑھ آتے ہیں، جس سے بیچارگی کی اور بھی دشواریاں بڑھ جاتی ہیں، ٹرکی کا حق غصب کیا جا رہا ہے، لیگ آف نیشن بڑھ بڑھ کر اور پکار پکار کر کہہ رہا ہے "آف کی تو بُرا ہوگا" جس کی ہر صدا سُنکر شجاعت و بسالت کے پیکر بھنّا دیتے ہیں،

بہر کیف یہ ڈراما دکھائیگا کیا سین؟
پردہ اُٹھنے کی منتظر ہے نگاہ

ہندوستان بیچارا کس شمار وقطار میں اس پر ایک عرصہ سے نزع
کی کیفیت طاری ہے، اُسے باہمی نزاع کی برقیت تباہ کئے دیتی
ہے۔ باقی رہا چین اور جاپان کا تذکرہ، چین کرخانہ جنگیوں کی آگ
روشن ہو چکی ہے، ان کی جمہوریت کا بانی اور صدر اول "سن یٹ سین"
(۱۸۶۶ - ۱۹۲۵) مر چکا ہے،

جاپان اس مضمون سے قبل ایک پُر راز شخصیت تھی۔ جس کا دُنیا
کو غلط اندازہ تھا۔

اِس اہم مضمون سے بعض حقیقتیں بے نقاب ہوگئی ہیں، کہ دُنیا
کا کیا منشا اور مدعا کیا ہے؟

صادق ایوبی

وہ شخصیتیں جو ترقیات سائنس اور ایجادات سے ناواقف ہیں، وہ بہت کم
اس حقیقت سے آشنا ہیں کہ دُنیا بذات خود ایک خوفناک تباہی پیدا کر رہی ہر۔ علم الطبقات
کے ماہر نہایت ہی ہولناک اور تباہ کن آلات حرب ایجاد کر رہے ہیں۔

دُنیا گزشتہ جنگ عظیم کے ہیبج اثرات کو ایک بار پھر بھول گئی ہے، جس سی معلوم
ہوتا ہے کہ دُنیا کو پھر کسی عالمگیر جنگ کی تیاری کرنی منظور ہے۔

گزشتہ جنگ کے خاتمہ پر یہ بات ناممکن نہیں تو آسان بھی نہ تھی کہ فوجی دستہ
ایک جگہ سے دوسری جگہ بعافیت جا سکے، لیکن اب یہ بات قریب قریب ناممکن ہی ہوگئی
ہے، زہریلے گیسوں اور ہوائی خطرات سے انسانی زندگی اُمنیت میں نہیں رہی، انسان
پہلے بھی ایام جنگ میں کچھ کم خطرے میں نہ تھا۔ لیکن حالاتِ حاضرہ کچھ اور چاہتے ہیں۔

خدا معلوم دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی۔

سب سے بڑھ کر حماست انگیز واقعات بڑی طاقت کے ہیں، ساحل فرانس پر اگر توپیں سرکی جائیں، تو ان کی پہلی زد لنڈن پر پڑے گی۔ اب صرف وہی توپیں بنائی جاتی ہیں جو اس فاصلہ تک کام کر سکیں۔

آنے والی لڑائی میں نظائر و شواہد گواہ ہیں کہ آلات جنگ میں سب سے نمایاں حصہ آلات طیر لیں گے۔

عصرِ حاضرہ کے آلات پرواز "بری طاقت" سے کہیں زیادہ تباہ کن ہیں، ابھی ایک عجیب قسم کا ہوائی جہاز ایجاد ہوا ہے جو تباہ و برباد کرنے میں نہایت ہی خوفناک ثابت ہوگا اس جہاز میں طیارچی کی ضرورت نہیں، نیچے بیٹھے ہوئے صدر مقام سے بذریعہ تار برقی جہاز کے رُخ کو تبدیل کیا جا سکے گا۔

جس کی خفیہ آزمایش ؔانگیز میں کی جا رہی ہے۔ اس جہاز کے ایک افسر کے خط سے مجھے نہایت ہی خوفناک اور جگر ریش سرگذشت ملی ہے، تجربہ کی خاطر ایک عورت اور اس کے بچوں پر زہر ملی گیس ڈالی گئی ہے، انجام کچھ نہ پوچھ!

اس جہاز کا سامان برقی طاقت کے ذریعے جہاں چاہیں گے پھینک دیں گے، اسمیں آدمی بیٹھنے کی ضرورت نہیں اس لئے جہاز کو آسمان پر اتنا اونچا چڑھایا جا سکے گا، جہاں وہ نہ تو نظر آئیگا اور نہ اس کی آواز سنائی دیگی۔

اقتصادی پہلو سے مستقبل کی جنگ۔ گزشتہ جنگ عظیم سے زیادہ مہنگی پڑے گی۔ بحری طاقت کے مصارفِ عظیم نہایت وسیع پیمانہ پر کئے جائیں گے، انکم ٹیکس دہندگان کی آنکھیں ــــــــڑونسٹین ہر چل پر لگی ہوئی ہیں۔

فرانس جنگی جہازات کی تیاری میں منہمک ہے، یہی حال جاپان کا ہے، امریکہ خاموش اور ساکت ہے، حتیٰ کہ ایسے ایسے کئی ایک جنگی جہازات ضائع کر دیئے ہیں، برطانیہ جنگی جہازات کی تیاری میں ہمہ تن مصروف ہے "نیلسن" اور "روڈنی" کی تیاری میں ۳۰۰۰۰۰۰ ڈالر کی لاگت کا اندازہ کیا گیا ہے، وہ بھی بغیر مصارف تسلیح ، ان جہازات کی توپیں ۱۶ انچ کے دہانہ کی ہونگی۔

واشنگٹن کانفرنس نے کروزروں (Cruisers) کی تعداد کو محدود نہیں کیا، صرف ان کی لمبائی اور چوڑائی کو محدود کر دیا ہے۔

فرانس، اٹلی، برطانیہ کلاں، جاپان اور امریکہ کروزر (Cruisers) تیار کر رہے ہیں، برطانیہ کے نئے ساختہ کروزر میں نو اور ۸ انچ کی توپیں ہیں،

جاپان کی ایک اطلاع مظہر ہے ان کے کروزر میں بارہ اور ۸ انچ کی توپیں ہیں، ان کی لاگت کا اندازہ ۱۵ اور ۷۰ لاکھ ڈالر ہے، ان میں تیل جلیگا، وہ وقت قریب ہے کہ جب یہ برقی رو سے کام کریں گے۔

گذشتہ جنگ عظیم میں دریائے شہالے (تارپیڈو) استعمال کئے گئے ہیں، لیکن اب ان میں بہت کچھ اصلاح ہو چکی ہے، جو ایک کھلی ہوئی بربادی اور تباہی کا پیش خیمہ ہے۔

اگر یہ جنگ جس کی دنیا تیاریاں کر رہی ہے، امریکہ اور برطانیہ کے درمیان ہوئی تو اس کے مصارف کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا، اب بھی ہر سال برطانیہ کا مصارف تسلیح ۵۰۰۰۰۰۰۰ ڈالر ہے، انہی مصارف کا امریکہ متکفل ہو رہا ہے۔

لیگ آف نیشن، اور بین الاقوامی آداب سے یہ بات قطعی ناممکن نظر آتی ہے کہ امریکہ اور

برطانیہ باہم برسر پیکار ہوں۔

پھر خدشہ ہے بحر الکاہل میں جنگ چھڑ جانے کا، اگر یہ جنگ برطانیہ اور جاپان کے درمیان ہوئی تو کیا امریکہ خاموش رہے گا؟

اگر یہ جنگ ایک نو دنیا میں ایشیائی حقوق کے متعلق امریکہ اور جاپان کے درمیان ہوئی تو یہ قطعی نا ممکن کہ آسٹریلیا ساکت و صامت رہے، بلکہ ایک بار تمام برطانی مملکت برسر پیکار ہو جائیگی اس غیر محدود جنگ میں جاپان فیلپائن پر حملہ آور ہوگا، پھر یقیناً ہانگ کانگ پر بھی حملہ کرے گا۔ ایک دم ایشائی سوال اٹھے گا، چین اور روس جاپان کے اتحادی ہو جائیں گے، اور ایک عالمگیر مجادلہ ہوگا اپنی نوعیت میں پہلی جنگ ہوگی، جس کے بڑھتے ہوئے شعلے دنیا کے امن و آمان کو خاکستر کردیں گے لیکن برطانیہ کا سب سے بڑا رقیب فرانس ہے جس کی ہوائی طاقت دنیا میں مسلمہ ہے، اگر یہ جنگ برطانیہ اور فرانس میں چھڑی تو آغاز جنگ سے چند گھنٹے بعد برطانی دار السلطنت تباہ ہو جائیگی، ایک ہفتہ کے اندر اندر گورنمنٹ کا صدر مقام برسٹل، مانچسٹر اور گلاسگو ہوگا۔ پھر یہ آپ اندازہ کیجئے کہ پیرس اور لوئین مامون و مصئون رہیں گے؟ فی الحال برطانیہ اور امریکہ کی لڑائی کے لئے تیار نہیں ہیں، اور یہی دنیا کا حسن ظن ہے کہ "برطانیہ اور امریکہ دونوں آمریت کی لہروں میں غرق ہیں"

جرمن اور فرانس کے باہمی مجادلہ کا احتمال دنیا کو ہے، لیکن قیاس سے معلوم ہوتا ہے کہ فرانس کو جرمن کی پر اسرار شخصیت کا غلط اندازہ ہے، چاہے کچھ بھی ہو وہ مرد بیمار ہے اٹھیں سکت نہیں، لیکن جرمنی کا مستقبل الامان والحفیظ!

ان سب سے نازک معاملہ روس اور رومانیا کی سرحد کا ہے، انہی کی تمام جماعتیں اور "گرینڈ ڈیوک کرال" کے مقلد تر اسیلونیا کے بندوبست سے غافل نہیں ہیں لیکن سب سے

بڑھ چڑھ کر اور نازک ترین معاملہ روس اور پولینڈ کی سرحد کا ہے، اگر یہ جنگ چھڑی تو جرمنی یقیناً حصہ دار ہوگا۔

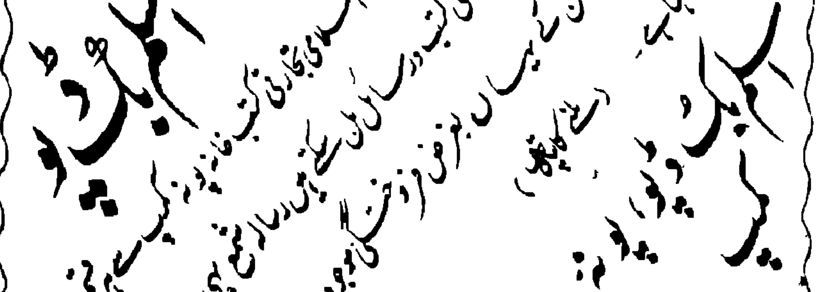
ہاں دس سال کے اندر اندر جس لڑائی کے چھڑ جانے کا احتمال ہے وہ لڑائی جس کو سلویا اور بلگریا کے مابین ہوگی۔ پھر ہنگری یقیناً ہاتھ صاف کریگا۔

بلقان ایک کھلا ہوا خطرہ ہے اور ہمیشہ سے رہا ہے۔

مگر دنیائے اسلام کی اٹھان قیامت ہے، مسلمان جاگ چکے ہیں، ان میں آئے دن قومیت اور حمیت حلول کر رہی ہے۔

میرے نقطہ خیال سے اس آنے والے خطرے کا دفاعی حلہ یہ ہے کہ قومی پولیسی، قومی حمیت کی بنیاد ڈالی جائے، جس کی عنان لیگ آف نیشن کے سپرد ہو۔ دنیا کے ہر حصہ سے ہر قوم کے نمائندے منتخب کرائے جائیں، وہ ایک ساتھ رہیں اور ایک ہی زبان بولیں، ان کی تعلیم محض قومیت ہو، تعطیل کے ایام میں ہر ملک اور ہر قوم کا نمائندہ وطن جائے، ان کا جانا صرف وطن تک محدود نہ رہے بلکہ وہ دنیا میں سفر کریں، تاکہ ان کو ہر وطن اور ہر ملک کا نقطۂ نظر معلوم ہو سکے۔

ممکن ہے کہ اس حفظ ماتقدم سے دنیا کی بیچارگی کی دشواریاں کچھ کم ہو جائیں۔



ابھی یہ لے اُڑینگی بجلیاں تارِ رگِ جاں کو

(از جناب اصغر حسین صاحب اصغرؔ)

نمایاں کر دیا اسنے بہارِ روئے خنداں کو — کہ دے نغمہ کو مستی رنگ کچھ صبحِ گلستاں کو

ذرا روکے ہوئے موجِ تبسم ہائے پنہاں کو — ابھی یہ لے اُڑینگی بجلیاں تارِ رگِ جاں کو

ذرا تکلیفِ جنبش دے نگاہِ برق ساماں کو — جہاں میں منتشر کر دے مذاقِ سوزِ پنہاں کو

بس اتنے پر ہوا ہنگامۂ دار و رسن برپا — کہ لے آغوش میں آئینہ کیوں مہرِ درخشاں کو

دکھائی صورتِ گل پر بہارِ شوخیٔ پنہاں — چھپایا معنیٔ گل میں کبھی حسنِ نمایاں کو

یہاں کچھ نخل پر بکھرے ہوئے اوراقِ رنگیں ہیں — مگر اک مشت پر سے پوچھئے رازِ گلستاں کو

سنا ہے حشر میں شانِ کرم بیتاب نکلے گی — لگا رکھا ہے سینے سے متاعِ ذوقِ عصیاں کو

ہوئے جو ماجرے خلوت سرائے راز میں اُس سے — نہ کفر اب تک ہوا واقف خبر اسکی نہ ایماں کو

قفس ہو دام ہو کوئی چھڑائے اب یہ ناممکن — ازل کے دن کلیجے میں بٹھایا تھا گلستاں کو

اب ان رعنائیوں پر شکوۂ جور و ستم کیسا — کہ خواب آلود اس نے کر لیا چشمِ پشیماں کو

تماشا ہے نکل کر سامنے بھی عشوہ فرما ہو — کوئی دیتا ہے جنبش پردۂ بیتابیٔ جاں کو

نہ میں دیوانہ ہوں اصغرؔ نہ مجھ کو ذوقِ عریانی
کوئی کھینچے لئے جاتا ہے خود جیب و گریباں کو

نجات

(از جناب مجنوں صاحب)

گوری ایک قدیم متمول خاندان کی نازپرورد حسین دوشیزہ تھی۔ اس کے خاوند پریش نے حال ہی میں اپنی ذاتی کوششوں سے اپنے افلاس اور تنگدستی کو دور کیا تھا۔ جب تک وہ مفلوک الحال تھا گوری کے والدین نے اپنی لڑکی کو تکلیف اور مصیبت سے بچانے کے لئے اپنے گھر رکھا۔ چنانچہ جب وہ اپنے شوہر کے گھر گئی تو وہ اگلی سی جوان گوری نہ تھی۔ پریش اب تک یہ بھی محسوس نہ کرسکا تھا کہ وہ اس کی ملکیت ہے۔ وہ ایک چھوٹے سے قصبہ میں وکیل تھا۔ اس کا کوئی رشتہ دار اس کے ہمراہ نہ رہتا تھا۔ اس لئے اب اس نے تمام خیالات اپنی بیوی کے لئے وقف کردئے۔ یہاں تک کہ اکثر کچہری کے برخاست ہونے سے پیشتر ہی وہ گھر آجاتا۔ اول اول تو گوری اسکے سمجھنے سے قاصر رہی کہ وہ کیوں خلاف اُمید قبل از وقت کچہری سے چلا آیا کرتا ہے۔ بسا اوقات پریش اپنے ملازموں کو بلاکسی سبب کے برخاست کردیتا خصوصاً اگر کسی نوکر کو گوری رکھنا چاہتی اس خیال سے کہ وہ نہایت وفادار یا خدمت گذار ہوتا تو اسکا برخاست ہوجانا یقینی تھا۔ خوددار گوری کو اس کا بڑا ملال ہوتا۔ مگر اس کا ملال اسکا شوہر کے برتاؤ کو اور بھی انوکھا بنا دیتا تھا۔

آخرکار جب پریش کو ضبط کی تاب نہ رہی اور اس نے خادمہ سے اس کی بابت سوالات کرنا شروع کئے تو گوری بھی ساری حقیقت سے آگاہ ہوگئی۔ وہ فطرتاً کم سخن

تھی۔ لیکن اسکا پندار ان رسوائیوں پر کسی مجروح شیرنی کی طرح مشتعل ہو رہا تھا۔ اور اس مجنونانہ بدگمانی نے دونوں کے درمیان دشمن کی تلوار کا کام کیا۔

پریش کو جب معلوم ہو گیا کہ اس کی بیوی اس کا مافی الضمیر سمجھ گئی ہے تو وہ گوری کو اسکے روبرو بھی دلخراش باتیں سنانے لگا۔ اور جتنا ہی کہ اس کی بیوی "خاموش حقارت" سے کام لیتی حسد کی آگ اس کو خاکستر کئے ڈالتی تھی۔

تاہل کی شادمانیوں سے محروم ہو کر بے اولاد گوری نے مذہب سے سکونِ قلب حاصل کرنا چاہا اس نے پرمانند سوامی کو بلا بھیجا جو قریب ہی کے مندر میں ایک نوجوان پجاری تھا۔ ادائے رسوم کے بعد گوری نے اس کو اپنا روحانی مرشد تسلیم کر لیا اور اس "گیتا" کی تشریح کرنے کی التجا ظاہر کی۔ نسوانی دل کے تمام رد کردہ جذبات کو اس نے اپنے گرو کے قدموں کی تعظیم و تکریم میں صرف کر دیئے۔

پرمانند کی اخلاقی پاکیزگی میں کسی کو کوئی شک نہ تھا۔ سب اس کا احترام کرتے تھے۔ چونکہ پریش کی ہمت نہ ہوتی تھی کہ اپنے شکوک کا کنایۃً بھی اظہار کرے اس لئے اس کا شک اندر ہی اندر پوشیدہ "سرطان" کی طرح اس کے دل کو چھلنی کر رہا تھا۔

ایک روز کسی معمولی جھگڑے نے اس "زہراب" کو چھلکا دیا۔ پریش نے پرمانند پر ریاکاری کا الزام لگایا اور اپنی بیوی سے پوچھا "کیا تم اس بدکردار کی محبت میں گرفتار نہیں ہو جو سادھو کا بھیس اختیار کئے ہوئے ہے؟" گوری اس سانپ کی مانند اچھل پڑی جو کسی کے پاؤں کے نیچے کچل گیا ہو۔ اس نے اپنے شوہر کی بدگمانیوں سے پاگل ہو کر طنزاً جواب دیا "اگر میں اس کی محبت کرتی بھی ہوں تو کیا؟" اسپر پریش فوراً کچہری چلا گیا اور دروازہ میں قفل لگا دیا۔

اُس کی اس برافروختگی پر گوری نے اپنی ضد قایم رکھنے کے لئے دروازہ کسی نہ کسی تدبیر سے کھلوایا اور گھر چھوڑ کر چلی گئی۔

پرمانند اپنے تنہا کمرے میں بیٹھا ہوا دوپہر کی خاموشی میں محویت کے ساتھ مقدس کتابوں کا مطالعہ کر رہا تھا۔ دفعتہً صاف و شفاف آسمان میں بجلی کی کوند کیطرح گوری اس کے انہماک میں خلل انداز ہو گئی۔

"تم یہاں کیسے؟" گرو نے متحیر ہو کر پوچھا۔

"میرے مالک۔ میرے گرو" اس نے جواب دیا "مجھے میری زندگی کی ذلتوں سے بچاؤ اور مجھے اجازت دو کہ میں اپنے کو تمہارے قدموں کی خدمت میں نذر کر دوں"

پرمانند نے ایک تلخ ملامت کے ساتھ اس کو گھر واپس بھیجدیا۔ مگر شاید وہ اپنے مطالعہ کے ٹوٹے ہوئے تار کو پھر نہ ملا سکا۔

پریش جب لوٹا تو دروازہ کھلا پاکر اُس نے پوچھا "یہاں کون آیا تھا؟"

"کوئی نہیں" اس کی بیوی نے جواب دیا "میں اپنے گرو کے پاس گئی تھی"

"کیوں؟" پریش نے دریافت کیا۔ اس لئے اس کے چہرے کا رنگ پہلے زرد ہو گیا اور پھر سُرخ۔

"اس لئے کہ میں نے جانا چاہا"

اس دن سے پریش نے گھر پر ایک محافظ مقرر کر دیا اور اس کا طرز عمل ایسا لغو ہو گیا کہ اسکے رشک و حسد کی داستانیں تمام قصبہ میں کہی جانے لگی۔

اس کے شاگرد کی جو توہین ہر دفعہ ہوا کرتی تھی اس کی خبر پرمانند کے فرایض میں ہارج ہو رہی تھی۔ اس نے سمجھ لیا کہ اب اس کا وہاں رہنا درست نہیں۔ مگر باینہمہ وہ اس مظلوم

عورت کا ساتھ کیسے چھوڑ سکتا تھا۔

کون جانتا ہے کہ مادھو اپنی مصیبت کے ایام کیونکر بسر کر رہا تھا۔

آخر کار نظر بند گوری نے ایک خط پایا "میری پی - یہ سچ ہے کہ بہتیری پارسا عورتوں نے یاد خدا کے لئے دنیا کو چھوڑ دیا ہے - اگر دنیا کی آزمائشیں تمہارے خیالات کو خدا سے منحرف کرنے لگیں تو جنگل میں خدا کی مدد سے اس کے چرنوں کی خدمت کے لئے اسکی کنیز کی دادرسی کرونگا - اگر چاہو تو کل سہ پہر کو دو بجے اپنے باغ میں تالاب کے پاس مجھ سے ملو۔"

گوری نے خط کو اپنے جوڑے میں چھپا لیا - دوسرے دن جبکہ وہ غسل سے پہلے بال کھول رہی تھی تو اس کو معلوم ہوا کہ خط گم ہو گیا - کیا یہ ممکن تھا کہ وہ کہیں گر گیا ہو اور اس کے خاوند کے ہاتھ لگ گیا ہو؟ وہ کچھ نہیں سمجھ سکتی تھی - پہلے تو اس نے اس خیال سے کہ اس کے شوہر کا غصہ اس سے بھڑک اٹھیگا ایک قسم کی خوفناک مسرت محسوس کیا - لیکن پھر وہ اس خیال کو بھی برداشت نہ کر سکی کہ وہ خط جس کو وہ تعویذ نجات سمجھ کر زیب سر کئے ہوئے تھی گستاخ ہاتھوں سے ناپاک کیا جائے۔

جلد جلد قدم اٹھاتی ہوئی وہ اپنے شوہر کے کمرے میں گئی - وہ فرش پر پڑا کراہ رہا تھا - اسکی آنکھیں چڑھ گئی تھیں - اس کے منہ سے کف جاری تھا - گوری نے اس کی تنگ گرفت سے خط چھڑا لیا اور فوراً ڈاکٹر کو بلانے کیلئے آدمی بھیجا۔

ڈاکٹر نے کہا کہ اس کو "سکتہ" کی بیماری تھی - مریض اس کے آنے سے قبل مر چکا تھا۔

اسی دن اتفاق سے پریش کو گھر سے باہر کوئی ضروری کام تھا - پرمانند کو کسی طرح بھید معلوم ہو گیا تھا اسی لئے اس نے گوری سے ملنے کا وقت مقرر کیا تھا - وہ اسقدر پستی میں گر گیا تھا!

جب بیوہ گوری جھروکے سے اپنے گرو کو چور کی طرح آہستہ آہستہ تالاب کے قریب جاتے دیکھا تو اس نے اپنی آنکھیں جھکالیں گویا بجلی کی اچانک چمک سے۔ اور اسی چمک میں اس نے صاف دیکھ لیا کہ پرمانند کی افتادگی کیسی ذلیل تھی۔

گرو نے پکارا "گوری!"

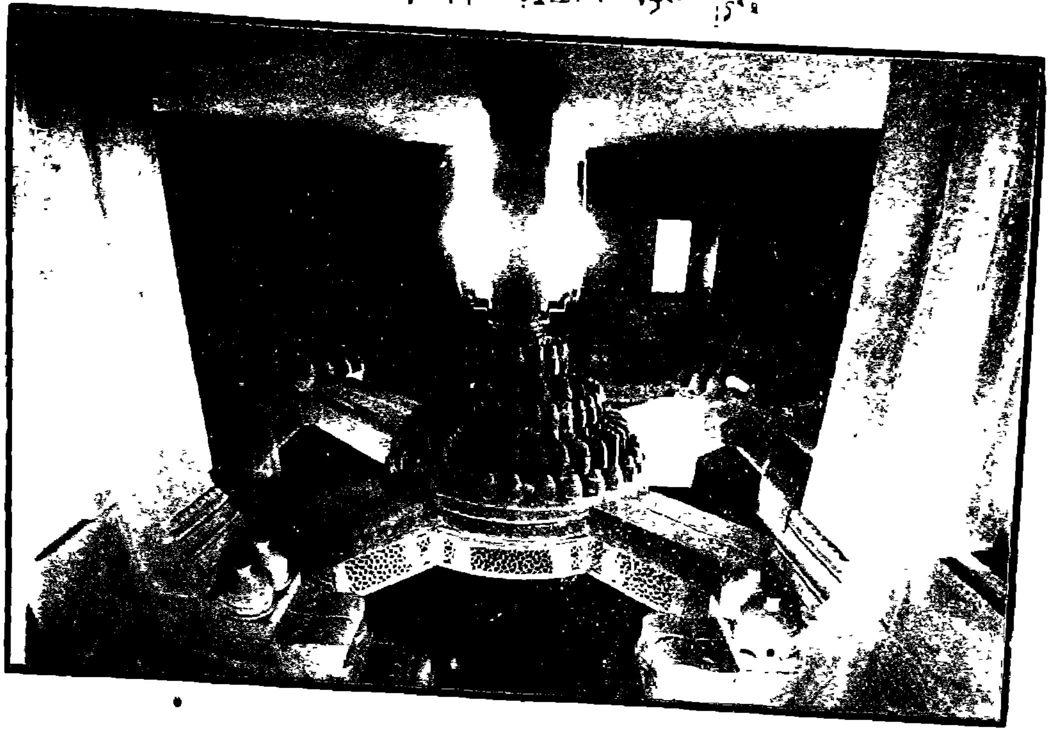
"میں آرہی ہوں" اس نے جواب دیا۔

جب پرتیش کے اعزا نے اس کی موت کی خبر پائی اور رسمیات ادا کرنے آئے تو شوہر کی لاش کے برابر گوری کی لاش نظر آئی۔ اس نے زہر کھا لیا تھا۔ سب اس کی اس وفاشعاری پر دنگ رہ گئے جس کا اس نے ستی ہو کر ثبوت دیدیا تھا اور جو آجکل کے "دور سفلی" میں مفقود ہے۔

این زماں در کس وفاداری نماند

از وفاداران و یاراں یاد باد

(از ٹیگور) مترجمہ مجنوں



نقوشِ ثانی

نہ پوچھ اے نوا سیرِ اب مجھ سے آثارِ بہاراں کو
ہوئی مدت کہ رو بیٹھا نشیمن کو گلستاں کو

نہ فرماتے اگر مجھ سے دریغ الطافِ پنہاں کو
تو میں نعمت سمجھتا آپ کے جورِ نمایاں کو

خزاں میں چاہیے پیوند دامانِ بہاراں کو
جنوں نے پھاڑ ڈالا وقت سے پہلے گریباں کو

اہم ہے عالمِ امکاں کی ہر ادنےٰ سے ادنےٰ شے
دعا دیتا ہے زنداں میں پیمبر چاکِ داماں کو

سُنا ہے جب سے نامِ انسانیت کا جستجو میں ہوں
وہ دُنیا کس طرف کو ہے جہاں پاؤں انساں کو

کہیں تو کون مانے گا کہ استغنائے الُفت نے
ہمارے سامنے ٹھکرا دیا ملکِ سلیماں کو

تمیزِ فقر و دولت اک جنونِ ہوشیاری ہے
مٹا دیتی ہے ہشیاری جنوں کی جیبِ داماں کو

نہیں جب ضامنِ اُلفت نگاہِ اولیں تیری
تو میں بھی رد نہ کر دوں دعوتِ تجدیدِ ایماں کو

یہی تو اک سہارا ہے مرا صبح قیامت تک
مری بالیں پہ جلنے دو چراغِ شامِ ہجراں کو
چلا میں، تم نہ آئے، آہ وہ ساعت کہ جب مجھ پر
تمنا تنگ کردے عرصۂ گورِ غریباں کو
مسلّم حجرۂ زنداں کی آرایش مگر ماؔنی
ہٹا دے نقشۂ آزادی و سیرِ بیاباں کو

ماؔنی۔ جائسی

تبصرہ جات

جدید مطبوعات پر تبصرہ کرنا رسالہ شمع کا ضروری مقصد ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ بذریعہ تبصرہ و تنقید اپنے ناظرین کو ملک کی دماغی محنتوں کے نتائج سے ہر ماہ مطلع کرتے رہیں تاکہ اچھی کتابوں کی خوبیوں سے ہمارے ناظرین واقف رہیں اور ان کو شوق کے ساتھ خریدیں۔ اس لحاظ سے کہ اس رسالہ میں نہایت توجہ کے ساتھ تبصرے لکھے جاتے ہیں۔ رسالہ کے پڑھنے والے ملک کے بہترین حضرات ہیں ہم کو اُمید ہے کہ حضرات مصنفین و اہل مطابع اپنی مطبوعات ہمارے پاس بھیجنا ضروری فرض تصور فرمائیں گے۔

(مینیجر)

ایک قیدی کی دُعا

(از جناب نصیر صاحب علوی اورنگ آبادی)

شام کو مناظر "شام" کی دل آویزیاں حاصل کرتے ہوئے زیاد، کلیسائے اعظم تک پہونچ گیا۔

خادم نے کہا:۔

"حضور! یہاں عرب کی مایۂ ناز ادیبہ حرقہ، نعمان ابن منذر کی لڑکی قید ہے"

"میرا سلام کہو۔ میں باتیں کرنا چاہتا ہوں"

خادم نے دروازہ کھٹکھٹایا۔

"کون ہے"

"امیر آپ کے دروازہ پر حاضر ہیں"

"کیوں"

"آپ سے باتیں کرنا چاہتے ہیں"

"میں اُن سے کلام طویل کروں۔ یا مختصر؟"

"مختصر!" زیاد نے کہا۔

"میں اُس گھر کی کنیز ہوں۔ جس پر سورج ایسے وقت طلوع ہوا تھا کہ رُوئے زمین پر مالک مکان سے بہتر کوئی کریم النفس نہ تھا اور غروب ایسے وقت ہوا کہ دشمن بھی اس پر رحم کھاتے تھے"

(۲)

اس لطیف و بلیغ فقرے کو سُنتے ہی زیادہ! امیر زیادہ!! ادیب زیادہ!!! بےچین ہو گیا اور ایک اشرفیوں کے توڑے میں اس سحر اثر کلام کو مول لے لیا۔

حرقہ نے دعا دی۔

"خدائے کریم آپ کو اس کا اجر اُن نفوس قدسیہ سے دے جو پہلے مالدار تھے اور اب تہیدست ہیں اور وہ ہاتھ آپ کو اس کا بدلہ دیں جو پہلے خالی تھے اور اب اُن کی آستین سے جوئے سیم و زر بہتی ہے۔"

ایک عربی شاعر اس مضمون کو یوں باندھتا ہے ؎

سل الخیر اهل الخیر قدماً ولاتسل
فتاً ذاق طعم الخیر منذ قریب

ایک باوقار اور کامیاب رسالہ

اشتہار کی کامیابی کا یقینی ذریعہ ہے

جو اشتہار شمع میں چھپتے ہیں۔

ہندوستان کے ہر حصہ میں پہنچ جاتے ہیں۔ بہترین لوگوں کی نظر سے گذرتے ہیں۔ قابل اعتماد سمجھے جاتے ہیں اُن پر اعتماد کیا جاتا ہے۔ رسالہ کے ساتھ محفوظ رکھے جاتے ہیں۔ تاکہ آئندہ بھی کام آویں۔

شرح اُجرت کے لئے سرورق کی پشت ملاحظہ فرمایئے۔

منیجر

اسلام اور مساوات

پروفیسر ٹی، ایل، سوانی

(مترجمہ جناب عزیز صاحب بریلوی)

کچھ عرصہ ہوا کہ اسلام کے کارناموں اور مقاصد کو بدنما رنگ میں پیش کرنا عام دستور ہوگیا تھا۔ ایک انگریز مصنف نے اپنی قطعی رائے دی تھی کہ ہندوستان کی معاشرتی زندگی کے نشوونما میں اسلام کا کوئی حصہ نہ تھا۔ اسلام ایک مادہ آتش فشاں خیال کیا جاتا تھا، جو دنیا کی غربت اور تباہی کے لئے پھوٹ نکلا ہے۔ تاریخ کے مطالعہ سے ظاہر ہوگا کہ دنیا کی تہذیب و تمدن کے ترقی و نشوونما میں اسلام کا بھی کچھ کم ہاتھ نہ رہا۔ مغربی محققین اسپینی مسلمانوں کی خدمات کا جو اس زمانہ میں جب تمام یورپ قعر جہالت میں پڑا ہوا تھا یورپ کی معاشرتی زندگی کے سدھارنے میں صرف کی گئی تھی، اعتراف کیا ہے۔ اب ہم ہندوستانیوں کو بھی موجودہ دور قوم پرستی کی روشنی میں، جو یگانگی بڑھانے کے لئے ہیں، بلکہ ازدیاد یگانگت کے لئے پھیل رہی ہے معلوم ہورہا ہے کہ اگر اسلام نے ہندوستان سے کچھ حاصل کیا ہے، تو اس کے بدلے میں اس نے بیش بہا اور نادر اضافے بھی کئے ہیں۔ گرونانک کی تحریک، جس کا منشا مختلف، مذاہب کے چیدہ اصول کا اجتماع تھا، ہندوستان میں اسلام اور ہندو مذہب کی مواصلت کی کچھ کم ممنون احسان نہیں۔ گرونانک جی اسلام کی خوبیوں کے دل سے معترف تھے اور ان کی یہ خواہش تھی کہ ہندوؤں

اور مسلمانوں کو ہندوستان کی خدمت کے لئے مجتمع کردیں۔ اُن کا مقولہ تھا کہ ہندو اور مسلمان کی تفریق نادرست ہے۔ اپنے مریدوں سے اکثر کہا کرتے تھے کہ قرآن شریف کی تعلیم اور اوس پر عمل نہایت ضروری ہے[۵۱]۔ ایک مرتبہ ایک قاضی صاحب سے

---

۵۱ جو عظمت رسول مقبول صلعم کی گرو نانک کے دل میں تھی، وہ مندرجہ ذیل سطور سے واضح ہوگی۔ گرو نانک نے ثابت کیا ہے کہ انسان جو لفظ بھی اپنے منہ سے نکالے اُن کے بتائے ہوئے قاعدہ سے لفظ محمدؐ کے اعداد نکل آئیں گے:-

نام لیو جس اچھر کا کریو چوگنتا ر
دو ملا پنچ گُن کریو بیسوں دیو اوڈار
جو بچے نو گُن کریو دو اور دیو ملا
اس بدھ سے نانکا لیو نام محمدؐ بنا
تب معنی لولاک کے جھٹ پٹ سمجھو جا

ان اشعار کی تشریح حسب ذیل ہے۔

مثلاً کسی شخص نے لفظ اَب منہ سے نکالا۔

بقاعدہ ابجد اَ کے ۱۔ اور بَ کے ۲ یعنی مجموعہ ۳ ہوا

مصرعہ اول میں چوگنا کرنے کے واسطے کہا ہے اس لئے ۳ × ۴ = ۱۲ ہوئے۔

مصرعہ دوم میں پہلے ۲ جمع کیجئے، پھر اس مجموعہ کو ۵ سے ضرب دیکر ۲۰ سے تقسیم کیجئے۔ یعنی

۱۲ + ۲ = ۱۴

۱۴ × ۵ = ۷۰

۷۰ ÷ ۲۰ = ۷۰/۲۰ حاصل تقسیم ۳ ہوئے اور ۱۰ باقی بچے۔

(باقی صفحہ ۵۵ میں)

دوران گفتگو میں فرمانے لگے، کہ "مسلمان وہ ہی ہے جس نے خودی کو دور کردیا، جسکے پاس جذبہ خلوص ہے، دولت صبر ورضا ہے، متاع صفائی باطن ہے، اور جو نہ زندہ کو نقصان پہونچاتا ہے، اور نہ مردار چیز کھاتا ہے جنت بھی ایسے ہی شخص کے لئے بنی ہے" ایک دوسرے موقعہ پر فرماتے ہیں:- کہ مولوی یا قاضی وہی ہو سکتا ہے جو خدا کو پہچانتا ہے جس نے ترک خودی کرکے صرف اُس ذات واحد پر بھروسہ کیا۔ گرونانک کی تعلیم اور عمل یکساں تھا۔ شیخ فرید سے جو ایک ولی گذرے ہیں اُن کو خاص اُنس تھا۔ اکثر دونوں ساتھ سفر کرتے تھے۔ ایک دن بہت متاثر ہوکر گروجی نے شیخ موصوف سے کہا تھا کہ "خدا اور صرف خدا پر میرا بھروسہ ہے" بابا شیخ فرید کی اکثر غزلیات ادھی گرنتھ میں شامل کی گئی ہیں۔ اس لئے یہ بات بے سبب نہ تھی کہ گرونانک کے واصل بحق ہونے پر ہندو اور مسلمان ہر دو اقوام نے اُن کے جنازہ پر پھولوں کی بارش کی، اور پرانی تاریخ کے مطابق دونوں کے چڑھائے ہوئے پھول تازہ رہے۔ سندھ میں صوفیوں کی تحریک جو اپنے اندر حیرت انگیز قوت زندگی رکھنے کی وجہ سے دور حاضر کے حملوں سے محفوظ رہ سکی ہے: ایک حد تک اسلام اور ویدانت کے باہمی تواصل کی زائیدہ ہے شاہ لطیف سندھی شاعر میں ہر دو مذاہب کا رنگ ہے اسلام کے جمہوریت پسند مسلک اور سیدھی سادھی روش نے ہندوستان میں زندگی کی ایک نئی روح پھونک

(بقیہ نوٹ صفحہ ۵۴)

مصرعہ ثالث کی رو سے۔ اجو باقی نبچے ہیں اُن کو ۹ سے ضرب دیجئے اور حاصل ضرب میں ۲ اور ملا دیجئے

لہذا ۱۰ × ۹ = ۹۰

۹۰ + ۲ = ۹۲ ہوئے۔ لفظ محمد کے بطریق ابجد ۹۲ ہوئے

محمد م = ۴۰ ح = ۸ م = ۴۰ د = ۸ = ۹۲

دی ہے، اور اس ملک میں قومیت کا بانی ثابت ہوا ہے۔ تاریخ چندرگپت اور اشوک کے بعد اکبر کو تیسرا بانی سلطنت مانتی ہے۔ صنعت و حرفت میں بھی مسلمانوں نے نہایت گراں بہا حصہ لیا ہے۔ عربوں اور ایرانیوں کا مذاق جدا تھا، جو مصری اور چینی خیالات کا مجموعہ ہے۔ سرزمین آگرہ پر تاج محل آج تک گواہ ہے کہ دنیائے حسن میں مسلمانوں کا منشائے نظر کیا تھا۔ اسلام نے ہندوستان کے فنون اور لٹریچر میں آثار حیات پیدا کر دیئے، اور فن عمارت میں بیش بہا اضافے کئے ہیں۔ مسلمانوں کے توسل سے ہندوستان اور وسط ایشیا میں فن عمارت میں پندرہ نئے نمونوں کا اجرا ہوا ہے۔

تھوڑا عرصہ ہوا کہ گورنمنٹ پریس بمبئی سے ایک نہایت دلچسپ کتاب شائع ہوئی تھی جس سے مسلمانوں کی پندرھویں سولھویں اور سترھویں صدی میں تہذیب تمدن اور فن تجارت کی ترقیوں کا پتہ چلتا ہے۔ اس کتاب کا نام "بیجاپور اور اُس کے کھنڈرات" ہے اور یہ ہنری کازنز کی تالیف کردہ ہے۔ بیجاپور کے مسلمان گورنر اور بادشاہوں کی مختلف علوم و فنون اور سائنس میں دلچسپی اور انہماک کا حال پڑھ کر طبیعت بہت خوش ہوتی ہے۔ اسمٰعیل جو اپنے ذہین اور طباع باپ یوسف عادل خاں کے بعد ۱۵۱۰ء سے ۱۵۳۴ء تک بیجاپور کا بادشاہ رہا مصوری میں بڑی دستگاہ رکھتا تھا۔ اس کو رنگ ملانے، تیر بنانے، اور گدیوں پر کار چوب بنانے میں کمال حاصل تھا۔ علم موسیقی اور فن شعر گوئی میں اپنے معاصرین پر سبقت لے گیا تھا، اور اپنا بیشتر وقت علماء و فاضلین و شعرا کی صحبت میں بسر کرتا تھا۔ وہ بیحد با مذاق، عادل، ذکی، مستقل مزاج اور آزاد خیال مشہور تھا۔ اس کے پوتے ابراہیم کے بارے میں بھی مشہور ہے کہ وہ شریف النفس، حلیم الطبع، پابند مذہب اور آزاد خیال تھا۔ رات دن علماء کی

صحبت میں رہتا، اپنے ملازمین سے رحم و عنایت کا برتاؤ کرتا، اور فن تعمیر میں ید طولیٰ رکھتا تھا۔ بیجاپور کی دیواریں اسی کی تعمیر کرائی ہوئی ہیں، اور شہر کی خوبصورتی اور مضبوطی اسی شخص کی شرمندہ احسان ہے۔ بیجاپور کی مشہور بیگم چاند بی بی کو قدرت سے وہ خوبیاں عطا ہوئی تھیں، جن کا تاریخ عالم کی دیگر فرمانروا عورتوں میں فقدان ہے۔ چاند بی بی کا انگلستان کی ملکہ الیزبتھ سے مقابلہ کرتے ہوئے ہنٹری کارنر رقمطراز ہیں، کہ "وہ سیاست دانی، تحصیل علم و کسب ہنر میں موخرالذکر کی ہم پلہ تھی، اور ایسے ملک پر حکمراں تھی جو انگلستان کی طرح وسیع، زرخیز اور آباد تھا، مگر حق یہ ہے کہ چاند بی بی میں چند ایسی بھی خصوصیات تھیں جن سے ملکہ الیزبتھ محروم تھی۔ وہ سادہ مزاج، آزاد طبع اور غیر متعصب تھی۔ عادل شاہی خاندان کے انہی طباع فرمانرواؤں نے سلاطین مغلیہ کے گورنروں کی حیثیت سے بیجاپور کو اسقدر رونق اور دلاویزی بخشی تھی"۔ سترہ صدی کا ایک مسلمان مورخ بیجاپور کے خاص بازار کی حالت ان الفاظ میں بیان کرتا ہے! "اس بازار کی دوکانیں جو بڑی گلی پہ واقع تھا اُن تمام اشیا سے پُر تھیں جو مشرق اور مغرب میں مل سکتی ہیں، ہر وہ طرح چیز جو صناع کا دماغ اختراع کرسکتا ہے، یہاں موجود تھی۔ صراحیاں، گلدان، طلائی اور نقرئی زیورات، نادر ترین عطریات و دو آتشہ و سہ آتشہ عرقیات و تمباکو، پرتگال کی نفیس ترین شراب، غرض کہ کوئی ایسی چیز نہ تھی جو وہاں بہ کثرت دستیاب نہ ہوسکے۔ اسی سڑک پر امرا، اور عمائدین کے محلات اور باغات واقع تھے۔ ہر چہار جانب پھولوں کے تختے بالاخانوں پر خوشنما بیلیں اور اطراف و جوانب میں پانی کے فوارے چشمے اور نہریں دعوت نظارہ دیکر جنت الفردوس اور باغات بہشت کا سماں پیش کرتے تھے"۔ یہ حالت عادل شاہی خاندان کے انحطاط سے قبل تھی۔ اُن کے انحطاط کے بعد بیجاپور پر بھی زوال آگیا، مگر اب

بھی اُس کے کھنڈرات اور شکستہ دیواروں کے نقش و نگار سے بیجا پور کی عظمت رفتہ، اُسکے تمدن دلاویزی اور مضبوطی کا پتہ چلتا ہے۔ بے شمار محلات، چشمے اور مینارے اس کے حسن اور کمال صنعت پر شاہد ہیں۔ نہریں زیر زمین، چشمے وسیع کمرے، دیواروں کے نقوش، مقابر و مساجد وغیرہ وری و برتن سازی کے کام ان سب چیزوں نے مل کر بیجا پور کو عجیب رونق بخشی تھی۔ پرانے لوگوں کو اس زمانہ والوں پر فن تعمیر میں تفوق حاصل تھا۔ یقیناً اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ فضائے آزادی میں کام کرتے اور اس سے لطف اندوز ہوتے تھے۔

پرانی عمارات کے آثار شکستہ مسلمانوں کے کمال فن اور روحانی اوصاف کے شاہد ہیں۔ اُن کی ترقی کا راز صرف یہ تھا کہ صناع کو کام کرنے میں لطف آتا تھا اور یہی وہ مسرت تھی جس نے ہزاروں کی زندگی کو خوشگوار بنا دیا تھا، باوجودیکہ اُن کا سیاسی نقطہ نظر زیادہ وسیع نہ تھا۔ کیا وہ زمانہ آجکل کی کاروباریت اصلاح کے واسطے پھر واپس آئیگا؟ زندگی کی راحت و آرام، اور سکا عیش و نشاط جو ہمارے شہروں سے اور آجکل کے پُر از شور و شغب آلات صنعت و حرفت کے بدولت کبھی کا رخصت ہو چکا ہے پھر واپس آسکتا ہے، اگر ہم سودیشی اور کاتنے اور بننے کی پرانی دستکاریوں کو جو موجودہ مشینری کی تیغ ستم کی کشتہ ہیں از سر نو رواج دیں۔ میرا تو یہ یقین دن بدن قوت پکڑ رہا ہے کہ اگر ہم متمنی ہیں، کہ ہماری نئی قومی زندگی مستقبل میں وہ شکل اختیار کرلے جو ہمارے موجودہ آزادی کے معیار اور ہندوستان کی عظمت رفتہ کی شان کے شایاں ہو تو ہمارے لئے از بس ضروری ہے کہ ہم ان پرانی دستکاریوں کو از سر نو رواج دیں۔

ہندو مسلم اتحاد! کیا یہ محض ایک لفظ ہے جو بآسانی زبان پر آجاتا ہے، یا صرف ایک جملہ

یا ایک خیال ہے اور بس؟ اگر ایسا نہیں تو کیا یہ ہندو مسلم اتحاد کسی شخصی یا معاشرتی تجربہ کا نام ہے، یا یہ تین لفظ اس جذبہ مشترک کی تفسیر کر رہے ہیں جو آجکل ہمارے قلوب میں موجزن ہے۔ موجودہ پبلک لائف سے جو واشنگٹن اور یوس کن مشاہدات کے درمیان بھی میرے خیالات اس زمانہ کی جانب منتقل ہوئے ہیں، جب امرکوٹ کے ہندو راجہ نے مسلمان بادشاہ ہمایوں کو پناہ دی تھی، جب مسلمان اور دیندار اکبر نے رانا پرتاب سنگھ کی یادگار میں اُن کا بت نصب کرایا تھا، یا جس زمانہ میں خلفائے بنی بغداد نے سندھ کے ہندو محققین کو مدعو کر کے شرف باریابی عطا کیا اور جب ہندو بادشاہوں کی حکومت میں قلمدان وزارت و تعلم ونسق افواج پیروان دین احمد کے سپرد تھا۔ میں نے اکثر دیکھا ہے کہ دیہات میں شام کے وقت دن بھر کی سخت مشقت کے بعد ہندو اور مسلمان ایک ہی پیال پر زانو بزانو بیٹھ کر، اور سندھی شعرا کی پرانی راگنیاں چھیڑ چھیڑ کر اپنی دادی کو فضا خاموش کو پُر ترنم بنا دیتے ہیں، اور تھوڑی دیر کے واسطے اپنے باہمی اختلافات کو فراموش کر کے اپنے آپ کو ایک مادر ہند کی دلاد اور ایک خدائے بے ہمتا کے پوجاری تصور کرنے لگتے ہیں۔ اگر ہم میں بھی وسعت نظر اور باہمی ہمدردی سے یہ جذبہ پیدا ہو جاوے تو ہندو اور مسلمانوں کا رشتہ اتحاد ہمیشہ کے واسطے استوار ہو جائیگا۔

میرا ارادہ ہے کہ اس باب میں مذہب اسلام کی چند خصوصیات پر بحث کروں اس سے غرض یہ ہے کہ ہندو مسلم اتحاد کی اس وسیع بنیاد کی افتاد عمل میں آئے جس پر ہندوستان کی فلاح و بہبودی اور ہندوستانی قومیت کی آئندہ عظمت و جلال کا انحصار ہے۔ ہندو مسلم اتحاد پر میری شیفتگی سیاسی مصلحت اندیشیوں پر مبنی نہیں بلکہ یہ جذبہ مذہب اسلام کی ادعا نادر خصوصیات کے احساس پر مبنی ہے۔ میں محمد صاحب کو دنیا کے بہت بڑے آدمیوں میں سے

شمار کرتا ہوں۔ انہوں نے دنیا میں ایک انقلاب کی روح پھونک دی اور ہزارہا اقوام کو قعر ذلت سے اٹھا کر اخلاقی بلندی پر لا کھڑا کیا۔ اُن کے حالات اور سوانح زندگی پر نظر ڈالیے، تو آپ کو معلوم ہو جاوے گا کہ اُن کی تمام زندگی کس قدر پاکیزہ اور سادی تھی۔ ایک جلیل القدر فرمانروا اور روحانی قائد اعظم ہونے کی باوجود لباس خود سیتے بیماروں کی عیادت کو جاتے اور غربا کے بچوں سے جو گلی کوچوں میں مارے مارے پھرتے تھے ہمیشہ محبت سے پیش آتے۔ اُن کی غذا ہمیشہ سادی ہوتی، جو بعض اوقات پانی اور چھواروں سے متجاوز نہ ہوتی تھی۔ اپنی اونٹنیوں کا دودھ خود دوہتے۔ غلاموں کے دعوت قبول کرتے۔ اور لوگوں کو اپنا بھائی سمجھ کر ملنے میں انہیں کبھی باک نہ تھا۔ رسول خدا اکثر فرماتے کہ میں دسترخوان پر خادم کی حیثیت سے بیٹھتا ہوں، اس لئے کہ میں در اصل خادم ہی ہوں۔ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ (اے معبود بے ہمتا راہ راست پر میری رہنمائی کر وہ صاف اور سیدھا راستہ دکھا جو اُن کے واسطے مخصوص ہے جو تیرے انعام و کرم سے مالا مال ہیں) یہ ہیں وہ الفاظ جو رسالت پناہ کے ورد زبان رہتے تھے لفظ اسلام کے معنی بھی صلح و آشتی ہیں رسول کریم ہر وقت خدائے برتر کی صدائے یا اَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ (اے کملی والے اٹھ اور دین خدا کی تبلیغ کر) پر گوش بر آواز رہے مگر اس کا عوض مخلوق خدا نے کیا دیا؟ لوگوں نے آپ کے ایذا رسانی کے درپے ہوئے حتیٰ کہ آپ کی تمام زندگی خطرہ میں کر دی مگر حضور پیمان وفا پر قائم رہے اور دین الٰہی کی نشر و تبلیغ جاری رکھی۔ بار بار آپ پر ایک خاص قسم کی کیفیت طاری ہوئی یعنی حضور وحی کے بار گراں کے متحمل ہوتے اور کپکپاتے ہوئے مبارک لبوں سے الفاظ کا وہ معنی خیز سلسلہ جاری ہوتا جو آج قرآن کی صورت میں پیش نظر ہے مگر اس پر بھی یورپ کا

ایک محقق اسپرنیجر نامی حضور کے ان لمحات کیف کو مرگی کے دورہ
سے تعبیر کرتا ہے۔ کارلائل نے رسالت پناہ کے بارے میں نسبتاً بہتر رائے کا اظہار
کیا ہے وہ آپ کو یگانۂ روزگار ہونے کا نمونہ خیال کرتا ہے اس میں کچھ شک نہیں کہ حضور ہیرو
بھی تھے اور پیغمبر بھی۔ میں اکثر رسول کریم کے اُن آخری ملفوظات پر غور کیا کرتا ہوں جو اس
دارِ فانی سے جدا ہوتے وقت لبہائے مبارک سے ادا فرمائے تھے۔
کیا اب بھی کوئی شخص اس امر سے انکار کرسکتا ہے کہ حضور کی زندگی بھی اسی قدر
پاکیزہ اور دلآویز تھی جتنی حضور کی وفات۔
اب تھوڑی دیر کے واسطے اس امر پر بھی غور کرلیجئے کہ رسالت مآب کی تلقین کا
اثر کیا ہوا اسلام نے دُنیا کے سامنے ایسا مذہب پیش کیا جو پادریوں کی مطلق العنانی سے مبرا
تھا۔ ہر مسلمان پر لڑکیوں کا قتل اور منشیات کا استعمال ممنوع قرار دیدیا گیا۔ پیروان احمد کو
شجاعت صبر و استقلال اور ایثار کی دعوت دیکر زہد و تقویٰ کا وہ دور جاری کیا گیا جس میں
تاش کھیلنا و رقص و سرود تک ممنوع ہے قرآن مجید کے بموجب مسلمان صرف وہی ہے
جو راہ راست پر گامزن ہے اسلام نے اللہ الرحمٰن الرحیم کے پیغام عظیم سے
ابتدا کی اور تہذیب و تمدن کی شمع ہاتھ میں لیکر افریقہ چین وسط ایشیا یورپ ایران
ہندوستان کو منور کردیا۔ چینی مسلمان اب تک قد آور قوی اور شجاع مشہور ہیں۔
خلفائے دمشق کے زمانہ میں اسلام نے زندگی کے شعبہ میں جسقدر فتوحات کی ہیں انپر
ہر مسلمان بلکہ ہر سندھی بھی۔ اس لئے کہ دربار دمشق کی تعلیمی ترقیوں میں سندھیوں
کا بھی نمایاں حصہ تھا۔ جس قدر ناز کرے کم ہے۔ سندھ کے ہندو اور مسلمان اسلام
کے اُن کارہائے نمایاں سے کم واقف ہیں جو اُس نے سرزمین یورپ میں انجام

دیتے ہیں مگر ایک سرسری نظر ڈالنے سے بھی معلوم ہو جائیگا کہ اسلام نے یورپ کی فلاح و بہبود میں کسقدر حصّہ لیا۔ اسلام کے قائم کردہ غرناطہ یونیورسٹی میں یورپ کے تمام اطراف و جوانب سے مسیحی طلبا اکثر شامل ہوتے تھے۔ ان میں کا ایک طالبعلم آخر کار یورپ کے منصب جلیلہ پر مامور ہوا۔ یورپ جس زمانہ میں جاہلیت کی آماجگاہ تھا اسپین کے عالم مسلمان سائنس اور لٹریچر کی مشعل لیکر آگے بڑھے اور تمام یورپ کو طب ریاضی فلسفہ اور دیگر علوم فنون میں درس دینے لگے۔

علما رعرب نے بیشتر ہندو کتب کا ترجمہ کرکے ہندو فلسفہ کو یورپ کی اکثر درسگاہوں تک پہنچا دیا ہے۔ اسپین کے مسلمان فرمانروا الحکیم کے دور حکومت میں غرناطہ ولینشیا[۱] وارگالوس[۲] میں آبپاشی کا انتظام نہایت وسیع پیمانہ پر جاری تھا اور دیگر سلاطین کے عہد میں بھی مسلمان بادشاہوں نے نمایاں ترقیاں کی ہیں عرب اور اسپین کی اسلامی حکومت میں صنعت و حرفت کے حسب ذیل شعبوں کا خاص طور سے ذکر کرتے ہیں۔ جہازوں کی ساخت باغات کی پرورش پھولوں کا تحفظ و نیز شیشے لوہے اور پیتل کے ظروف کی ساخت کی جانب خاص رجحان تھا۔ چاندی کی کانیں بے شمار تھیں۔ برکیٹ سازی چمڑہ کا کام روئی کے کپڑے تیار کرنا اور ہاتھ سے کپڑے بُننے کا بہت رواج تھا۔ ریشم بیلیں کاغذ بہت اچھا تیار ہوتا تھا۔ جڑاؤ اور کھدائی کے کام میں بھی اس زمانہ کے کام کرنے والوں کو خاصی دستگاہ تھی۔

یہ کہنا ہرگز مبالغہ میں داخل نہیں کہ ہندوستان کے خیال و نیز طرز معاشرت میں اسلام نے نمایاں اضافہ کیا ہے اسی مذہب نے ہندوستان میں قومیت کی بنا ڈالی اور

---

[۱] Vellencia [۲] Arragon

اس خطہ زمین کے فلسفہ شاعری فن تعمیر و دیگر علوم کو اپنی غیر معمولی ذکاوت ذہانت سے چار چاند لگا دیئے۔ چنانچہ تاج محل سے زائد خوشنما اور دلکش عمارت خیالی دنیا میں بھی اپنا وجود نہیں رکھتی۔ اسلام نے مساوات اور جمہوریت کو ہمیشہ اپنے پیش نظر رکھا۔ گو ہندوستان و دیگر ممالک کے مسلمانوں سے اس کی پابندی نہ ہو سکی مگر یہ یاد رہے کہ رسمی غلامی پر پہلی ضرب حضرت عمرؓ خلیفہ دوم کے دست مبارک سے پڑی جب فتح بیت المقدس پر اپنے غلاموں کی عام آزادی کا اعلان فرمایا۔ شہنشاہ اکبر نے ہندوستانی قومیت اور ہندوستان کی عظمت کا جو معیار پیش نظر رکھا تھا اس کے پورا کرنے میں ہمارے انگریز فرمانروا اب تک قاصر رہے۔ پندرہ اور سولہ صدی کے اصلاحات جو گرونانک اور کبیر کی تحریکات کی صورت میں رونما ہوئیں اسلام سے اثر پذیر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں اور اکثر مسلمان درویش مثلاً پیر تبریز ملتانی یا سیوان کے لال شاہ باز اب تک اہل ہنود کو تسخیر کئے ہوئے ہیں۔ اسلام کی شاعری لٹریچر فن تعمیر و مصوری نے اسپین کو اس زمانہ میں شہرہ آفاق بنایا جب تمام یورپ بربریت و جاہلیت کے بھنور میں ڈوبا ہوا تھا۔ سیوائل[۵۱] قرطبہ اور بارسیلونہ[۵۲] کی اسلامی درسگاہوں نے اس آزاد خیال اور عالی حوصلگی سے تمام دنیا کو دعوت تعلیم دی۔ جس کے فقدان پر مسیحی پادریوں کی عدالت سے برونوں کو زندہ جلانے اور گلیلیو کو دار پر چڑھانے کا حکم ہوا تھا مسلمان بادشاہوں نے بے شمار کتب خانہ کھول رکھے تھے اور جابجا اوبزرویٹریان[۵۳] (مشاہدات نجوم کے لئے مخصوص طرز کی عمارت) اور لباریٹریاں (سائنس کے عملی تجربوں کے

---

۵۱ Seville. ۵۲ Barcelona.

۵۳ Observatory Laboratory

واسطے ایک خاص وضع کی عمارت) قائم کردی تھیں فن موسیقی میں بھی اسلام نے یورپ کی افسانہ نگاری اور لٹریچر کو ایک نیا رنگ دیدیا ہے فلسفہ یونان کا ترجمہ تفصیل ابہام اور تصحیح و تردید کرکے مسلمان فلسفیوں نے وہ خدمت انجام دی ہے جسکا شکریہ جس قدر بھی ادا کیا جاوے کم ہے۔

ضروری گذارش

فلسفۂ حسن وعشق

(نظم بے قافیہ وردیف)

(از جناب اکبر حیدری صاحب)

(۱)

حسن

اک شب تاریک کے آغوش میں　　مضطرب تھا عاشق حرماں نصیب
خوں فشاں تھے دیدہ ہائے اشکبار　　آہ قالبِ تھی لب خاموش پر
وصل کا طالب تھا فرقت کا حریف　　آہ بھر کر بستر غم سے اٹھا
منتشر جذبات نے تعلیم دی　　آگیا دل میں اچانک کچھ خیال
شمع خفتہ تھی اسے روشن کیا

شمع روشن ہو چکی تھی اور وہ　　دیکھتا تھا اس کے شعلے کی تپش
ایک پروانہ کہیں سے آگیا　　بڑھ کے شعلے نے کیا راز و نیاز
لے لیا پھر آتشیں آغوش میں　　دم زدن میں جسم وجاں کی راکھ تھی
ہاں مگر معصوم شعلے کی تپش　　اپنی آتشبازیوں سے بے خبر
تھی اسی انداز سے جلوہ نما

پے بہ پے جانباز پروانے بڑھے دامنِ تاریکِ شب کو پھاڑ کر
منزلِ عشق و محبت کے مقیم شاد کام و کامیابِ وصلِ یار
شعلۂ مجذوب جاذب ہو گیا حسن کی نیرنگیاں معصوم تھیں
دیکھ کر عشق و وفا کا یہ مآل کھل گئیں آنکھیں محبت کیش کی
ہوش میں تھا عاشقِ عشق و وفا

(۲)

عشق

ایک دن سیرِ گلستاں کو گئی اک حسینہ نازشِ دوشیزگی
پاک باطن۔ پاک طینت۔ پاکباز حسن کی رعنائیوں سے بے خبر
اپنے کیفِ حسن سے واقف نہ تھی ہاں مگر تھی عشق کی طالب ضرور
رات دن معصوم دل کو تھا خیال عشق کی پُرکیف منزل میں رہے
ہو کے دُنیا اور مافیہا سے دور

ایک غنچہ شاخ پر، دیکھا حسیں اپنی معصومی کا گویا ترجمہ
جس میں پنہاں تھا جہانِ رنگ و بو جو اُسی کے حسن کی تصویر تھی
آ گئی اتنے میں اک بلبل حزیں شاخِ گل پر بیٹھ کر کہنے لگی
اپنے شوق و آرزو کی سرگذشت چوم کر غنچے کا سربستہ دہن

جاگ اُٹھی محفلِ کیف و سرور

حُسن کے غنچے کے لبوں پر بر ملا ایک تبسم آگیا لبریزِ کیف
اس نے کہدی رازِ دل کی سرگزشت اس کی نکہت سے معطر ہو گیا
جب مشامِ جانِ زارِ عندلیب اڑ گئی غنچہ کو تنہا چھوڑ کر
دوسرے غنچوں کی جانب بے وفا رہگیا یہ بے کسی کی گود میں
دل میں تھا۔ یاس اور حسرت کا وفور

بے وقار و بے قرار و بد نصیب کس مپرسی کے طلاطم میں اسیر
اس کی ساری پتیاں مرجھا گئیں خشک ہو کر مل گئیں سب خاک میں
دیکھ کر یہ ماجرا وہ نازنیں حسن کے انجام سے واقف ہوئی
عشق کی یہ بے وفائی دیکھ کر اس کو نفرت ہو گئی اب عشق سے
شیشۂ دل ہو چکا تھا چور چور

(۳)

نتیجہ

حسن ہو یا عشق دونوں خوب ہیں لیکن اتنی شرط ہے باہم نہ ہوں
عشق جا کر حسن کے آغوش میں اپنی ہستی کو مٹاتا ہے ضرور
عشق کے دامن میں جب آتا ہے حسن اپنی رعنائی پہ کرتا ہے ستم

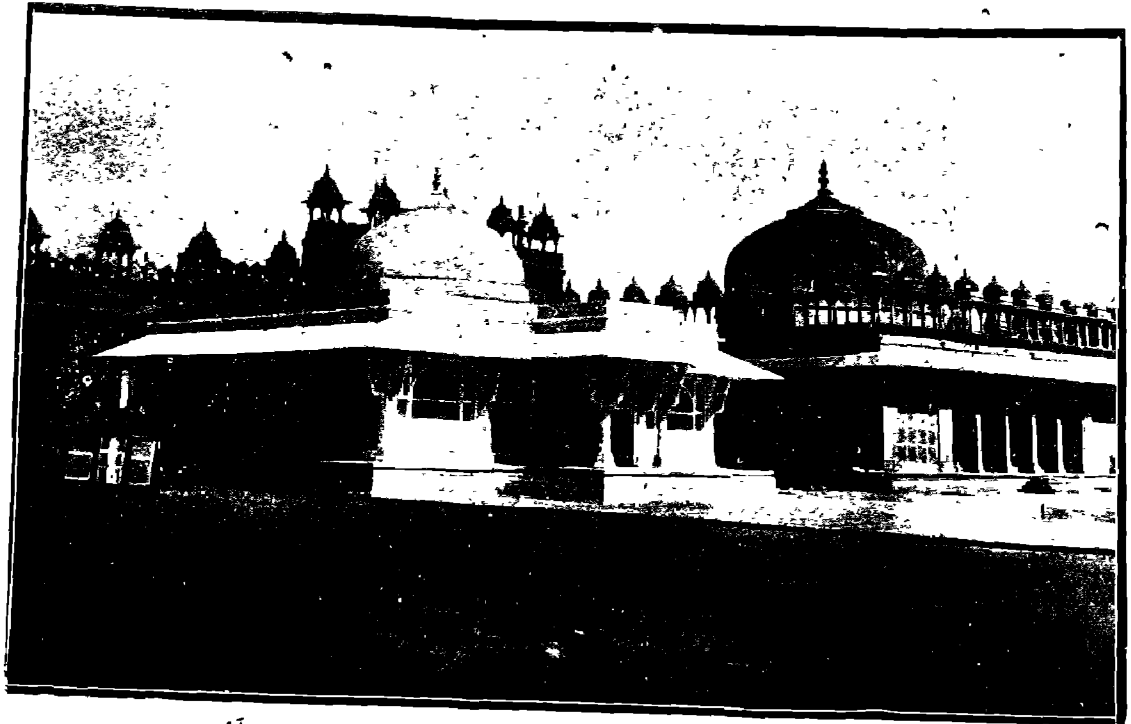
ہاں یہی بہتر ہے دونوں کے لئے ایک کو ہو دوسرے سے انحراف
عشق بھی محروم ہو اور حسن بھی

دیکھ لیں دونوں آلِ حسن و عشق
کہدیا اکبر نے حالِ حسن و عشق

آئینہ نما قلعی کے کانچ پر روپہلی حرف

منشی عبدالرحمٰن صاحب خورشید رقم متھرادی (کاتب شمع) کی صنعت کا نمونہ اگر آپ ملاحظہ فرمانا چاہتے ہیں تو اپنے کمرے یا مسجد یا امام باڑوں کی رونق و زینت بڑہانے کے واسطے قطعات یا طغرے یا نام کانچ کے شیشے پر قلعی کے حرفوں سے بنوا کر آویزاں فرمایئے۔ جس میں ہر قسم کی گلکاری بھی ہو سکتی ہے۔ ہر سائز کی قیمت جداگانہ ہی۔ جس سائز کی جو چیز آپ بنوانا چاہیں بذریعہ کارڈ مطلع فرمائیے۔

منیجر شمع
حسن منزل شاہ گنج آگرہ



مقبرہ شیخ سلیم چشتی و اسلام خان۔ فتحپور سیکری آگرہ

بیں تفاوت

از جناب محمد عبد الشکور صاحب ایم - اے - (علیگ)

(۱)

"واللہ! صبح کے وہ لمحے بھی کیسے دلکش اور پُرکیف ہوتے ہیں جب تک سورج کی کرنیں نمودار نہیں ہوتیں!"

"بھئی! سچ کہتے ہو - یہ معلوم ہوتا ہے کہ بقول اصغر صاحب کے فضائے آسمانی انوار کی بارش اور اسرار کی ریزش سے پر ہے "

"تمہارا خیال ٹھیک ہے! میرا خود یہ عقیدہ ہے کہ صبح کے وقت لہلہاتے مرغزاروں اور ہرے بھرے کنجوں میں ایک عجیب دلفریب لطافت ہوتی ہے "

"نہ صرف یہ، بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کل عالم پر ایک ملکوتی حسن طاری ہے .... ہاں .... ملکوتی حسن ...."

"بیشک! شاداب پتیوں پر شبنم کے نگینے، اور تازے تازے پھولوں پر تتلیوں کا مستانہ وار رقص کرنا .... وہ دیکھو .... ذرا دیکھنا .... (ایک طرف انگلی کا اشارہ کرکے) کیسا پیارا پھول ہے ...."

"واقعی کیا خوب پھول ہے! سچ تو یہ ہے کہ دہرے[1] کی خاک کو خدا نے عجب رعنائی بخشی ہے ...... مگر ارشد! تم نے ادھر چنبیلی کی بہار نہیں دیکھی"؟

---

[1] دہرہ دون۔

ارشد اور سراج کافی مدت تک باغ میں سیر کرتے اور اس کی بہار سے لطف اندوز ہوتے رہے، مارچ کا ابتدائی زمانہ تھا، اور موسم نہایت خوشگوار و شیریں، فطرت کی حسین گلکاریوں نے پتہ پتہ میں ایک عجیب شان دلبری پیدا کر دی تھی، گلاب اور یاسمن کے تختے طبلۂ عنبر بنے ہوئے تھے، اور صحن باغ کے چپہ چپہ پر دیبائے مشجر کا دھوکا ہوتا تھا۔ چہل قدمی کرتے کرتے دونوں دوست آخر کار تھک گئے اور بینچ پر بیٹھ کر تازی تازی ہوا کے نرم نرم جھونکوں کا مزہ اٹھانے لگے .... تازے تازے جھونکے جن کی ہر موج خرام گل کترتی جاتی تھی، آفتاب رفتہ رفتہ افق بعید سے نمودار ہونے لگا، اور اس کی تیکھی تیکھی شعاعیں لان کے اس کنارے پر پڑنے لگیں جہاں خوشنما گملوں کا ایک نہایت مرتب اجتماع تھا، تمازت بھی پیدا ہو چلی تھی، اور نسیم سحری ایک عجیب عالم اضطراب میں نونہالانِ چمن سے گلے مل مل کر جدا ہو رہی تھی ایہ دونوں بھی اٹھ کھڑے ہوئے، سراج نے اپنے گھر کی راہ لی اور ارشد تھوڑی سی مسافت طے کرنے کے بعد خورشید لاج میں داخل ہوا، جہاں اس کی شریک حیات اور اس کی ہفت سالہ بہن اس کے انتظار میں چشم براہ تھیں، ارشد نے گھر میں قدم رکھا اور نسیمہ فوراً اس سے لپٹ گئی، بھائی نے اسے گود میں اٹھا لیا، خوب پیار کیا، اور کہنے لگا۔

"نسیمہ! دیکھو (ایک پھول دیکر) یہ پھول ہم تمہارے لئے لائے ہیں ..... کیسا اچھا پھول ہے!"

نسیمہ نے پھول لے لیا، اسے غور سے دیکھا، اور ایک تبسم شیریں سے اپنی پسندیدگی اور تشکر کا اظہار کیا۔

ارشد نے نگاہوں نگاہوں میں خورشیدہ سے دو ایک باتیں کیں، اور

کپڑے اُتار کر غسل خانہ میں جا پہونچا۔

خورشیدہ نے جلد جلد ناشتہ کا سامان کھانے کے کمرے میں چنوایا، اور کمرے کی صفائی، میز کی درستی، برتنوں کی ترتیب پر ایک متجسس نگاہ ڈالی، خاصدان میں دس پان کی گلوریاں بنائیں آئینہ خانہ میں جاکر اپنے بال از سرِ نو درست کئے، سرمے کے ڈوروں سے آنکھوں میں قاتلانہ انداز بھرے اور ایک طرزِ محبوبانہ کے ساتھ کھانے کے کمرے میں آموجود ہوئی، ارشد بھی غسل خانہ سے برآمد ہو کر سیدھے اُسی کمرے میں پہونچے جہاں خورشیدہ اور نسیمہ اس کا انتظار کر رہی تھیں۔

ارشد "آج کی سیر کچھ غیر معمولی طور سے پرلطف تھی!"

خورشیدہ "بیشک! ہندوستان میں یہی تو بہار کا زمانہ ہے!"

"مگر یہ بہار محض نام بہاد ہے۔ ورنہ ہندوستان میں تو بہار بارش کے موسم میں آتی ہے"

"بارش کے موسم میں؟"

"بارش کے موسم میں۔ مگر اس سلسلہ میں ایک اور نکتہ غور کرنے کے قابل ہے"

"وہ کیا؟"

"ہمارے ہندی شعرا نے ایران والوں کی اندھی تقلید کی ہے، شاعری کے ہر پہلو میں اُن کا تتبع کیا، ایران میں بہار کا یہی موسم ہے، مگر وہاں کی بہار ایک اور شے ہے، جس کا مختصر سا حال تم نے سخندانِ فارس میں دیکھا ہوگا"

"تو پھر اس کے معنی یہ ہوئے کہ کوئل ہماری بلبل ہے؟"

"بیشک! ہندوستان کی بلبل کوئل ہے!"

دُنیا کی یہ تین مسرور ہستیاں چار نوشی میں مصروف تھیں اور اس قسم کی گفتگو بھی کرتی جاتی تھیں،

اسی اثنا میں ڈاک آگئی، خورشیدہ نے خطوں پر ایک سرسری نظر ڈالی، اتفاقاً "سہیل" کا پہلا نمبر اسی وقت ڈاک میں پہونچا تھا، اسُ کو دیکھتے ہی اسُ کا چہرہ فرطِ مسرت سے چمکنے لگا، یہی وہ پرچہ تھا جس کی تعریف و توصیف کی داستانیں وہ بارہا سُن چکی تھی، اور جس کی آمد کے انتظار میں وہ آتش بجاں تھی، ناشتہ ختم کر کے ارشد خطوط و اخبارات لیکر دفتر میں چلے گئے اور خورشیدہ "سہیل" لیکر آنگن میں آبیٹھی۔

سہ پہر کو تین بجے ارشد کام پر سے واپس آئے، اور کپڑے بدل کر خورشیدہ کے پاس آبیٹھے، نسیمہ بھی کودتی اُچھلتی ہوئی بھائی کی گود میں آبیٹھی، اور گردن میں بانہیں ڈال کر چہکنے لگی۔

"نسیمہ! بتاؤ۔ تم نے آج کیا کام کیا؟"

"ہمنے آج ایک گھوڑا بنایا!"

"وہ کیسے؟"

"پنسل سے!"

"سلیٹ پر؟"

"جی نہیں! کاغذ پر"

"کون سے کاغذ پر؟"

"زنگین کاغذ پر، ہماری کتاب میں اس کی تصویر تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پھر ہمنے اس میں رنگ بھرا۔"

"لاؤ۔ ہم بھی دیکھیں۔"

"نسیمہ لپک کر اپنی چھوٹی سی میز پر جا پہونچی، اور اپنے زنگیں کاغذوں، تصاویر اور کتابوں کو الٹنے لگی۔"

ارشد ایک نہایت غمگسار بھائی اور محبت کرنے والا شوہر تھا، اس کے پہلو میں ایک دردمند دل تھا اور اس کا زرخیز دماغ اعلیٰ وارفع خیالات کا ملجائے وماوائے تھا۔ وہ اپنی بہن کی گرویدگی اور بے لوث محبت دیکھ کر جھومنے لگتا تھا، اور اس میں شک نہیں کہ بہن کی پاکیزہ محبت اپنے اندر ایک ایسی دل لبھانے والی جاذبیت رکھتی ہے جس کی قیمت دنیا کی بزرگ ترین خزانہ بھی ادا نہیں کرسکتا، علاوہ ازیں اس کی جان و دل کی مالک خورشیدہ اس کی بہترین شریک زندگی تھی، جس کی وفاشعاری، خوش سلیقگی اور نسوانیت دیکھ دیکھ کر ارشد وجد میں آجاتا تھا۔ خورشیدہ بھی بار بار اس کے محبت نواز خط و خال پر نگاہیں ڈالتی تھی، اور شرما شرما کر گردن جھکا لیتی تھی، عورت کے لئے تقریر اور گفتگو دونوں بے معنی ہیں، وہ نگاہوں سے جو مطالب سمجھ سکتی ہے، اور چہرے بشرے سے جو نکات اخذ کرسکتی ہے وہ سسنرو[^۱] بھی اس کے لئے وضاحت کے ساتھ بیان نہیں کرسکتا۔

نسیمہ اس صاف ستھرے گلستان آرزو کی بلبل تھی جس کی نواسنجیاں اور رنگیں بیانیاں لائق رشک تھیں، اور جن کو سن سن کر دونوں میاں بیوی باغ باغ ہوجاتے تھے۔

۱ روما کا ایک فصیح و بلیغ مقرر۔

چار بجے تک وہ سب چارسے فارغ ہوئے، اور ارشد میٹھی میٹھی نظروں سے خورشیدہ کو دیکھتا ہوا ٹینس کھیلنے چلا گیا۔ اور شام تک ٹینس کھیلتا رہا۔ شب کو کھانے کے بعد ارشد اور خورشیدہ حسب معمول کتب خانے میں جا بیٹھے اور پڑھنے میں مصروف ہو گئے۔ آخر کار خورشیدہ اخبارات دیکھتے ہی دیکھتے سو گئی ع

"اُن کا سونا بھی ہے کس شان کا سونا دیکھو!"

(۲)

آفتاب کو بلند ہوئے عرصہ ہو گیا، دنیا کی کل ذمہ دار آبادی جس میں دیہات کے غریب اور مفلوک الحال کسان بھی شامل ہیں اپنے اپنے فرائض منصبی میں منہمک ہیں، بازاروں میں دکانیں کھل چکی ہیں؛ اور دنیا کے تمام کاروبار اپنی معمولی رفتار کے ساتھ انجام پا رہے ہیں، مگر ہمارے دوست منشی عرفان علی صاحب زمیندار موضع نوابگنج اب تک خواب غفلت سے بیدار نہیں ہوئے۔ نہیں نہیں..... بیدار تو ہو چکے ہیں مگر اب تک بستر پر دراز ہیں، اور جمائیں لے لیکر اور کروٹیں بدل بدل کر کبھی آسمان پر اور کبھی مکان پر درو دیوار پر ایک بے پروایانہ انداز سے نگاہیں ڈال رہے ہیں۔ آخر کار بعد دقت بسیار ٹھیک نو بجے منشی جی نے چادر اتاری اور پاؤں لٹکا کر پلنگ پر بجائے لیٹے رہنے کے بیٹھ گئے، چہرہ پر خستگی اور حزن کے آثار ہیں۔ اُفق، پیشانی گرد آلود، آنکھیں پھٹی پھٹی بے رونق اور بھیانک ہیں، دہن مبارک کے ایک گوشہ میں شب گذشتہ کا پان دبا ہوا ہے اور جسم کے صرف ضروری ضروری حصے ایک صدری اور ایک تہ بند سے ڈھکے ہوئے ہیں،

"(ایک مہیب اور رعشہ براندام کرنے والی گالی دیکر) خیراتی ......اور! خیراتی کے بچے! حقہ لا!"

ایک کثیف سا حقہ لاکر سامنے رکھ دیا گیا جس کو صرف روزِ ازل میں تازہ کیا گیا تھا۔ منشی جی نے حقہ گڑگڑانا شروع کیا، اور تقریباً آدھ منٹ تک اسی شغل میں ہمہ تن مصروف رہے۔ اس دوران میں غریب زہرہ ادھر آنکلی جس سے نمبردار صاحب کے جذبات میں ایک خفیف سا ارتعاش پیدا ہو گیا۔

"کہو جی! پھوجان! یہ کونسی کتاب پڑھ رہی ہو؟"

زہرہ اس لقب کو سن کر بے حد شرمائی۔ اس سوال کا کچھ جواب تو نہ دے سکی، مگر وہ کتاب منشی جی کے سامنے پیش کر دی، اتفاقاً نمبردار صاحب محض ابجد خواں تھے، معاً ان کو یہ خیال پیدا ہوا کہ شاید ان کی بیوی ان کو ان پڑھ سمجھتی ہے۔ فوراً کتاب ہاتھ میں لے لی، اور صدری کی جیب میں سے اپنی عینک نکالنے لگے، ایک منٹ بعد منشی صاحب کی ناک کے بانسہ پر سفید تال کا چشمہ لگا ہوا تھا، اور کتاب کے نام پر ہر ممکن زاویہ سے نگاہیں ڈالی جا رہی تھیں، سعیِ بلیغ ناکام رہی، از سرِ نو عینک کو ٹھیک مقام پر رکھا، اور کتاب کو قدرے بعید تر لیگئے۔

"عینک بالکل خراب ہے۔ ذرا صاف نظر نہیں آتا..........

اچھا!......خر.......خر.......ہاں! بس سمجھ گیا

......اس میں گدھوں کا ذکر ہے.......... گدھوں کا!"

زہرہ کی نگاہیں نیچی تھیں، اور زبان خاموش، وہ حسبِ معمول پھر اسی وحشت کدہ میں جا پہونچی تھی، جہاں ہر طرف تیرہ بختی، اور نامرادی کی سیاہ گھٹائیں چھائی

ہوئی تھیں اور جہاں قدم قدم پر محرومی و ناکامی سے دو چار ہونا پڑتا تھا۔ منشی صاحب صحت خانہ پہنچے، اور زہرہ بھی سوچتی رہی کہ کیا مجھے انہیں کے ساتھ اپنی زندگی کاٹنا ہے۔ انکے ساتھ........ جواخر النسا ریں سے صرف "خر" پڑھ سکے، اور معاً کہنے لگے کہ اس کتاب میں گدھوں کا تذکرہ ہوگا۔

"لوگ کہتے ہیں کہ دنیا میں ہر طرف مسرت و شادمانی ہے، باغوں میں ہرے ہرے درخت اور سرسبز پودے ہیں، درختوں میں شیریں پھل اور پودوں میں پیارے پیارے پھول ہیں، زندگی پر کیف ہے، حیات شادکامی سے مالا مال ہے۔ شہروں میں عمدہ عمدہ عمارتیں، دلفریب باغات، وسیع کتب خانے، اعلیٰ درسگاہیں، اور ہزار ہا تفریح کے سامان موجود ہیں، دیہات میں تازی تازی ہوا، سکون، راحت، سادگی، خوش منظر کھیت، فارغ البالی اور آسودگی ہے........ نہیں........ نہیں........ شاید یہ ایسا ہو۔ مگر میرے لئے حیات ایک نہایت متلاطم ناپیدا کنار سمندر ہے جس کی کوہ پیکر اور فنا پرور موجیں ہر لحظہ میری ناتوان اور ضعیف کشتی کو زیر و زبر کرتی رہتی ہیں۔"

کامل ایک گھنٹے کے بعد لمبردار صاحب صحت خانہ سے برآمد ہوئے باہر آکر منھ ہاتھ دھویا، مگر اسی درمیان میں ماما کو دو چار صلواتیں اور خیراتی کو دو چار گالیاں سنا چکے تھے، آخر کار پلنگ پر آن بیٹھے، اور مرغیوں، کبوتروں اور بٹیروں کا تماشا دیکھنے لگے جن کو وہ جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے، اور جن کی بداعمالیوں نے کل گھر کو نہایت ناپاک اور گندہ بنا دیا تھا، مگر کسی کی کیا مجال تھی جو اُن کو آنکھ بھر کر بھی دیکھ لے، یا انکی خدمت میں کوئی گستاخی کرے؟

گیارہ بجے کے قریب منشی صاحب کھانے سے فارغ ہو چکے تھے اور ڈپٹی صاحب

کی عدالت میں جانے کی تیاری کر رہے تھے جہاں انکو بیدخلی، بقایا لگان، کے کئی مقدمے دائر کرنا تھے، اور دو تین ڈگریاں اجرا کرانا تھیں۔

شام کے وقت کھانا تو منشی جی مغرب سے پیشتر ہی کھا چکے تھے، مغرب بعد وہ بستر پر دراز ہوئے، اور بیوی سے راز و نیاز کی باتیں کرنے لگے۔

"چھمو! ہمیں تمہارا نام پسند نہیں"

"کیوں؟"

"یہ تو معلوم نہیں۔ زہرہ وہرہ سب واہیات، نام چھمو، تسمہ، ہم کو پسند ہیں، اس لئے ہم تم کو چھمو کہتے ہیں۔"

"مگر چھمو کے کیا معنی ہیں؟"

"معنی وانی تو ہمیں معلوم نہیں، وہ کسی اپنے آشنا سے پوچھنا"

یہ فقرہ در اصل لمبردار صاحب نے مذاق میں کہا تھا، مگر زہرہ کو نہایت ناگوار ہوا، مگر بیچاری لاچار، کیا کرتی، خون کا سا گھونٹ پی کر رہ گئی۔

"اچھا۔ اب بتاؤ کہ تم نے کون کون سی کتابیں پڑھی ہیں؟"

(ترش رو ہو کر) "مجھے سب کے نام تو یاد نہیں"

"اچھا، جو سب سے اچھی ہو اس کا نام بتاؤ"

"یہ بھی میں نہیں بتا سکتی"

"تو تم کو اپنے پڑھنے پر بڑا گھمنڈ ہے"

زہرہ عجیب خلجان میں مبتلا تھی، وہ کیسے بتا سکتی ہے کہ سب سے اچھی کتاب کونسی ہے، اور نہ وہ اپنے شوہر کو یہ سمجھا سکتی تھی کہ اس کا سوال مہمل ہے۔ جدا جدا علوم

فنون پر جدا جدا کتابیں چوٹی کی ہیں مگر یہ کون بتا سکتا ہے کہ اُردو یا انگریزی کی سب سے اچھی کتاب یہ ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ منشی صاحب کو اُس کا جواب ناگوار ہوا، اور اُن کو خیال گذرا کہ زہرہ اپنے علم پر بے جا طور سے نازاں ہے۔ غریب بیوی کے لئے یہ کسقدر مشکل تھا کہ وہ اس خیال کی تردید کر سکے۔ مگر زہرہ یقین کر چکی تھی کہ اُس کی زندگی ناکامیو تلخیوں، اور مجبوریوں کا مجموعہ ہے، اس سے وہ خاموش رہی۔ مگر ہمارے دوست خاموشی کو غم اور غصہ کا مرادف سمجھتے تھے، فوراً اپنی خصوصی گفتار سے زہرہ کو منانے لگے۔

"میں کہتا ہوں کہ خفا ہونے سے فائدہ؟"

" ! (خاموشی)"

"اچھا ہم تمہیں ایک بھینس خرید کر دیدیں گے، تم اُس کا دودھ اور مکھن کھانا۔"

" !! (خاموشی)"

"دیکھو، اگر تمہیں بھینس پسند نہ ہو تو جو تمہیں پسند ہو وہی سہی، بتاؤ، گائے لوگی.......... کوئی عمدہ سی بکری خرید دوں؟"

"نہیں، نہ مجھے گائے چاہیئے، نہ بھینس"

"اچھا تو راضی ہو جاؤ ورنہ ہم افیم کھا لیں گے۔"

"میں تو راضی ہوں"

"بالکل؟"

"ہاں"

زہرہ نے پاندان کھولا، ایک پان خود کھایا، اور ایک منشی جی کو دیا، بدقسمتی سے لمبردار صاحب زردہ بہت کھایا کرتے تھے، اور اُگالدان کے کبھی منت کش احسان نہیں ہوئے،

گھر کی تمام وسعت میں کوئی گوشہ ایسا نہ تھا جس کو منشی جی کی حماقت پاشیوں نے گلنار نہ بنایا ہو۔ یہ بات زہرہ کو شدت سے ناپسند تھی مگر اس کے کہنے کا مطلق کوئی اثر نہ ہوا، اور منشی صاحب حسب معمولی اگالدان کی مدد سے بے نیاز رہے۔

تھوڑی دیر تک اسی قسم کی باتیں ہوتی رہیں۔ آخر کار زہرہ نے دیوان غالب اٹھا لیا، اور منشی صاحب لغیر خواب بند کرنے لگے۔ دیوان میں پہلا شعر جس پر اس کی نگاہ پڑی یہ تھا ؎

نکتہ چیں ہے غم دل اسکو سنائے نہ بنے
کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

زہرہ کئی دن تک کچھ کھوئی ہوئی سی رہی، مگر یہ شعر برابر اس کی زبان پر جاری تھا۔

(۳)

فطرت کی کرشمہ سازیاں یا بہ الفاظ دیگر ہماری حماقت آرائیاں کس درجہ محیر العقول اور مایوس کن ہیں، خورشید، اور زہرہ دونوں بہن ایک ہی گھر میں اور ایک ہی آب و ہوا میں پلیں اور بڑھیں، ایک ہی تعلیم سے مستفیض ہوئیں، اور ایک ہی قسم کے کمالات حاصل کر سکیں مگر **ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا**۔ اس کو "وقت اور بخت" پر محمول کرنا شاید صحیح ہو، مگر ایسے نوے فیصدی واقعات و سانحات خود ہمارے ہاتھوں سے انجام پاتے ہیں جس کے ہم بجا طور پر ذمہ دار ہیں۔

نوید طرب

(محبت ناکام کے نقطۂ نظر سے)

(از جناب سید محمد محمود صاحب رضوی۔ بی۔اے۔ مخمور)

تری خلوت حسیں کی وہ نوید ہم نشینی
کہ قرار کش نہیں اب مری عافیت گزینی
مرے تن میں روح پھونکے جو وہ لمس یاسمینی
تو غنائے سرخوشی دے مئے لب کی انگبینی

مجھے چور کر چکا ہے یہ مسرت خیالی
ترا شوقِ لطف صحبت ہو مری شگفتہ حالی
طرب آفریں نہیں گر، تری طرح بے مثالی
تو سکوں نواز پھر کیوں ہے مری تپش خصالی

مرے درد مدعا کی تو دوائے چارہ فرما
مجھے کشمکش میں مت رکھ، بے مجھے اسقدر نہ تڑپا

نہیں درخورِ تلطف مرا حالِ زار اچھا
ترے رحم کی تمنا ہے مری امید تنہا

تو امید جاں فزا ہے مری بے کمالیوں میں
تو ہی میری چارہ گر ہے، مری پائمالیوں میں
مری جنت تماشہ، تری خوش خصالیوں میں
تو ہی دردِ ہمنوا ہے، مری خستہ حالیوں میں

تری ذات پر جو مائل ہوئی روح دلپسندی
تو یہ انتخاب موزوں ہے اوجِ سربلندی
اثرِ جمال تیرا، مرا حرز پائے بندی
ترا اتصالِ صحبت مجھے کسبِ ارجمندی

مجھے کیسے بھول جاؤں کہ تو جانِ آرزو ہے
تری برہمی سے قائم مرے دل کی آبرو ہے
مجھے کیا جو میرا چرچا سرِ بزم و کو بکو ہے
مرا کرب سوزِ فرقت ترا وقفِ جستجو ہے

تو وہ کیفِ طبع پرور کہ خجل شرابِ نوشیں

ترا اوجِ حسنِ سیرت ہے عیاں برنگ تمکیں
تری چشم میں درخشاں اثرِ قبول تحسیں
ترا جذبۂ تحکّم ہمہ بے نیاز تلویں

تو نوید شادمانی تو صلائے دلربائی
ترے عزم پر فدا ہے مرا عجز جبہہ سائی
تجھے سر بسر روا ہے یہ ادائے خود نمائی
کہ اسی سے بہرہ ور ہے ترا ذوق پارسائی

تری خامشی پہ دا ہے در یک جہان تلقیں
تری سادگی پہ قرباں دل و دین حسن تزئیں
تری اک نگاہ خنداں دل دردکش کی تسکیں
ترا علم رمز فطرت مری زندگی کا آئیں،

میں خراب و مبتلا ہوں تو نشاط و کامرانی
ترا حسن عیش پرور مرا لطف زندگانی
تری یاد میں بہم ہے مجھے عشرت جوانی
تری صحبتیں فسانہ تری خلوت اک کہانی

مرا مرکز بصر تو، مرا مطمح نظر تو،
مجھے درد سے غرض ہے تو سکون بےخبر تو
مرا دل سے واسطہ ہے تو خلش کی چارہ گر تو
میں جو گریۂ شبی ہوں تو تبسم سحر تو

ضروری اعلان

اودھ کے بادشاہوں اور اُن کے اُمراء اور لکھنؤ کے قدیم شعراءِ اردو کا ایک نادر الوجود قلمی مرقع شمع میں اشاعت کے لئے فراہم کیا گیا ہے۔ تاریخی اور صنعتی حیثیت سے یہ تصاویر حقیقتاً بے مثل ہیں تصاویر مذکور کے بلاک تیار ہو رہے ہیں اور شمع میں یہ یادگار سلسلہ شروع کیا جائیگا۔

جو حضرات اس مرقع کا مکمل سیٹ اپنے پاس رکھنا چاہتے ہیں اُن کو چاہئے کہ شمع کو باقاعدہ خریدیں۔

چونکہ شمع اور تصاویر معین تعداد میں چھپتی ہیں اور شمع کی فاضل کاپیاں بمشکل بچتی ہیں۔ اسلئے بذریعہ اعلان آگاہ کر دینا ضروری ہے کہ اگر آرٹ اور تاریخ اودھ کے شائقین نے پہلوتہی کی تو یہ مرقع پھر کسی قیمت پر بھی ان کو میسر نہ آئیگا۔

ان معرکتہ الآرا تصاویر کے علاوہ عہد مغلیہ و عہد جدید کی مصوری کے بہترین نمونے جو ابتک کبھی شائع نہیں ہوئے ہیں اور نہ کسی دوسری جگہ میسر آسکتے ہیں رسالہ شمع میں برابر شائع ہونگے۔ نمونہ کا پرچہ کسی حالت میں مفت روانہ نہیں ہوگا۔

مینیجر شمع

عورت اور تمدّن

(از ترجمہ جناب سید عبدالحمید صاحب)

عنوان بالا پر ۲۲ اپریل ۱۹۱۱ء کی رات میں انجمن "نادی الشرقی" کے ایک بڑے جلسہ میں جس میں انجمن مذکور کے ارکان اور دیگر محترم حضرات وخواتین شریک تھیں، موصوفہ نے حسب ذیل تقریر کی تھی،

(مترجم)

میں انجمن کے صدر جناب سکاکینی پاشا اور ممبران انجمن کا شکریہ ادا کرتی ہوں اور آپ حضرات کے حسن ظن پر اظہار تشکر کرتی ہوئی آپ کی اس دعوت پر بہایت مسرت کے ساتھ لبیک کہتی ہوں، قابل تحسین ہے کہ انسان خواہ عمر بھر میں ایک ہی مرتبہ کیوں نہ، قوم کے سامنے کھڑا ہو اور اپنے زیادہ محسوس ہونے والے افکار و جذبات کا اظہار کرے، اپنی تمنائیں اور قلبی خواہشیں قوم کے سامنے پیش کرے،

انجمن **نادی الشرقی** برادران مشرق کے اجتماع سے پر رونق ہے، اس منظر کو دیکھکر میری مشرقی روح دفور مسرت سے اچھل رہی ہے، میں آگے چل کر بہایت صراحت اور اعتماد کے ساتھ بیان کرونگی کہ بحیثیت موجودہ عالم نسوانی میں ایک بڑے صاحب لطف و کرم کی وہ پہلی لڑکی ہوں جو بلا خوف و ہیبت اپنے ماحول بسنے والوں کی رعایت ملحوظ رکھتے ہوئے بولتی ہے اور میری یہ جرات کلام تعجب خیز نہیں جب کہ ڈاکٹر نمر یہ فرما چکے ہیں کہ "بڑی نہر کے قریب چھوٹی چھوٹی جدولوں کا ہونا بے معنی نہیں،

محترم حاضرین اور شریف خواتین!

آج کل بفضل بہار ہے اجیات نے کائنات کے ہر جز میں ایک حرکت پیدا کردی ہے، رونق وخوبصورتی کا پیغمبر یعنی (بیساکھ کا مہینہ) اپنی رونق وخوبصورتی شاہ گل (جیٹھ) کے سپرد کر رہا ہے۔ پس مجھے کسی نئے موضوع کی ضرورت نہیں، موجودہ موسم ایک جمیل موضوع کی طرف اشارہ کر رہا ہے، وہ کیا؟ پھول! اس تعجب افزا مخلوق کو دیکھ کر ہر حساس اور ذی شعور انسان سمجھتا ہے کہ یہ قسم قسم کے رنگ وبو کسی پوشیدہ بھید کا پتہ دیتے ہیں۔ رات کا وقت ہے، ظلمت کی چادر آنکھوں کے سامنے تنی ہے، ہر چیز نگاہوں سے پوشیدہ ہے، پھول جو دن میں اپنے اوراق فتح وظفر کے پرچم کی طرح کھولتے ہیں، شب کے سناٹے سے سکڑ گئے ہیں، لیکن میں انھیں ایک ایسے پھول سے بدل دیتی ہوں جو ان سے زیادہ جمیل وشکیل ہے، جو حساس اور ذی شعور انسانوں کو دن سے زیادہ غور وفکر کے لئے مجبور کر دیتا ہے، جو غیور اور رحیم دلوں سے بہت کچھ اہتمام کا استحقاق رکھتا ہے، وہ پھول جس میں حسن کی آیات کبریٰ پوشیدہ ہیں۔ وہ پھول جس میں اشتیاق ورغبت کے نہایت گہرے اسرار مخفی ہیں۔ وہ پھول جسے حریت کی حرارت سیراب کرتی ہے، جسے زمانہ کی گردشیں ایک مدت سے صدمہ پہونچا رہی ہیں، لیکن اسکی ڈالی نہ جھکتی ہے نہ ٹوٹتی ہے، وہ پھول جس سے زمانہ مستقبل کی امیدیں حاصل کرتا ہے، اور زندگی کے چھوٹے چھوٹے ٹیلوں سے ہوتا ہوا انتہائی ٹیلے پر جا پہنچتا ہے، آپ نے پہچانا یہ عجیب پھول کیا ہے؟ عورت!

تمدن کی نورانیت کائنات عالم کے تینوں براعظموں میں جلوہ گری کی ایشیا اور افریقہ کی مبارک سکونت کے بعد سرزمین یورپ کی جہالت بھری تاریک فضا میں اس نے اپنے قدم جمائے، اور اس کو علم وحکمت سے منور کیا، گویا کسی نے تمدن سے کہا، کہ مشرق پر وہ بہت کچھ احسان کر چکا اس لئے اس نے اپنے برکات واحسانات کا مرکز اس براعظم کو بنایا جہاں

کامیابی کی راہ میں تقلید روڑے نہیں اٹکاتی، جہاں عادات قدیمہ جینے والوں کے لئے بارگراں یا پاؤں کی زنجیر نہیں، وہ ہر عالم جس کے متعلق کسی محقق کا قول ہے، کہ کلمبس جس وقت عالم جدید کے انکشاف میں مصروف تھا، لوتھر عالم قدیم کی دیواریں گرارہا تھا،

بے شک تمدن نے عالم کائنات کا طواف کیا، لیکن ہم کس حال میں ہیں؟ اس میں کچھ شک نہیں کہ تمدن نے علوم وفنون، ادبیات اور معاشیات میں اپنے معجزے دکھائے، لیکن بدبختی ہے ہم اب تک اپنے گردوپیش مختلف اسلوبوں میں جنگ وجدل فقر ومرض، انحطاط وپستی اور اخلاقی کمزوریوں کے دلخراش مناظر دیکھتے ہیں، ابھی جماعتیں اپنی حکومتوں سے شاکی ہیں، وطن، ابنائے وطن سے اب تک نالاں ہے، تاہنوز افراد کی پستیوں سے خاندان گرفتار عذاب ہیں، افراد اپنے عادات اور میلان طبع کی قید سخت سے کرب وبے چینی کی زندگی جی رہے ہیں، ہرگز ہرگز نہیں کہا جاسکتا کہ تمدن نے اپنے پورے پورے فرائض ادا کردیئے، اور حالات میں کافی اور کامل اصلاح کردی، آپ حضرات جانتے ہیں اس نقص کا سبب کیا ہے، ؟ نصف انسانیت کی پستی اور جہالت، ہوجو کا قول ہے،

"تنہا مرد انسان نہیں اور نہ تنہا عورت انسان ہے، بلکہ دونوں مل کر انسان ہیں، فرداً فرداً ان میں سے ہر ایک نصف انسان ہے، کمال انسانیت اسی وقت متصور ہے، جب یہ دونوں جنسیں باہم ہوں، انسان کی صحت اس کے دل ودماغ کی سلامتی پر موقوف ہے، اور مرد کی صحت اور سعادت عورت کی خوشگوار زندگی پر"

عورت کی تاریخ، اگر زمانہ صاحب زبان ہوتا، اور تم اس سے عورت کی تاریخ پوچھتے، تو یقیناً اسکے جواب سے تمھارا دل خون آلود ہوجاتا، نصف انسانیت کا یہ نرم حصہ

دحشت کے ہاتھوں خانگی جانوروں کی حدتک پہونچ چکا تھا، جہالت نے اسے مرد کی ملک محض کا مرتبہ دے رکھا تھا، عورت پر مرد کا تصرف و استعمال انتہائی خود مختارانہ تھا، وہ جب چاہتا اور جس طرح چاہتا، اس سے کنارہ کش ہوجاتا، بلکہ بعض ذاتی اغراض کی تکمیل میں اگر ضرورت ہوتی تو اس کا دامن ہستی بھی ہمیشہ کیلئے چاک کردیتا، کچھ دنوں بعد اس نے غلامانہ درجے طے کئے اور قیدیوں کی طرح زندگی بسر کرتی رہی تا آنکہ اقوام عالم کے نشیب و فراز نے اسے ایک کھلونا بنادیا، جس سے اس کا مالک باوقات فرصت کھیلتا، اس زمانے میں وہ ایک پتلی تھی جو انواع و اقسام کے ریشمی کپڑوں اور گراں قیمت زیورات و جواہرات سے سجی اور لدی رہتی لیکن بایں ہمہ اُس کے قلب خونیں کے اُن زخموں کا علم کسی کو نہ تھا جو ریشمی کپڑوں کے اندر چھپے تھے اور کسی نے ان کے ضماد کی کوئی تجویز نہ سوچی،

عورت کی تاریخ ایک الم انگیز طویل داستان ہے، اور سخت تعجب ہو کہ زمانہ قدیم سے اس غریب کا کوئی ہمدم نہیں یہ شروع ہی سے مخلصین اور معاونین کا سہارا نہیں رکھتی، عوام کی شریعت میں اس کی تحقیر بالکل منصوص تھی، وہ بجز اپنے مختصر دائرے کے عورت کیلئے سنگدل اور ٹھوس تھے لیکن اس سے بھی زیادہ تعجب خیز بلکہ افسوسناک بات یہ ہے کہ ہم جنہیں روشن دماغ اور ماہر زمانہ کہتے ہیں وہ بھی اس میدان میں صحیح المسلک نہیں اور غلط راستہ چل رہے ہیں، لاطینی شعرا عورت کے ظاہری جمال و حسن میں رطب اللسان ہیں، ان کے طویل قصائد عورت کے آثار لعن سے خالی ہیں، وہ متفقہ طور پر صنف نازک کی تعبیر "خوبصورت شیطان" یا "سرچشمہ مسرات" کرتے ہیں یونانی شعرا جیسے اسخیلوس، اور بیدس وغیرہ عورت کیلئے "مسرت عامہ"، "فرحت کلی"، "بلائے عام" کے سے کلمات استعمال کرتے ہیں، اب رہا فلاسفہ کا طبقہ تو میں سب سے بڑے فلسفی افلاطون کا ذکر کردینا مناسب سمجھتی ہوں،

افلاطون الہٰی، وہ افلاطون جسے غور و فکر کی تاریخ میں ایک پوری قوم ہونے کا مرتبہ حاصل ہے، وہ افلاطون جس نے عالم کائنات کی سعادت اور اصلاح کے لئے، ملکی، سیاسی، ادبی، اخلاقی، علمی، غرض ہر موضوع پر اصلاحانہ قلم اٹھایا ہے، وہ افلاطون جس کے افکار نہایت عمیق، جسکا نقطۂ نظر بہت بلند تھا، اس نے عورت کی اصلاح کیلئے کبھی غور نہیں کیا، نسوانی تہذیب اخلاق کا، اسے کچھ اہتمام نہ تھا، اس نے عورت کی استعداد اور قابلیت معلوم کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی، کیا کہوں، کہ اس افلاطون نے اپنی عمر عبث گزاری، وہ ایک عورت ہی کا بچہ تھا جسے نہایت جرأت کے ساتھ ماں کہکر پکارتا تھا، افلاطون کا اعتقاد تھا کہ جو شخص اس عالم میں بزدل ہے، دوسرے جنم میں اس کی روح کسی زنانہ پیرہن میں ظہور کرے گی، یا کسی حیوانی جسم میں حلول کریگی .... افلاطون کو یہ خبر نہ تھی کہ اس کا جدید فلسفہ، افلاطونی ایک عورت ہی کا مرہون تعلیم اور تشر مندہ تدریس ہوگا وہ نہیں جانتا تھا کہ مشہور ریاضی داں تھیوں کی لڑکی ہیپاشیا اسکندریہ کے مدرسہ میں اس کے فلسفہ کی معلّمہ ہوگی، اور اس کا بھرا ہوا شباب اور دلکش حسن و جمال اس کے لئے علم و فن میں وحید العصر ہونے سے مانع نہ ہوگا، یہ شہید علم و اخلاص چوتھی صدی میں اسکندریہ کی سڑکوں پر رجماً قتل کی گئی اور دنیا سے جدید فلسفہ افلاطونی کی اشاعت و تبلیغ کا شوق دل میں لئے رخصت ہوئی۔

عورت کی شان بڑھانیوالے، پہلا شخص جسنے عورت کو رحم و کرم کی نظر سے دیکھا وہ جناب یسوع ناصری (حضرت عیسیٰ علیہ السلام) کی ہستی ہے، آپ مرد و زن میں مساوات کے اوّلیں بانی ہیں، بایں معنی کہ کارہائے خیر کی تعمیل میں مرد و زن یکساں ثواب کے مستحق ہیں اور گمراہی و گناہ کے بدلے میں عورت مرد یکساں طور پر قابل عذاب، مگر اس کے باوجود بھی مسیحی مذہب نے عورتوں کو پادریت کے فرائض سے محروم رکھا، اور لاہوتیوں کا ایک گروہ تو ہمیشہ

عورت کو گناہوں کی پوٹلی سمجھا رہا۔

اس کے بعد پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم، روحی وقلبی فداہ) کا ظہور ہوا، آپ نے عورت کی بہت کچھ شان بڑھائی یہاں تک کہ اس کو جملہ حقوق میں مرد کا بالکلیہ مساوی شریک وسہیم بنا دیا صرف شہادت اور میراث کے دو ایسے مسئلے ہیں جن میں دو عورتوں کی حیثیت ایک مرد کے برابر ہے ورنہ مرد وزن جملہ حقوق تمدن میں مساوی درجہ رکھتے ہیں، وہ سیاسیات میں بھی اسی طرح حصہ لے سکتی ہیں، جس طرح فقہیات میں اسلام کی اولین فقیہہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زوجۂ محترمہ (ام المومنین) حضرت عائشہ صدیقہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہا) ہیں فرمان نبوی ہے

خذوا نصف دینکم عن ھذہ الحمیرا ۔ نصف دین کی تعلیم (حضرت) عایشہ (رضی اللہ عنہا) سے حاصل کرو۔

ہاں مجھے پٹرارکا اور ڈانٹی کا تذکرہ بھی کرنا چاہیے، شعرا اور محققین کے طبقہ میں انہیں دو ہستیوں کو عورت کے احساسات ونفسیات کے محسوس کرنے کا فخر اولین حاصل ہے، ان کے اشعار میں کمال ادبی اپنا جلوہ دکھا رہا ہے اور ہر جنس لطیف کی طبع نفسی، روشن طبعی، ذکی الحسی، جنس قومی کی لغزشوں اور فروگذاشتوں کی نگرانی وغیرہ اوصاف بھی زینت سخن ہیں، اور ادبیات ترشش کو کون نہیں جانتا، یہ دونوں نام پٹرارکا اور ڈانٹی کے ناموں سے جدا نہیں ہو سکتے۔ یقیناً یہ دونوں ہستیاں ایک اعلیٰ نمونہ ثابت ہو کر رہینگی، جس کی اتباع ہر عورت نہایت خوشی سے کرے گی، ڈانٹی کے ذہن میں جس بہترین نمونہ کا تصور تھا، اور جس کا نقشہ اس نے اپنے جادو بھرے اشعار میں کھینچا ہے، وہ قرون وسطیٰ کی تاریکیوں کو چمکنے والی بجلی کی طرح معدوم کر چکا،

ان کے بعد شعرائے جدید کا سردار شکسپیر قلم درکف، اصلاح کے اسٹیج پر آیا، اور اپنے

اکثر ناولوں کے ہیروزان اعلیٰ اخلاق کی عورتوں کو قرار دیا جن کے دلوں میں شجاعت محبت اور صداقت کے برترین، احساسات موجزن تھے، علیٰ ہذا القیاس کورنامل، بولین، کامیل اور نیشمال وغیرہ نے اپنے ناولوں میں اعلیٰ اخلاق اور بلند کیریکٹر کی عورتوں کو ہیرو بنایا۔

اس زمانہ کے کل مصلحین شکسپیر اور کورنامل کے ہمنوا نہ تھے، بلکہ خود مصلحین کا سرغنہ بوسویہ مخالف تھا، اور صنف نازک کو نہایت مبغوض نظر سے دیکھتا تھا، اس کا قول ہے۔

"عورت کی پیدائش مرد کے زائد پہلو سے ہوئی ہے، اسی لئے وہ عقل و ادراک، ذہن وذکاوت کی نعمت سے محروم ہے"

خدا تیرا بھلا کرے بوسویہ، تو حقیقت رس اور دقیقہ شناس نہ تھا، مجھے اس سے بحث نہیں کہ عورت کی پیدائش مرد کے پہلو سے ہوئی ہے، ہاں اتنا ضرور کہونگی کہ عورت کے خمیر کا مرد کے پہلو کے افسردہ پانی سے ہونا اس کے لئے اس سے بہتر کہ وہ نری مجسم تصویر ہو، اب رہا اس پہلو کا زائد ہونا تو یہ ایک بحث طلب مسئلہ ہے، بہرحال میں اس وقت کسی تشریعی یا غیر تشریعی مسئلہ کے ثبوت کے درپے نہیں ہوں۔

پاشکستہ تمدن بزرگان من، تھوڑی دیر کے لئے اس دفتر پارینہ کا مطالعہ چھوڑ کر ہمیں عہد حاضر کے اوراق پر نظر دوڑانی چاہیئے، نسوانی بیداری روزانہ ترقی کرتی ہوئی ربع مسکون کو محیط ہو رہی ہے، یہ حیرت انگیز بیداری خیر عظیم کی بشارت دیتی ہے، اور زبان حال سے کہہ رہی ہے کہ مستقبل کا منفعت بخش تمدن ماضی کے تمدن کی طرح پاشکستہ نہیں ہے، کیونکہ گزشتہ مدنیت کی بنیاد صرف ایک ہی جنس پر تھی، اور آنے والا تمدن دونوں جنسوں کو محیط ہے، مستقبل کا تمدن صرف مرد کا نہیں بلکہ انسانیت کا تمدن ہے، جسمیں مرد وزن برابر شریک ہیں، عورت اپنے حقیقی مرکز کی طرف نہایت سرعت کے ساتھ ترقی کر رہی ہے ارتقائے نسوانی کا دریا روز بروز

زیادہ متلاطم اور تموج خیز ہوتا جاتا ہے، فرانس، انگلستان۔ امریکہ، المانیہ، اور اٹلی میں عورت اپنی جنسی ترقی اور اس کے ساتھ ہی نوع بشری کی ترقی کیلئے بہادر مردوں کی طرح جہاد کر رہی ہے اسوج، نزوج، فلنڈا اور جدید زیلینڈ نیز بعض ممالک متحدہ میں تو عورت نے اپنے حقوق حاصل کرلئے چنانچہ مقامات مذکورہ میں ادبی، تمدنی، اور سیاسی قوانین میں عورت بالکل مرد کی طرح ہے، اور اس نسوانی انقلاب سے مذکورہ ممالک میں بہت کچھ فائدے بھی ہوئے، چونکہ انقلاب کے بعد حکومت کے وظائف اور مناصب میں عورت برابر کی شریک رہی اس لئے جرائم کی فہرست بہت کچھ مختصر ہوگئی، اور میکدہ کی گرم بازاری پر تو گویا اوس پڑگئی غرض اس انقلاب نسائی سے قوم نے اچھی طرح محسوس کرلیا کہ عادات و اخلاق پر خیر اور بہتری اپنا سایہ کر رہی ہے،

یہی ہے جدید عورت، اور اسی میں مستقبل کی امیدیں مقفل ہیں،

عورت کے موجودہ مشاغل کتنے ہی لوگوں نے کہا کہ عورت کی تخلیق محض خانگی کاموں کے لئے ہے، اس کا کام سرمہ، مسی ہی تک محدود ہے، اور بڑی مصلحت اسی میں ہے کہ اس کا دائرہ عمل گھر سے متجاوز نہ ہو، کتنے ہی لوگوں نے کہا کہ عورت ایک لطیف شکل اور خوبصورت شیطان ہے حالانکہ اب وہ ایک بلند مرتبہ فرشتہ ثابت ہو رہی ہے، اور مردوں کو سمجھانا چاہتی ہے کہ زندگی میں ایک لطیف اور بلند عنصر ہے اور وہی سراپا حیات ہے، کتنے ہی لوگوں نے کہا کہ عورت جھوٹی اور بدچلن ہے صداقت اور اخلاص اس سے اتنا ہی دور ہے جتنا جنوب سے شمال، حالانکہ وہ اب ذاتی اصلاح و تہذیب نیز ان کمزوریوں کے دور کرنے میں مصروف ہے جو زمانہ عبودیت میں اسے لاحق ہوگئیں تھیں، کتنے ہی لوگوں نے کہا کہ عورت ایک متردد اور متحیر ذہن رکھتی ہے، اس میں غور و فکر کا مادہ نہیں وہ کسی مسئولیت اور ذمہ داری کی متحمل نہیں ہوسکتی، حالانکہ اب وہ نہایت مستقیم، خوددار، استقلال و ثبات کی حریص زندگی کے عمیق معانی کی جویاں ثابت ہو رہی ہے، فولٹر نے متعدد مرتبہ کہا

کہ عورت کا غور و فکر سریع الزوال ہے اگر کسی عملی مسئلہ کی فہم میں وہ بہت جلد مخبوط الحواس ہو جاتی ہے،
کسقدر حیرت ہے کہ نولٹر یہ کہتا ہے حالانکہ نیوٹن کی تصانیف کے سمجھنے میں ایک عورت ہی نے اسکی مدد کی
تھی اور وہ اسکی محبوبہ میڈم دی شاتلیہ ہے جس نے نیوٹن کی کتاب کا ترجمہ ناموس اجاذبیہ کے نام سے کیا،
یا د کرو مدموازل لابلاس، ماری کو اسکی، میڈم کوری، اور دوسری بیسیوں عورتوں کو جو طبیعات اور
علوم مجردہ میں اس وقت مصروف تحقیق و تدقیق ہیں، ان سینکڑوں عورتوں کو جو صنعت و حرفت
کے شعبے میں کارپرداز ہیں، فرانس میں ۵ لاکھ عورتیں مختلف اعمال و اشغال میں مصروف ہیں اور
پھر خانگی معاملات کی ذمہ داریاں مزید براں، اور انگلستان اور ممالک متحدہ میں بھی چنانچہ ان ممالک
میں صرف معلمات کی تعداد ۳ لاکھ ہے، مردم شماری کرنے والوں کا بیان ہے کہ مصر میں اس وقت
۱½ ہزار عورتیں عام تجارتی کاموں میں مشغول ہیں،

علم کا اثر عورت پر برا ہوگا، کتنے ہی لوگوں نے کہا کہ علوم و معارف عورت
کے لئے مناسب نہیں تعلیم سے اس کی زینت اس کا انکسار و ملطف جاتا رہتا ہے، وہ علم کی تحصیل
کے بعد متکبر ہو جاتی ہے خاندان کو بے وقعت، حقیر اور شوہر سے تمسخر کرنے لگتی ہے، مگر ہم دیکھتے
ہیں کہ تعلیم یافتہ عورت پہلے سے زیادہ جمیل، پہلے سے زیادہ منکسر المزاج اور پہلے سے زیادہ خاندان
و شوہر کا احترام کرتی ہے، وہ اب زندگی کے معانی سمجھتی ہے اور اپنی کل قوت کے ساتھ ذاتی احساسات
و ملاکات کی ترقی کی خواہاں ہے، وہ اپنے گرد و پیش خیر و سعادت پھیلانا چاہتی ہے، اور اسکی
کوشش کر رہی ہے، ترقی یافتہ عورت میں اس زمانہ فخر کا احساس ہے کہ وہ صحیح معنوں
میں ماں کہلائی جانے کی مستحق ہو جائے، وہ یہ اچھی طرح جانتی ہے کہ ابتک وہ صرف اپنے
جسم کی ماں تھی لیکن اب وہ چاہتی ہے کہ روح کی ماں ہو، جذبات و اشتیاقات کی ماں ہو، افکار
و خواہشات کی ماں ہو، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ برترین تہذیب یافتہ اور مخلص ترین دوست ہو۔

عورت بیوقوف ہے۔ کتنے ہی لوگوں نے کہا، عورت بیوقوف اور بے عقل ہے، اسکی زندگی طفلانہ تلون، غیر منقطع خواہشات کی کڑیوں سے بنی ہوئی ایک زنجیر ہے، مگر اب ہم دیکھتے ہیں کہ اسکی نظر نہایت عمیق اور غائر ہے، وہ اپنا مستقل نصب العین رکھتی ہے، اس نے ذاتی منافع اور شخصی مفاد کو منفعت عامہ کے دریا میں غرق کر دیا، روس کو دیکھو، عورتیں مردوں کی طرح متاثر بلکہ مردوں سے زیادہ الم پذیر ہیں، روس کی دماغی اور فکری بغاوت یقیناً سیاسی بغاوت کے اسباب پیدا کر دیگی (یہ پیشین گوئی کس درجہ جلد پوری ہوئی) کتنی حسین اور نوجوان عورتوں نے اپنے شوہروں کو مصلحت وطنی پر قربان کر دیا، اپنے عیش و آرام پر لات مار کر وطنی انجمنوں میں محض اس لئے شریک ہوگئیں کہ ان انجمنوں کی تائید میں ملک کا مفاد متصور تھا۔

عورت کے معین و ہمدرد۔ اس تراجی (نوصنویت) کے زمانہ میں عورت پر جبر و اکراہ کرنے والے بہت ہیں لیکن اس کے ہمدرد ان سے زیادہ ہیں، اور وہ ہمارے زمانے کے مدبرین ہیں جو عورت کے اس جہاد کو عزت کی نظر سے دیکھتے ہیں، اور اس کے حقوق کا اعتراف کرتے ہیں، انھیں عورت کے استقلال و اقدام پر مسرت ہے۔ وہ نسوانی بیداری میں مصائب عالم کی تخفیف کا راز مضمر سمجھتے ہیں، فیکٹور ہیوگو کا قول سُنئے۔

«نسوانی آزادی سے اکثر اجتماعی اور بعض تمدنی مشکلات کا خاتمہ ہو جائے گا»

موصوف منتظر ہیں کہ عالم ہستی سے جنگ کا انسداد عورت کر سکے گی،

حیات کا شعلہ مصر میں، زمانہ کے مُنہ سے عورت کی آواز آرہی ہے کہ بیسویں صدی عہد نسوانی ہے، یہ آواز صداقت کا رنگ رکھتی ہے، عورت ہر جگہ حیات کا جلوہ دیکھنے کے لیے آنکھیں کھول رہی ہے، چین، جاپان، ترکستان حتیٰ کہ مصر میں بھی میں دیکھتی ہوں کہ حیات کا شرارہ مشتعل ہو رہا ہے، مصر کے مرد قلم و زبان کے ذریعہ ہماری مدد کرتے ہیں، اور انکی بڑی تمنا ہے

کہ عورتیں ان کی عنایت و اہتمام کی مستحق نہیں، یقیناً مصری معاشرت کی قدیم پابندیاں اب اٹھ رہی ہیں، جو آج تک مصری عورتوں کے لئے باعث عذاب رہیں، بے شک ہم ایک روشن مستقبل کی چوکھٹ تک پہونچ چکے ہیں، اور مصر حیات تازہ کے شراروں سے مشتعل ہے ورنہ آپ حضرات کے سامنے میرا کھڑا ہونا کیا معنی رکھتا ہے، اور تمہاری اس سکوت و سکون نیز نہایت غور و فکر کیساتھ ہمہ تن گوش ہونے کا کیا مطلب؟ میرا سوز و گداز کے ساتھ درد بھری آواز میں اس وقت کچھ کہنا اور تمہارا اہتمام و کمال متوجہ ہوکر سننا، درحقیقت یہ وہ نقشہ ہے کہ گویا تم عہد قدیم کے مرد ہو اور میں عورت کی پرانی اور خاموش آواز، وہ سرکش اور جبار مرد اپنی تمام قوت سمعیت گہری توجہ کے ساتھ سن رہے ہیں، اور وہ آواز جس میں ہمیشہ سے پستی اور مبہم تمرد کی بو آرہی ہے آج بلندی کے ساتھ ابتدائے آفرینش کے گزشتہ طبقات چیرتی ہوئی، قبروں کے گوشے پھاڑتی ہوئی، دریا کی سطح الٹتی ہوئی بلکہ حیات کے ہر عنصر کا پردہ چاک کرتی ہوئی مردوں سے مخاطب ہوکر کہہ رہی ہے،

"اے مرد تو نے مجھے مقید رکھا، اس لئے خود محکوم رہا، اب مجھے آزاد کرتا کہ تو خود آزاد ہو، مجھے آزاد کرتا کہ انسانیت آزاد ہو"

عدن کا عربی مضمون

(از جناب - ایف - ایم - شجاع صاحب)

مجھے اس اعلان کو دیکھ کر جو مضمون بالا کے نیچے اڈیٹر صاحب نے شمع بابت نومبر ۲۵ء میں لکھا ہے، اظہار خیال کی جرأت ہوئی۔ جو کچھ میں کہوں گا وہ میری ذاتی رائے ہوگی۔ بعض کے نقطۂ خیال سے یہ حلقۂ مذہب سے خارج ہوگی۔ وہ اس لئے کہ احکام کی فرمانبرداری ہر مسلمان پر برابر ہے، صرف ہندوستان کے لئے نہیں مساوات کے دونوں طرف کی برابر، قوم ایک دوسرے کو زائل کر دیتی ہیں۔

میرا سابقہ ہندوستان سے باہر چند مسلمان قوموں کے صاحب فہم اور قابل وثوق اشخاص کے ساتھ پڑا - ان کی زبانی جو حالات اور دیگر ممالک کے خیالات معلوم ہوئے وہ میرے دل میں جاگزین ہیں۔ حصول مطلب کے لئے کسی خاص طرح کی رائے کا اظہار بناوٹ پر مبنی ہوا کرتا ہے، بلکہ حقیقت مختلف ہوا جو کہ باہم اختلاط سے اخذ کی جاسکتی ہے - ان حالات کے معلوم ہونے پر میری بڑی دلشکنی ہوئی اور اپنے ہم مذہب ہم وطنوں کی غلط فہمیوں اور خوش اعتقادیوں پر افسوس

میاں یہ سب وصول کرنے کے ڈہنگ ہیں، ہندوستان ہ

سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

غرض اظہار رائے سے ہے نہ کہ بحث سے، اور ماقل ودل

آج وہ دن نہیں رہے کہ ہم صرف اوروں کی سنتے رہیں اور خود فکر نہ کریں - ہم اندلس کے افسانوں کو رو رہے ہیں۔ چند دنوں کے بعد اگر ہم نے کروٹ نہ لی تو ہندوستان

خود اندلس بننے والا ہے۔ ہمارے سر برآوردہ غیر ملکی بھائی ہمدردی وغیرہ وغیرہ کا وصول کرنا اپنا پیدائشی حق تصور کرتے ہیں۔ اگر اخوت اسلامی یہی ہے تو دو طرفین میں برابر ہونی چاہیے۔

جو انسان اپنی فوری ضروریات کو پس پشت ڈالتے ہوئے، زیادہ طاقت ور اور مطلب پسند بھائی کی مدد کرتا ہے، وہ بڑا کم فہم ہے۔ آج ہمیں ہر طرح کی ترقی اور سیاسی وقار کی ضرورت ہے، ہندوستان کی منزلت بیرونی اسلام میں اظہار ہمدردی سے نہیں بڑھ سکتی، بلکہ ان دو باتوں کے وجود سے۔ پہلے ان کو پیدا کرو اپنی حالت درست کرو، بعدہٗ اس ثواب اور سعادتمندی کے خواہشمند ہو۔

معلومات

(از مولوی محمد حسین صاحب حسان ندوی)

دنیا کا سب سے بڑا گرجا روما (اٹلی) میں ہے جس میں ۵۰۰۰۰ ہزار آدمیوں کی گنجایش ہے
اس کے بعد میلان کا جس میں ۳۷۰۰۰ آدمیوں کی مار پولس (روما) کا جسمیں ۳۲۰۰۰ آدمیوں کی
کاندراسہ کولونا کا جس میں ۳۰۰۰۰ آدمیوں کی لندن کا جس میں ۲۵ ہزار آدمیوں کی
پترو نیوس (بولونیا) کا جس میں ۲۵ ہزار آدمیوں کی، قدیسہ (ایا صوفیہ آستانہ یہ گرجا
سنہ ۱۴۵۳ء میں مسجد بنا دیا گیا) کا جس میں ۲۳ ہزار آدمیوں کی مار یوحنا اللاترانی کا جس میں
۲۳ ہزار آدمیوں کی . پیرس کا جس میں (بغیر کرسیوں کے) ۲۱ ہزار آدمیوں کی نیو یارک کا
جس میں ۱۷ ہزار آدمیوں کی کاندرائیہ (بیزا) کا جسمیں ۱۳ ہزار آدمیوں کی، کاندرائیہ مار
انتفانویس کا جس میں ۱۲ ہزار آدمیوں کی اور القدیس مرقس (بندقیہ) کا جس میں ۷ ہزار آدمیوں
کی گنجایش ہے۔

(قدیم) رومیوں کے ایکٹر

(زمانہ قدیم میں) رومیوں کے ممثل (ایکٹر) گرانقدر اور حیرت انگیز معاوضہ پاتے تھے
اغسطس کے عہد میں مشہور ترین ایکٹر روسیوس تھا جس کی سالانہ آمدنی ۶ لاکھ درہم تھی
اس زمانہ کا درہم اس وقت کے ۱/۲ طلائی فرنک کے مساوی تھا، ساتھ ہی اس زمانہ کی
اسباب معیشت کی گرانی اور اس زمانہ کی ارزانی کو بھی نہ بھولنا چاہیے۔
مشہور رقاصہ دیونیسیا سال میں دو لاکھ درہم کماتی تھی، اور پھر یہ کہ آجکل کی طرح ریشمی

موزوں قیمتی کپڑوں پر کدار لباس غرضکہ تزئین و آرایش کے سامان میں اُسے پانی کیطرح روپیہ نہیں بہانا پڑتا تھا۔

مشہور رقاصہ اربوسکولا (جو مرنے اپنے تصاویر میں اسکا ذکر کیا ہے) کی آمدنی کی مقدار نہیں معلوم ہوسکی ہاں ایک ایکٹرکی دولتمندی کا حال معلوم ہوا کہ اپنے مرنے کے بعد جو اس نے جو ورثہ چھوڑا تقسیم کے بعد ہر وارث کے حصہ میں ۲۰ ملیون درہم آئے۔

ہارون رشید کا شطرنج

"رادسمہ" کے عجائب خانہ پیرس میں ہاتھی دانت کی ایک خوبصورت اور شاندار بساط ہے جس میں شطرنج کے تمام مہرے موجود ہیں ان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ خلیفہ ہارون رشید نے زمانہ خلافت میں شارلمان شاہ فرانس کو تحفہ بھیجا تھا ان دونوں بادشاہوں میں اسی طرح تحائف کا سلسلہ جاری تھا، غالب گمان یہ ہے کہ ہارون اسپین کی دولت امویہ کے خوف سے شاہ فرانس کی دوستی کا خواہشمند تھا وہ خطرہ کے احتمال اور اموین کے مغرب سے مشرق کی جانب خروج کے خوف سے شاہ فرانس پر اعتماد کرنے کا آرزومند تھا جس وقت یہ "تحفہ" بھیجا گیا ہے اس وقت کا یہ مشہور واقعہ ہے۔

کچھ بعید نہیں کہ اس ہدیہ کے علاوہ اور بھی تحائف انہی اغراض و مصالح کی بناء پر بھیجے گئے ہوں گے، لیکن تعجب انگیز امر یہ ہے کہ شاہ فرانس کی طرح شاہ قسطنطنیہ سے اُسکے تعلقات خوشگوار نہیں شطرنج کی بساط اور مہرے سب کے سب ہاتھی دانت کے بنے ہوئے ہیں۔

بعض لوگوں نے اس "تحفہ" نیز اس امر میں کہ وہ ہارون رشید کے حکم سے بغداد سے بھیجا گیا ہے شک و شبہ کی نظر سے دیکھا ہے لیکن علمائے مفتشین نے اُسکے

نقش ونگار اور طرز صنعت سے متعلق جو تفتیش اور بحث و تمحیص کی ہے اُس سے یہ امر پایۂ ثبوت کو پہونچ گیا ہے کہ آٹھویں صدی کے آخر میں ہندوستان میں ایک مسلمان کے ہاتھ کے بنے ہوئے ہیں جس کا نام شطرنج کے ایک مہرے پر کندہ ہے "من عمل یوسف" اس کے علاوہ کچھ اور الفاظ ہیں جن کا مطلب سمجھ میں نہیں آیا - ہارون رشید کا انتقال ۸۰۹ء میں ہوا ہے اور جس بات سے اُن کے ہندی ساخت کا اندازہ لگایا گیا ہے یہ ہے کہ شطرنج کے شہسوار اور دیگر اشخاص اس وقت کے ہندی طرز پر بنے ہوئے ہیں مسلمانوں نے ساتویں صدی سے ہندوستان پر فتح کرنا شروع کر دیا تھا۔ ہارون کے زمانہ خلافت میں مسلمانوں کی کافی تعداد ہندوستان میں رہتی تھی۔ بہرحال مہروں کی ساخت سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا بنانے والا ہندوستانی ہے یا عرب کہ جس نے ہندی طرز پر یہ مہرے بنائے ہیں لیکن پہلا خیال زیادہ قابل ترجیح معلوم ہوتا ہے۔

ان کے آٹھویں صدی میں مصنوع ہونے پر جو چیز دلالت کرتی ہے یہ ہے کہ شہسوارں کی گھوڑوں پر رکابیں بھی ہیں اور رکابوں کی ایجاد ساتویں صدی میں چین میں ہوئی جو اس وقت تک دنیا کی تمام قومیں بغیر رکاب کے گھوڑے پر سوار ہوتی تھیں اسی امر نے زنیوفون یونانی کو شہسواری کا تنفیس پر آمادہ کیا۔ کیونکہ شہسوار گھوڑے پر سنبھل نہیں سکتا تھا، اور یہ بات غیر معقول نہیں ہے کہ ساتویں صدی میں چین میں یہ "ایجاد" ہوئی ہو اور آٹھویں صدی میں ہندوستان و فارس پہونچ گئی ہو۔ لیکن یورپ اس وقت تک اس سے ناواقف تھا جس وقت ہارون رشید کا یہ تحفہ شارلمان کے پاس پہونچا لوگوں نے شطرنج کے مہروں کو غور سے دیکھنا شروع کیا، اُنھوں نے دیکھا کہ شہسوار رکابوں پر قایم ہیں بس اُس وقت سے اُنھوں نے اپنے یہاں بھی کاٹھیوں میں رکابوں

کورواج دیدیا، جب ہی سے گھوڑے کی سواری عام ہوگئی، اور شہسواری شریفوں کی خصوصیت سمجھی جانے لگی انتہا یہ کہ فرانسیسی زبان میں عام طور پر شریف آدمی کو فارس[1] ہی کہا جانے لگا۔ یورپ میں قرن متوسط (تقریباً ساتویں آٹھویں نویں صدی عیسوی) شہسواری کا زمانہ ہے جس کا سبب بڑی حد تک ہارون رشید کا تحفہ ہے جس سے یورپ گھوڑے کی رکاب سے واقف ہوا۔

جسم کی حرکت

آجکل سواریوں کی اس قدر کثرت ہوگئی ہے اور ان کا استعمال اس قدر عام ہوگیا ہے کہ ہر کس و ناکس پیدل چلنے کی تکلیف گوارا کرنے کے بجائے سواری کو ترجیح دیتا ہے یہ سواریاں آرام رساں سہی لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ لوگوں کو پیدل چلنے کی ورزش سے محروم کردیا ہے،

اسی لئے ڈاکٹر کارنو لوگوں کو نصیحت کرتا ہے کہ روز کم از کم تین میل پیدل چلنا چاہیے کہ تمام اعضا میں ایک حرکت پیدا ہو جائے، اور عیش و آرام کی جس کے ہم عادی ہوگئے ہیں عادت چھوٹ جائے۔

لیکن پھر بھی ہر شخص کے لئے اپنے مخصوص حالات کا لحاظ ضروری ہے، کیونکہ بعض لوگ، دفاتر میں کھڑے کھڑے کام کرتے ہیں یا اپنی دوکانوں پر آتے جاتے رہتے ہیں اس طرح وہ ایک محنتی کاشتکار سے زیادہ چل پھر لیتے ہیں،

بعض لوگ اونچے مکانات کی سیڑھیوں پر چڑھتے ہیں لیکن حرکت کی وجہ سے ان کے دل کو ایک کلومیٹر چلنے کی بہ نسبت زیادہ تکلیف ہوتی ہے۔

---

[1] فارس یعنی شہسوار۔

جب چہل قدمی کا ارادہ ہو تو نہایت زور و قوت کے ساتھ چلنا چاہیئے۔ آہستہ آہستہ چلنے میں بہت کم فائدہ ہے۔

پانی اور صحت

صحت کی سب سے بڑی دلیل فطرتی تشنگی پر پانی پینا ہے لیکن تشنگی بہت کم ہوتی ہے۔ کیونکہ ہم نمک مرچ بہت زیادہ مقدار میں کھاتے ہیں جس سے غیر فطرتی تشنگی پیدا ہو جاتی ہے علاوہ بریں شہروں کی تصنع سے بسر زندگی کوٹھریوں میں بند اور تمام جسم لباس سے ڈھکا رہنا۔ یہ دونوں غیر فطرتی ہیں۔

اکثر لوگ معدہ کے مرض میں مبتلا ہو جاتے ہیں اسلئے اُن کو پانی کم پینے اور غذا اچھی طرح چبانے کی ضرورت ہوتی ہے بسا اوقات کھانا بغیر چبائے کھانے سے حلق میں سوزش ہوتی ہے جس سے تشنگی پیدا ہو جاتی ہے اور بہت زیادہ پانی پینا پڑتا ہے،

بلاشبہ پانی بالکل غیر مضر ہے خواہ کتنا زیادہ پیا جائے بشرطیکہ معدہ درست ہو اور پیاس مرچ زیادہ نہ کھانے یا کھانا چبا کر نہ کھانے سے پیدا نہ ہوئی ہو۔

پانی پینے کا بہترین وقت یہ ہے کہ کھانے سے تین چار گھنٹہ بعد پیا جائے اور کھاتے وقت بہت کم پیا جائے۔

ڈاکٹر کاروتھ ویلس نے اپنی عمر کا کچھ حصہ جزیرہ نما ملایا میں گذارا ہے۔ انکا دعویٰ ہے اور دعوے کی تائید میں ثبوت ہے کہ ملایا میں قدرت نے بعض موقع پر اپنے مقررہ اصول سے مخالفت کر دی ہے۔ مثلاً اگر ایک درخت پر ایک قسم کی چڑیاں گھونسلے بنا رہی ہیں تو دوسرے درخت پر اُسی قسم کی چڑیوں کے پر گرنے کا زمانہ ہوتا ہے۔ آپ کے باغ میں

ایک درخت میں پھل موجود ہیں تو اسی قسم کے دوسرے درخت میں پھول آنے کا زمانہ شروع ہو رہا ہے۔ وہاں ایک چڑیا ہے جو پیٹھ کے بل سوتی ہے۔ ایک اور قسم کی چڑیا ہے جس کی مادہ کا قد نر سے بڑا ہوتا ہے، مادہ چڑیا انڈے دیتی ہے مگر نر انڈوں پر بیٹھتا ہے۔ اور اس زمانہ میں جتنی لڑائیاں ہوتی ہیں مادہ لڑتی پھرتی ہے جنگلوں میں اب تک تیندوے شیر۔ ہاتھی، گینڈے اور تیس تیس فیٹ کے لانبے سانپ موجود ہیں۔ وہاں ایک مچھلی بھی ہے جو درختوں پر بسیرا لیتی ہے۔ اور گرمی میں درختوں سے اتر کر پانی میں غوطے لیتی ہے۔ کیکڑے ناریل کھاتے ہیں۔ مچھلیوں کی غذا مرجان ہے اور چوہے اونچے درختوں پر رہتے ہیں۔

عودِ شباب کے متعلق کچھ عرصہ سے یورپ میں مختلف اقسام کے امتحانات ہو رہے ہیں اور کئی مشہور ڈاکٹروں نے متعدد نسخے تیار کئے ہیں۔ انسانی غاغود کو علیحدہ کر کے اسکے بجائے زندہ بندر کے غاغود لگانے سے خاطر خواہ کامیابی ہوئی تھی اور ۷۰، ۸۰ برس کے بوڑھے اپنی عادات اور خصائل میں ۲۰-۲۵ برس کی عمر کے آدمی بن گئے تھے مگر اس طریقہ میں دو خرابیاں ہیں اول تو بندروں کی فراہمی۔ پھر ان پر عمل جراحی طول عمل ہے غاغود نکال لینے کے بعد بندر سست ہو جاتا ہے اور اس کی عمر طبیعی بھی کم ہو جاتی ہے۔ دوسرے یہ کہ خود انسان پر عمل جراحی کی ضرورت ہوتی ہے جو کافی طور پر تکلیف دہ ہے۔ اور خرچ طلب ہے۔

حال میں ویئنا کے ایک ڈاکٹر نے اس مسئلہ کو اس طرح پر حل کیا ہے کہ اگر کاربولک ایسڈ

لے غالباً پودا جو ہندوستان اور بالخصوص اس صوبہ میں اکثر پایا جاتا ہے۔

کا ہلکا پانی بوڑھے آدمی کی شریان میں پہونچا دیا جائے تو وہ جوان العمر ہو جائیگا - جن لوگوں پر یہ عمل کیا گیا ہے ان میں حیرت انگیز تغیرات نمودار ہو گئے ہیں - بوڑھے جانوروں تک کو فائدہ ہوا ہے - ترکیب استعمال بہت آسان ہے - اور ایک معمولی ڈاکٹر بھی جسم میں ایسڈ پہونچا سکتا ہے!

بہ نسبت ۱۹۲۴ء کے ۱۹۲۵ء میں انگلستان نے ۴۹۰ کتابیں زاید شائع کی ہیں -

۱۹۲۵ء میں ۱۳۲۰۲ - ۱۹۲۴ء میں ۱۲۷۰۶ - ۱۹۲۳ء میں ۱۲۲۷۴ - ۱۹۲۲ء میں ۱۰۸۴۲ کتابیں علی الترتیب چھپی ہیں - افسانوں کی اشاعت بہترین رہی اور انکی تعداد ۲۷۶۹ ہے لیکن انکی فروخت کم ہوئی - ۱۹۲۴ء اور ۱۹۲۵ء میں جن موضوعات پر زیادہ تر کتابیں فروخت ہوئی ہیں انکی فہرست ترتیب وار (بلحاظ کثرت اشاعت) ذیل میں درج ہے جس سے انگلستان کے باشندوں کے مذاق علمی کے تغیر کا اندازہ ہوگا۔

۱۹۲۴ء	۱۹۲۵ء
(۱) افسانہ	(۱) افسانہ
(۲) مذہب	(۲) بچوں کی کتابیں
(۳) سائنس	(۳) مذہب
(۴) معاشرت	(۴) معاشرت
(۵) ہنر اور پیشہ	(۵) شاعری
(۶) شاعری	(۶) سوانحعمری
(۷) بچوں کی کتابیں	(۷) سائنس
(۸) واقعات	(۸) ہنر اور پیشہ
(۹) ادب	(۹) واقعات
(۱۰) تاریخ اور طب	(۱۰) ادب
(۱۱) سوانحعمری	(۱۱) تاریخ
(۱۲) افواج بحری اور بری	(۱۲) طب وغیرہ

تبصرے

"نشاطِ روح"

مجموعہ کلام جناب اصغر حسین صاحب۔ اصغر (گونڈہ)

مرتبہ :۔ جناب مرزا احسان احمد صاحب بی۔اے۔ ال ال۔ بی۔ علیگ۔ وکیل اعظم گڈھ۔

جناب اصغر کا کلام اپنی خوبیوں کے اعتبار سے اہل نظر کو جس حد تک مرغوب ہے اس کے اظہار کی چنداں ضرورت نہیں۔ لیکن یہ مجموعہ "تشنہ" رہجاتا اگر اسکی ترتیب مرزا صاحب کے ہاتھوں میں نہ ہوتی اور جناب سہیل اسپر مقدمہ نہ لکھتے۔

دورِ موجودہ کے غزل گو شعرا میں جناب اصغر نہایت کامیاب ہیں لیکن افسوس ہی کہ آپکا کلام وہ شہرت نہ پا سکا جس کا وہ مستحق ہے۔ اس کی وجہ خود شاعر کی خاموش زندگی اور نام و نمود سے نفرت ہے۔

نشاط روح چھوٹی تقطیع کے ۲۰۴ صفحوں کو محیط ہے لیکن شاعری کا پاکیزہ نمونہ ہے۔ جناب مرزا صاحب کا دیباچہ اونیتس ۲۹ صفحہ کا ہے اور پڑھنے کے قابل ہے۔ مقدمہ ۸۰ صفحات کا ہے۔ نفس شاعری پر جناب سہیل نے تحقیق سے لکھا ہے۔ اور جناب اصغر کی شاعری کی خوبیاں دکھائی ہیں۔

چونکہ مقدمہ لکھنے والے اور نقاد میں فرق ہوتا ہے اس لحاظ سے مقدمہ صرف شاعر کی خوبیوں تک محدود ہے۔ خود جناب مرزا صاحب نے صاف الفاظ میں تسلیم کرلیا ہے کہ

"میرا یہ دعویٰ نہیں کہ حضرت اصغر کا کلام فروگذاشتوں سے بالکل منزہ ہے، تاہم اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اُن کی لطافت آفرینیوں نے تغزل کے انداز قدیم میں رقص و سرود کا ایک نیا عالم پیدا کر دیا ہے جو اب تک نگاہوں سے مخفی تھا!"

مولوی اقبال احمد صاحب سہیل کے مقدمہ کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کو پڑھنے کے بعد معمولی لیاقت کا آدمی بھی کلام اصغر کی پاکیزگی سے واقف ہو جائیگا، مشکل مقامات کو جناب سہیل اور مرزا صاحب نے لطیف اشاروں سے صاف کر دیا ہے۔

لکھائی چھپائی پاکیزہ ہے۔ اور شروع میں حضرت اصغر کی تصویر بھی ہے قیمت عہ، اور عہ کے درمیان ہے۔ اور حضرت اصغر گونڈہ کے پتہ پر یا جناب مرزا احسان احمد صاحب وکیل سے اعظم گڈھ کے پتہ پر مل سکتی ہے۔

چند اشعار مقدمہ و دیباچہ سے نقل کئے جاتے ہیں۔

غزل کیا اک شرار معنوی گردش میں ہے اصغر　　یہاں افسوس گنجائش نہیں فریاد و ماتم کی

اللہ رے دیوانگیٔ شوق کا عالم　　اک رقص میں ہر ذرّہ صحرا نظر آیا
تھا لطف جنوں دیدۂ خونناب فشاں سے　　پھولوں سے بھرا دامن صحرا نظر آیا

سو بار جلا ہے تو یہ سو بار بنا ہے　　ہم سوختہ جانوں کا نشیمن بھی بلا ہے

سو بار ترا دامن ہاتھوں میں مرے آیا　　جب آنکھ کھلی دیکھا اپنا ہی گریباں ہے

قفس سے کس طرح صیاد لایا دیکھ لو جا کر — پڑے ہونگے ابھی کچھ بال و پر میرے نشیمن میں

رخ رنگیں پہ موجیں ہیں تبسم ہائے پنہاں کی — شعاعیں کیا پڑیں نکہت نکھر آئی گلستاں کی

روداد چمن سنتا ہوں اس طرح قفس میں — جیسے کبھی آنکھوں سے گلستاں نہیں دیکھا

تھیں نگاہ شوق کی رنگینیاں چھائی ہوئی — پردہ محمل اٹھا تو صاحب محمل نہ تھا

پھر گرم نوازش ہے ضو مہر درخشاں کی — پھر قطرۂ شبنم میں ہنگامۂ طوفاں ہے

ایسا بھی ایک جلوہ تھا اس میں چھپا ہوا — اس رخ پہ دیکھتا ہوں میں اپنی نظر کو میں

جو نقش ہے ہستی کا دھوکا نظر آتا ہے — پردہ پہ مصور ہی تنہا نظر آتا ہے
لو شمع حقیقت کی اپنی ہی جگہ پر ہے — فانوس کی گردش میں کیا کیا نظر آتا ہے
اے پردہ نشیں ضد کیا ہے شمع تمنا کو — تو دفتر گل میں بھی رسوا نظر آتا ہے

نہ ہوگا مستیٔ بے مدعا کا راز داں برسوں
وہ زاہد جو رہا سرگشتۂ سود و زیاں برسوں

کیا فیض بخشیاں ہیں رخِ بے نقاب کی ذروں میں روح دوڑ گئی آفتاب کی

سرگرم تجلی ہو اے جلوۂ جانانہ اڑ جائے دھواں بن کر کعبہ ہو کہ بتخانہ

سارا حصول عشق کی ناکامیوں میں ہے جو عمر رائیگاں ہے وہی رائیگاں نہیں

سرمستیوں میں شیشۂ مے لے کے ہاتھ میں اتنا اچھال دیں کہ ثریا کہیں جسے

کچھ اس انداز سے چھیڑا تھا میں نے نغمۂ رنگیں
کہ فرطِ شوق سے جھومی ہے شاخِ آشیاں برسوں

تو نے یہ اعجاز کیا اے سوز پنہاں کر دیا اس طرح پھونکا کہ آخر جسم کو جاں کر دیا

اک شعلہ اور شمع سے بڑھ کر ہے رقص میں تم پھاڑ کر تو سینۂ پروانہ دیکھتے

انداز ہیں جذب اسمیں سب شمع شبستاں کے اک حسن کی دنیا ہے خاکستر پروانہ

غرض کیا بلحاظ ندرت مضامین اور کیا بلحاظ انداز بیان حضرت اصغر کی شاعری وجدانی ہے۔ اور "روح نشاط" ضرور اس قابل ہے کہ ہر صاحب ذوق کے پاس موجود ہو۔

اے وقت تو خوش باد کہ وقت ما خوش کردی

"شمع شبستاں"

جناب محمد دین صاحب تاثیر ایم۔ اے نے دور موجودہ کے افسانہ نگار حضرات کے بعض افسانے کتاب کی صورت میں جمع کر دیے ہیں اور جہانگیر بک کلب۔ چابک سواران لاہور نے شائع کیا ہے۔ جناب تاثیر ایک ہونہار نوجوان ہیں۔ ان کا مذاق صحیح ہے باستثنار ایک دو افسانوں کے جو غیر معروف اشخاص کے قلم سے نکلے ہیں کل انتخاب دل آویز ہے۔ خود تاثیر صاحب نے جو کچھ لکھا ہے بہت پاکیزہ ہے۔

یہ افسانے مختلف رسالوں میں چھپے تھے۔ خدا جزائے خیر دے حضرت تاثیر کو ان کی توجہ سے یکجا ہو گئے۔ ہم سفارش کرتے ہیں کہ ادب اردو کے شائقین اس مجموعہ کو ضرور خریدیں ہمارے علم میں اس سے بہتر مجموعہ اس وقت اردو میں موجود نہیں۔ تقطیع بڑی ہے قیمت صہ، یا عیہ ہے جو کچھ بھی نہیں ہے۔ ملنے کا پتہ :- جہانگیر بک کلب۔ چابک سواران۔ لاہور۔

"گوہر تن نامہ"

یہ کتاب اگر شائع نہ ہوتی تو ایک افسوس ناک کمی رہ جاتی۔ کیونکہ حضرت مصنف کی بے نیاز ذات سے بہت کم امید تھی کہ وہ اپنے مسودات کو ترتیب دیکر شائع کر سکیں گے۔ مولوی محمد احسن اللہ خاں صاحب ثاقب۔ اکبر آبادی وکٹوریہ کالج گوالیار میں عربی و فارسی کے پروفیسر ہیں۔ اس مجموعہ میں اُن کی عربی فارسی اور اردو نظم و نثر ہے۔ فارسی

میں آپ کو خاص شہرت حاصل ہے۔ چونکہ شمع کا تعلق زیادہ تر اُردو سے ہے اس لئے ہم صرف اُن کی اُردو نظم پر تبصرہ کریں گے۔ حضرت محسن کاکوروی مرحوم و مغفور نے آپ کو جو نصیحت فرمائی تھی وہ بھی ہمارے پیش نظر ہے۔

"آخر کو یہ نصیحت ہے کہ تم زیادہ تر شاعری عربی و فارسی میں مصروف نہ رہو۔ اگر خاقانی اور سعدی ہوئے تو اس زمانہ میں قدرداں کون ہے .... آپ ہی لکھو اور آپ ہی پڑھو اور آپ ہی خوش رہو"

"قند پارسی" فارسی زبان میں ایک رسالہ تھا جو آپ نے علی گڈھ سے شائع فرمایا تھا اس کی تعریفیں ایران سے آتی تھیں۔ اردو کی طرف آپ نے بہت کم توجہ فرمائی پھر بھی جو کچھ لکھا ہے خوب ہے۔ آپ کا دعویٰ شاعرانہ تعلی نہیں ہے:-

میر کا رنگ ہے غالب کی نوا
گل بہ داماں ہے طبیعت میری

کچھ اقتباس ہدیہ ناظرین ہے۔

پھر کسی در پہ جبہ سائی کی   دل نے پھر ہم سے بے وفائی کی

کچھ نہ پوچھو مجھ سے میرے دل کی کیا حالت ہوئی   کیا کہوں تم سے کہ تم کو دیکھ کر کیا ہو گیا
طعنۂ اغیار، تشنیع عزیزاں، رنج ہجر   ایک لگ جانے سے دل کے سب گوارا ہو گیا

فراغ خاطر دل خستگاں نہیں معلوم   نہیں نہیں تجھے اے آسماں نہیں معلوم
نگاہ یار میں شوخی ہے آج حد سے سوا   گرے گی کس پہ یہ برق تپاں نہیں معلوم

نہ ہنس تو رونے پہ میرے کہ ای جفا پرور ہنوز مجھ کو طریقِ فغاں نہیں معلوم
فلک بتا کہ زمانہ کو تو نے دیکھا ہے ہمیں تو ایک بھی دل شادماں نہیں معلوم
ہزار جان گرامی فدائے شوخیٔ یار کہ ہر کہیں ہے پر اس کا نشاں نہیں معلوم
رواں ہے قافلۂ غفلت کا راہ ہی باریک کہاں تمام ہو عمرِ رواں نہیں معلوم
نہ نقشِ پائے عزیزاں نہ بانگ کوسِ رحیل یہ کب کدھر کو گیا کارواں نہیں معلوم

الٰہی کیا بلا ہے جی لگانا میں نہ سمجھا تھا قیامت کا ہے آنا دل کا آنا میں نہ سمجھا تھا
جنوں تھا یا محبت تھی مگر تھا آہ کیا عالم نہ پاؤں گا کبھی پھر بے زمانا میں نہ سمجھا تھا
شبِ تاریک، وحشت پُر خطر، بارِ گراں سر پہ یکایک اسطرح نا وقت جانا میں نہ سمجھا تھا

تمناؤں کا ہنگامہ ہے عاشق کے دل و جاں میں
قیامت کی کشش ہے حُسنِ روز افزونِ جاناں میں

بیاباں وحشت افزا۔ نالۂ دلگیر درد آلا
عجب دُنیا لبسی ہے یاس کی شامِ غریباں میں

آخر ہو کوئی حد بھی تحمل کی اے عزیز بیتابیوں سے دل کی پریشان ہو گیا

دل کے ارمان نگاہوں میں نکل جاتے تھے وقت وہ کیا تھا! وہ دن کیا تھے، زمانہ کیا تھا

ہائے وہ عالمِ تصویر کہاں   اب تصور ہے اک حیرت میری
کیا جلائے گا جہنم مجھ کو   آپ دوزخ ہے ندامت میری

آوارہ وطن کا دیارِ غریب میں   کوئی اگر نہیں ہے۔ تو بیکسی تو ہے
گو دشت فتنہ خیز ہے گو چرخ حیلہ جو   خضرِ رہِ مراد مری بے خودی تو ہے

فخر الدولہ نواب علاء الدین احمد خاں صاحب مرحوم والیٔ لوہارو کے خط کا یہ حصہ اس زبان میں ہے اور ان دلوں کا ترجمان ہے جن کو اب آنکھیں ڈھونڈتی ہیں۔

"بھیا تمہاری منت کے سپاس میں میری زبان صرف اب صرفِ سپاس کیا ہو۔ تم نے میری فریاد سنی اور بابائے فغانی کا کلام پیدا کیا۔ لیکن نقل کے نام سے ڈر گیا ہوں۔ منقول عنہ نسخ کاتب سے کیا بچا ہوگا کہ اس منقول کی نسبت فکر کروں۔ خدا اس کو کسی کے مینہ سے بچائے، مول کیوں نہ لو، مالک ورق عزیز کیوں کریگا، خدا کرے جس طرح میں نے اپنے کو بیچ دیا تمہارے لطفِ معنوی کے ہاتھ وہ دو چار روپئے لے کے کتاب دے دے.......اب میں اپنی طبیعت کی جفا سے گھبرایا۔ اس کو دعا پر ختم کرتا ہوں ؎

عمرت دراز باد کہ تا دورِ مشتری
ما از تو برخوریم تو از عمر برخوری"

فارسی کا حصہ بھی دلچسپ ہے اور دیکھنے کے قابل ہے۔ سرورق کے بعد حضرت موصوف کے پدر بزرگوار مولوی نصر اللہ خاں صاحب مرحوم سب جج کی تصویر ہے اور بعد کو خود حضرت مصنف کی تصویر ہے۔

ضخامت ۲۱۴ صفحات - لکھائی چھپائی اچھی ہے - قیمت عہ - ملنے کا پتہ :- انوار المطابع لکھنؤ -

"نورجہاں"

مختصر کتاب ہے جو باوجود اپنے اختصار کے لکھائی چھپائی میں ممتاز ہے - اس کے مؤلف ہمارے دوست مسٹر احمد کاظمی بی - اے (آنرز) مسلم یونیورسٹی ہیں - اس کا ابتدائی حصہ (عرصہ ہوا) ہمارے پاس بغرض اشاعت آیا تھا لیکن مکمل نہ ہونے کی بنا پر شایع نہیں ہوا - اب لایق مؤلف نے متعدد معتبر کتابوں کی مدد سے مکمل کرکے علیحدہ شائع کرایا ہے - زبان صاف اور ستھری ہے - نورجہاں (ملکہ جہانگیر) کے دادا کا حال اردو زبان میں نئی چیز ہے - اسی طرح آصف جاہ (نورجہاں کے باپ) اور آپ کے بیٹوں کے حالات جس تفصیل سے دیئے گئے ہیں غالباً اردو میں پہلے نہیں لکھے گئے - اردو میں نورجہاں کے سیاسی اور معاشرتی حالات بہت کم ہیں - ہمارے دوست نے ان کو ترقی دی ہے اور بیان کا طریقہ بھی دل آویز اختیار کیا ہے - جو عام طور پسند کیا جائیگا - تاریخی حیثیت سے غالباً لایق مؤلف بھی تسلیم کریں گے کہ نورجہاں کے متعلق ابھی تحقیق اور تنقید کی بہت گنجائش ہے - لیکن اس کے واسطے مدت العمر کی ضرورت ہے - قیمت عہ / احسن المطابع لکھنؤ سے مل سکتا ہے یقین ہے مقبول ہوگا -

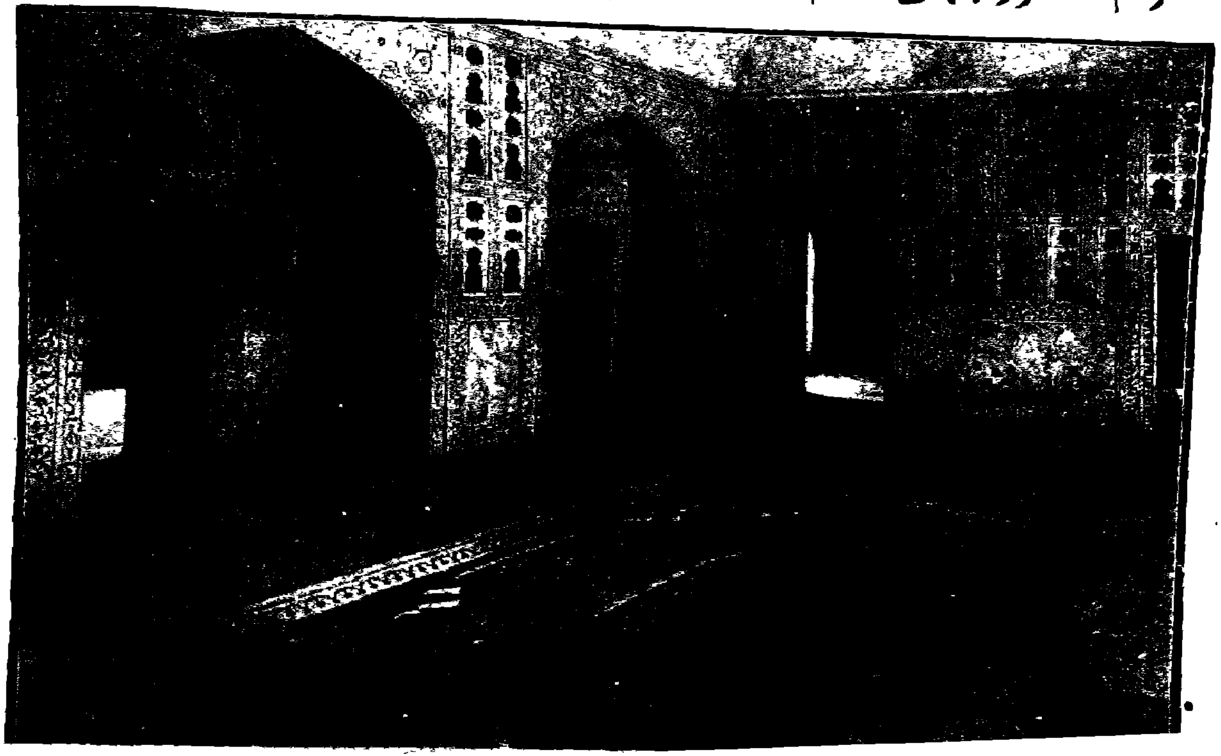
(بوجہ علالت شمع کے کاتب کے دوسرے کاتب سے رسالہ ماہ جنوری تحریر کروایا گیا تھا قارئین کرام معاف فرمائیں اور ان غلطیوں کی صحت فرمالیں)

غلطنامہ بابت رسالہ شمع جنوری ۱۹۲۶ء

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۵	۱۳	دروازوں	دروازوں کی	۴۳	۱۹	ابولبنی	ابوالبنی
۹	۷	پر	پایا	۴۶	۳	خلیکے	خیلکے
	۸	واتفیت	واقفیت	۶۳	۵	بیساختہ	ساختہ
	۱۱	پر	پر با	۶۶	۶	یا	×
	۱۲	حضیا	ضیا	۷۱	۱	یا	×
۱۰	۷	واقفت	واقفیت		۱۷	نہ کے	نہ کہ
۱۱	۱۰	پڑا	پڑا کر	۷۳	۹	عمارت	عبادت
۱۳	۵	سے	سے کہ	۷۵	۱۱	عزمین	غزنین
	۹	رائفلز کا	رائفلز کے	۷۶	۸	ایک روز	یک روزہ
	۱۸	کے	کے علاوہ		۱۹	کو	×
۱۶	۱۴	ملک	ملک کو	۷۷	۹	احوال	اصول
۱۷	۳	قانون	قانونی	۷۸	۱۰	ساٹھ برس سے زیادہ پہلے	کچھ اوپر ساٹھ برس قبل
	۵	عوام	عوام کی		۱۷	برتر	بدتر
	۱۱	جذام	جذام اور		۱۸	رو	دو
	۱۳	دعوی	لیکن دعوی		۴	العنانی	العنان
	۱۴	بھی	×		۵	السان	العنان
	۷	بہیر بہ	بہیر		۱۸	تجل	جمیل
	۱۰	کرد	برد	۸۰	۲	بزم	بزم میں
	۲۰	الشمغام	التغا	۸۹	۵	ان نظر	ان کی نظر
	۱۲	سخطا	سخط		۷	مرنجا	مرنجان
[illegible]	۱۴	کھیات	کھمبات		۹	جوذ	خود
[illegible]	۱۴	بجز	بجبر	۹۱	۱	فرمان	فرما
[illegible]	۱۲	ازدادہ	زردادہ		۱۳	قید	فیہ

(صفحہ ۱۱۲ سطر ۱۲ [illegible])

آرام‌گاہ نورجہاں بیگم   سمن برج   قلعہ آگرہ   (اندرونی حصہ)



جلد ۲	فہرست مضامین رسالہ شمع بابت ماہ مارچ ۱۹۲۶ء	نمبر ۳

تصویریں: ثمن برج (۱) اندرونی حصہ (۲) بیرونی حصہ واقع قلعہ آگرہ

اطلاع

۱۔ پہلے بھی عرض کیا جاچکا ہے اور اب دوبارہ عرض ہے کہ حضرات مضامین نگار اپنے مضامین کو صاف لکھ کر بھیجا کریں۔ معمولی استعداد کے کاتبوں سے یہ توقع عبث ہے کہ وہ غیر صاف شدہ علمی و تاریخی مضامین کو صحیح لکھ سکیں گے۔ مدیران رسالہ کیلئے ناممکن ہے کہ وہ ہر مضمون کو دوبارہ صاف کر دیں۔ حضرات مضامین نگار اسطرف ضرور توجہ فرمائیں عبارت گنجان نہ ہو اور کاغذ پر ایک ہی جانب لکھا جائے۔ اگر اس قاعدہ کی پابندی نہ کی گئی تو مضامین کی عدم اشاعت سے ہم بری الذمہ ہیں۔

۲۔ افسوس ہے کہ آگرہ میں پلیگ کے نمودار ہوجانیکی وجہ سے فروری اور مارچ کے پرچے دیر سے شائع ہوئے۔ ہم کو دلی افسوس ہے۔ لیکن اس قدرتی حادثہ پر قابو پالینا ہمارے امکان سے باہر تھا۔

۳۔ شمع میں جو تصاویر شائع ہوتی ہیں وہ قیمتاً بھی مل سکتی ہیں۔ رنگین تصاویر کی قیمت ۴ اور سادہ تصاویر کی قیمت ۲ روپے ہے۔

۴۔ اگر کوئی صاحب اپنے مضمون کے ساتھ تصاویر شائع کرانا چاہیں تو ان کی اشاعت بھی ممکن ہے بشرطیکہ مضمون اور تصاویر عمدہ ہوں۔ منتظمان شمع اس معاملہ میں اخراجات کا مطلق خیال نہیں کرتے ہیں۔

منیجر شمع

رسالہ

شمع

بابتہ ماہ مارچ سنہ ۱۹۲۶ء

بابر کا وصیت نامہ

از

جناب خانصاحب مولوی ظفر حسن صاحب ایم-اے (علیگ)
(سپرنٹنڈنٹ محکمہ آثار قدیمہ)

کچھ عرصہ ہوا کہ عاصی کو بتقریب دورہ سانچی جانیکا اتفاق ہوا اور وہاں سے حمیدیہ لائبریری دیکھنے کی غرض سے بھوپال حاضر ہوا- لائبریری مذکور معلیٰ القاب جناب بیگم صاحبہ بھوپال مد ظلہا العالیہ کے فرزند ولیعہد جناب نوابزادہ حاجی حمید اللہ خاں صاحب بالقابہ کے نام نامی واسم گرامی سے موسوم ہے- اور انھیں کی قائم

کردہ ہے اس کی وسیع و دلفریب عمارت نفاست اور حسن انتظام ممدوح کے علمی ذوق و بلند حوصلہ پر دلالت کرتے ہیں۔ اور قابل تحسین و مبارکباد ہیں۔ موصوف کا یہ کارِ خیر اور علمی خدمت دیگر والیان ملک و روساء ہند کے لئے قابل تقلید ہے۔

لائبریری مذکور میں علاوہ کتب مطبوعہ بزبان عربی۔ فارسی۔ اردو انگریزی متعدد قلمی نسخے عربی و فارسی کتابوں کے نیز قلمی تصاویر اور نمونہ جات خوشخطی بھی ہیں۔ منجملہ اُن کے ایک وصیت نامہ شہنشاہ بابر کا ہے جو مضمون ہذا کا مبحث ہے۔ اس وصیت نامہ کو کچھ عرصہ ہوا کہ خواجہ حسن نظامی صاحب نے "بعنوان شہنشاہ بابر کا فرمان" شائع کرکے پبلک کے سامنے پیش کیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ صاحب موصوف نے اس کے متعلق کافی تحقیق و تدقیق نہیں کی۔ عاصی کی رائے ناقص میں یہ وصیت نامہ مصنوعی اور جعلی ہے۔ اور افسوس ہے کہ خواجہ صاحب موصوف نے بلا تحقیق و تصدیق اس سے استدلال کیا ہے۔ یہ بھی عرض کردوں کہ مسئلہ ترک گاؤ کشی اس مضمون میں خارج از بحث ہے۔ اور عاصی اوسکے جائز یا ناجائز ضروری یا غیر ضروری ہونیکے متعلق کچھ عرض کرنا نہیں چاہتا اور ناظرین "شمع سے" درخواست ہے کہ وہ اس کی نسبت تحریر ہذا سے کوئی نتیجہ نہ نکالیں۔ بلکہ ناچیز کی زیر بحث محض شہنشاہ بابر کا وصیت نامہ ہے اور اوس کی غرض و غایت یہ ہے کہ شائقین فن تاریخ اوس کو صحیح تصور کرکے کسی فتنہ غلط فہمی میں نہ پڑیں۔ اور اُس کے متعلق تحقیق و تفتیش کی زحمت اُٹھائیں۔

پیشتر اس کے کہ عاصی وصیت نامہ مذکور کے مصنوعی اور فرضی ہونے کے دلائل پیش کرے اُس کی مفصل کیفیت اور نقل ذیل میں درج کرتا ہے حمیدیہ لائبریری

کے دفتری کاغذات سے پتہ چلتا ہے کہ یہ وصیت نامہ نواب فوجدار محمد خاں صاحب مرحوم کے کتب خانہ سے برآمد ہوا ہے۔ مغفور نواب سکندر بیگم صاحبہ جنت مکانی کے ماموں تھے۔ اور شاہجہاں بیگم صاحبہ فردوس آشیانی کی صغرسنی میں کچھ عرصہ تک بطور اون کے ولی کے ریاست بھوپال کا انتظام اُن کے سپرد رہا۔ لیکن ۱۸۴۷ء میں بوجوہ چند در چند اس عہدہ سے مستعفی ہو گئے۔ نواب صاحب مرحوم کو کمال درجہ کا علمی ذوق تھا۔ اور حمیدیہ لائبریری میں اکثر قلمی نسخے ایسے ہیں جو آنجناب کے خرید کردہ یا نقل کرائے ہوئے ہیں۔

وصیت نامہ مذکور کشمیری کاغذ پر خط نستعلیق میں تحریر ہے۔ اُسمیں سات سطریں ہیں اور کاغذ جس کی لمبائی ۸ انچہ اور چوڑائی ۵½ انچہ ہے طلائی پھولوں سے آراستہ ہے۔ متن کے چاروں طرف طلائی حاشیہ ہے۔ صدر پر شہنشاہ بابر کی مہر ثبت ہے جس کا سن ۹۳۳ھ ہے۔ اور تاریخ تحریر وصیت نامہ یکم جمادی الاول ۹۳۵ھ ہے نقل اوس کی حسب ذیل ہے۔



وصیت نامہ مخفی ظہیر الدین محمد بابر بادشاہ غازی بشاہزادہ نصیر الدین محمد ہمایون طال اللہ عمرہ باستحکام سلطنت نوشتہ شد اے فرزند ملکت ہندوستان از مذاہب مختلفہ معمور است بحمد اللہ کہ حق سبحانہ تعالیٰ بادشاہی آن بتو کرامت فرمود باید کہ تعصبات مذہبی را از لوح دل پاک نمودہ موافق طریق ہر ملت معدلت کن خصوصاً از قربانی گاؤ

بہ پرہیزکہ تسخیر قلوب اہل ہندوستانست و رعیت ایں ولایت باحسانات بادشاہی وابستہ شود
ومنادر و معبدگاہ ہر قومیکہ زیر فرمان بادشاہ ہست خراب مکن چناں عدل گستری اختیار کن کہ
شاہ از رعیت و رعیت از پادشاہ آسودہ شود ترقی اسلام از تیغ احسان بہتر است
نہ از تیغ ظلم و از مناقشات اہلسنت و شیعہ چشم پوشی کن والا ضعف اسلام موجود است
و رعیت مختلف القلوب را بحکم اربع عناصر نظیر قایم کن کہ جسم سلطنت از امراض مختلفہ ایمن
باشد و کارنامہ حضرت امیر تیمور صاحب قرانی پیش نظر باید داشت کہ باموں شہریاری
پختہ شود۔

وماعلینا الا البلاغ یکم جمادی الاول ۹۳۵ھ

نوٹ۔ حاشیہ طلائی۔ زمین پر طلائی پھول بنے ہوئے ہیں۔

کسی قدیم قلمی نسخہ یا تحریر کے جانچنے کے لئے مختلف امور کو پیش نظر رکھنا ہوتا ہے
مثلاً (الف) کاغذ (ب) روشنائی (ج) طرز تحریر جسمیں املا بھی شامل ہو (د) رسم
تحریر (ہ) زبان (و) طرز عبارت و بیان (ز) واقعات (ح) سنین وغیرہ
امورات مذکورہ بالا کی کسوٹی پر اگر اس وصیت نامہ کو کسا جائے تو ناظرین
کو خود معلوم ہوجائیگا کہ وہ مصنوعی ہے۔ چونکہ اصل پرچہ ناظرین کے سامنے پیش کرنا
ممکن نہیں اس لئے کاغذ اور روشنائی کے متعلق بحث کرنا فضول ہے۔ طرز تحریر بھی
بغیر اصل پرچہ یا اوس کے فوٹو دیکھے نہیں معلوم ہوسکتا البتہ املا کا پتہ نقل سے بھی
اگر وہ مطابق اصل ہو تو چل سکتا ہے۔ چنانچہ ناظرین اگر ذرا غور فرمائیں گے تو انھیں
معلوم ہوجائیگا کہ مُہر و متن دونوں میں ہر بادشاہ کے نام کے ساتھ لفظ غازی بجائے
"ز" کے "ذ" سے لکھا ہوا ہے۔ مُہر کے سنہ و تاریخ تحریر وصیت نامہ میں ۲ سال کا فرق

ہے یعنی اول اللہ کرکا سنہ ۹۳۳ ہجری ہے اور تاریخ تحریر وصیت نامہ یکم جمادی الاول سنہ ۹۳۵ ہجری ہے۔ یہہ کسی طرح سمجھ میں نہیں آتا کہ مہرکن اور نہ کاتب دونوں اسقدر جاہل تھے کہ اونھیں لفظ غازی کا املا معلوم نہ تھا۔ خاندان مغلیہ میں عموماً یہہ قاعدہ تھا کہ شاہی مہر بادشاہ کی تخت نشینی کے ایام میں طیار ہوتی تھی۔ اور اُس کی طیاری میں خاص انتظام کیا جاتا تھا۔ مشہور و معروف مصور و خطاط اُس کا خاکہ بناتے تھے۔ جو دربار میں بادشاہ کے سامنے پیش ہوتا تھا۔ اور پسندیدگی و منظوری کے بعد کوئی ماہر فن مُہرکن اوسکو کھودتا تھا۔ اب اگر یہہ بھی مان لیا جائے کہ یہہ غلطی مہر بننے کے وقت نظر انداز ہوگئی ہوگی تو یہہ کیسے باور کیا جائیگا کہ وہ قریب قریب تین سال تک برابر شاہی فرامین پر ثبت ہوتی رہی اور کسی نے اُس کو نہ دیکھا۔ ورنہ ضرور اس کی تبدیلی عمل میں آتی اب اسی غلطی کو متن میں غور کیجئے۔

یہہ وصیت نامہ جیسا اوسمیں تحریر ہے مخفی یا (Confidential) تھا اوس کو پوشیدہ رکھنے کی غرض سے احتیاطاً اسکی متقاضی تھی کہ اس کو خود بابر بادشاہ یا اوس کا کوئی خاص معتمد رازدار تحریر کرتا یہہ دیکھتے ہوئے کہ وصیت نامہ نہایت چھوٹا سا ہے اور بابر اپنے ولیعہد ہمایوں کو لکھ رہا تھا خیال کیا جاسکتا ہے کہ بابر نے ضرور اوسکو خود ہی تحریر کیا ہوگا بہرصورت یہہ باور نہیں کیا جاسکتا کہ معمولی سے لفظ غازی کی املا میں بابر یا اُس کا کوئی معتمد امیر یا وزیر ایسی غلطی کرتا۔ مہر و متن میں اس غلطی کی تکرار سے یہہ شُبہ ہوتا ہے کہ وہ دونوں ایک شخص کے اور غالباً ایک ہی وقت کے تحریر کردہ ہیں اور آنہیں دو سال کا فرق اس وصیت نامہ کو اصلیت کی جھلک دینے کی غرض سے ارادتاً رکھا گیا ہے۔

رسم تحریر پر غور کرتے ہوئے عاصی ناظرین کی توجہ انہیں کی طرف مبذول کرتا ہے
جن کے بعد مُہر و متن دونوں میں حرف (ھ) تحریر ہے۔ جو سنہ ہجری پر دلالت کرتا ہے
دو ر اہل اسلام میں عام طور پر ہندوستان میں سن ہجری رائج تھا۔ اگرچہ اسکے ساتھ
ہی دیگر سنین بھی مثلاً سن فصلی۔ بکرماجیت اور شہنشاہ اکبر کے زمانہ میں سن الٰہی
اور دیگر شاہان مغلیہ کی زمانہ میں سنہ جلوس وغیرہ نظرانداز نہیں کئے جاسکتے۔ لیکن سنہ
ہجری کو عربی و فارسی تحریرات میں وہی عام مقبولیت حاصل تھی جو کہ زمانہ انگریزی تحریرات
میں سنہ عیسوی کو حاصل ہے۔ غدر کے بعد جب سلطنت برطانیہ کا تسلط ہوا تو رفتہ رفتہ
سنہ ہجری متروک ہوگیا اور اس کی جگہ سنہ عیسوی نے لے لی۔ ہجری سنہ کو
عیسوی سنہ سے تمیز کرنے کیلئے ہجری سنہ کے بعد (ھ) اور عیسوی سنہ کی بعد (ع)
لکھنے کی ضرورت ہوئی۔ اور یہہ رسم ابتک جاری ہے۔ عاصی کو متعدد قدیم سکہ جات
کتبہ جات قلمی نسخے کتب فرامین۔ اسناد۔ پروانہ جات اور دیگر پرانی تحریرات مثلاً
خطوط۔ محضر نامے۔ عرائض وغیرہ وغیرہ دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے لیکن سنہ ہجری کے بعد
صرف (ھ) کہیں لکھا نہیں دیکھا بلکہ پورا لفظ ہجری یا اُس کے ساتھ اکثر ایسے الفاظ
جیسے ہجری نبوی۔ ہجری مقدس۔ ہجری مبارک نظر سے گذری ہیں۔ سنہ ہجری کے
ساتھ حرف (ھ) لکھنے کی رسم ہندوستان میں قطعی جدید ہے یعنی اُس زمانہ سی جیسے
سنہ عیسوی نے یہاں رواج پایا ہے۔ اور اس بنا پر یہہ وصیت نامہ کسی طرح بابر
بادشاہ حتی کہ دور آخر کے بھی مغل بادشاہ کے زمانہ کا نہیں ہو سکتا۔

بابر ہندوستان میں سلطنت مغلیہ کا بانی تھا اس کی مادری زبان ترکی تھی
اور اسی زبان میں اُس نے اپنی تزک تحریر کی ہے جس کے کئی ترجمے فارسی

زبان میں ہوئے ہیں یہہ معلوم نہیں کہ وہ فارسی زبان میں مہارت رکھتا تھا یا نہیں۔ بہر حال اُس کی اصل زبان تُرکی تھی اور اُسکی تزک کی بلحاظ خوبی عبارت و برجستگی بہت تعریف و توصیف کی جاتی ہے۔ فارسی بطور دفتری زبان کے مغلوں نے ہندوستان میں آکر اختیار کی جس کا یہاں پہلے سے رواج تھا۔ اور اپنی اصلی زبان کو چھوڑ دیا۔ اس صورت میں یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہہ وصیت نامہ فارسی زبان میں کیوں تحریر ہوا۔ جب ہم یہہ دیکھتے ہیں کہ مخفی طور پر محض ہمایوں کے واسطے لکھا گیا تھا اور یہ غرض تزک کی زبان میں لکھنے سے بدرجہ اولیٰ حاصل ہوتی تو اُس کا فارسی زبان میں ہونا مزید استعجاب کا باعث ہوتا ہے۔

ناظرین ملاحظہ فرمائیں گے کہ اس وصیت نامہ پر بابر کے دستخط نہیں ہیں بلکہ صدر پر اوسکی مُہر ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مثل عام فرامین و احکام کے (معمولی) طور پر جاری ہوا تھا۔ تمام احکام شاہی کے اجرا کا یہہ طریقہ تھا کہ وہ دفتر میں تحریر ہوتے تھے اور مہر شاہی سے مزین ہونیکے بعد جاری کئے جاتے تھے۔ یہہ وصیت نامہ اس ذیل میں نہیں آسکتا اول تو وہ بوجہ مخفی ہونیکے دفتر میں عام محرروں کے ہاتھ میں جا ہی نہیں سکتا تھا۔

دوئم ایسی اہم تحریر جو ہمایوں کیلئے ہدایات حکمرانی کے اصولوں پر مبنی تھی اور طویل بھی نہ تھی بابر خود اپنے ہاتھ سے یا اگر کسی وجہ سے یہہ ممکن نہ تھا تو اپنے کسی معتمد خاص سے تحریر کراکے اوس پر اپنے دستخط ثبت کرتا۔ مثل ایک عام فرمان شاہی کے اوسکا اجرا ہرگز ہرگز قرین قیاس نہیں۔

وصیت نامہ مذکور کی تاریخ تحریر یکم جادی الاول ۹۳۵ھ ہجری ہے۔ ۹ ربیع الآخر سے ۳ جمادی الاول ۹۳۵ھ تک بابر مع اپنے چند ہم صحبت امرا کے بغرض سیر

و تفریح بمقام دھولپور نیل فر باغ میں مقیم تھا۔ چنانچہ وہ اپنی تزک میں تحریر کرتا ہے
"شب یک شنبہ بست و نہم ربیع الآخر سنہ ۹۳۵ھ در سہ پہر و شش گھڑی از جوان گذشتہ
بباغ نیل فر کہ در دولپور است متوجہ شدیم۔ از روز یکشنبہ سہ پہر نزدیک مسید بود کہ
بباغ آمدیم - در اطراف و جوانب باغ بامرا و نزدیکان جاہائے و منزلہائے تعین شد
کہ بجہت خود عمارت ہائے و باغ ہائے می‌اندازند۔ روز پنجشنبہ سوم جمادی الاول در طرف
شرق و جنوب باغ از برائے حمام جا تعین نمودہ جائے حمام را راست ساختہ"۔[1] چوتھی
جمادی الاول کو بابر دھولپور سے آگرہ واپس آیا اور پانچویں تاریخ کو اسے اس امر کی اطلاع
ملی کہ ہمایوں نے چالیس پچاس ہزار سپاہ لیکر کابل سے سمرقند پر چڑھائی کی ہے جیسا کہ
اس کی ذیل کی تحریر سے ظاہر ہوتا ہے "ہمیں روز شنبہ (۵ جمادی الاول سنہ ۹۳۵ھ)
از کابل خط و خبر آمد کہ ہمایوں لشکر آں طرفہا را جمع نمودہ سلطان اویس را با خود ہمراہ کردہ
با چہل پنجاہ ہزار کس بر سر سمرقند عزیمت کردہ است"[2]

وصیت نامہ کی تاریخ کے لحاظ سے بھی نتیجہ نکلتا ہے کہ اس کو بابر نے دھولپور
میں تحریر کیا ظاہر کوئی وجہ اوسکے لکھنے کی معلوم نہیں ہوتی۔ عام قاعدہ کے مطابق یہ اس وقت
لکھا جاتا جبکہ بابر کسی مہلک مرض یا خطرہ میں مبتلا ہوتا یا وہ ہمایوں کو کسی غیر ملک سے
ہندوستان کو بغرض حکومت روانہ کرتا۔ یہاں معاملہ قطعی برعکس ہے یعنی بابر سیر و تفریح
میں ہندوستان میں مصروف ہی اور ہمایوں ہندوستان سے باہر سمرقند پر چڑھائی کر رہا
ہے۔ تزک میں بھی بابر نے کسی وصیت نامہ کے لکھنے اور اسکو ہمایوں کے پاس بھیجنے کا ذکر نہیں کیا
مذکورہ بالا وجہات سے عاصی اس وصیت نامہ کو قطعی مصنوعی اور جعلی تصور کرتا ہے فقط

[1] تزک بابری ترجمہ خانخانان عبدالرحیم خاں مطبوعہ مرزا ملک الکتاب بمبئی سنہ ۱۳۰۸ھ صفحہ ۲۲۳
[2] ۵۲

در نعت سرور کائنات صلعم

حضرت وحشت کلکتہ

نشاط جاودانی آشنائے کام جاں کردم — بنام لذت آگینش کہ من ورد زباں کردم
درودے گفتم و شوق نہاں خود عیاں کردم — حدیث عظمتش را آنچہ شایان بود آں کردم
سر شورش تقاضا را بہ بند رنگ در بردم — جبین سجدہ پرور را نیاز آستاں کردم
ز ذکر او لب خاموش را ذوق سخن دادم — زیاد او دل اندوہگین را شادماں کردم
بہ بزمش مدعایم بود عرض دردمندیہا — چرا از آداب محفل بے خبر بودم فغاں کردم
چناں افسانۂ او شوق را افزود در محفل — کہ شب ذکر جمیلش داستاں در داستاں کردم

چراغ آشنائی کردہ ام روشن بدل وحشت
بحمد اللہ کہ سامان نشاط جاوداں کردم

منطق شہادت[لہ]

از

جناب پروفیسر معتضد ولی الرحمن صاحب ایم اے۔ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن۔

سر ولیم ہیملٹن نے معلومات انسانی کو وسائل علم کی بنا پر دو قسموں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلی صورت تو وہ ہوتی ہے جہاں ہم اپنی تمام معلومات کے لئے اپنے حواس ظاہری ہوں یا باطنی کے دست نگر ہوتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں ہماری یہ معلومات اعصارات حواس کا نتیجہ اور ان سے ماخوذ ہوتی ہیں۔ ادراکات اس قسم کی بہترین مثالیں ہیں۔ اگر میرے سامنے میز پر کتاب رکھی ہوئی ہو تو اس کا علم مجھ کو اس طرح ہو سکتا ہے کہ میری آنکھ کھلی ہو اور اس کی طرف دیکھ رہی ہو۔ یعنی یہ کہ آنکھ یا آلہ بصارت میں تہیج ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ میں اس کتاب کی تصویر آنکھ بند کر کے اپنے ذہن میں قائم کروں لیکن کتاب کا یہ علم بھی اس کے ادراک پر موقوف ہے کیونکہ جس چیز کو میں نے دیکھا ہی نہیں اسکی تصویر بھی قائم نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح یہ ہو سکتا ہے کہ میں حافظہ کی مدد سے اس کتاب کے علم کا احیا کروں۔ اس صورت میں بھی ہم ادراک کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ ایک اور صورت یہ ہو سکتی ہے کہ میں کتاب کا تصور کرنے کی کوشش کروں۔ چونکہ اس کے لئے مجھ کو مختلف کتابوں کا آپس میں مقابلہ کرنا پڑتا ہے لہذا یہاں بھی میں ادراک سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ مختصر یہ کہ کتاب کے علم کی یہ تمام صورتیں بالواسطہ یا بلاواسطہ فعلیت حواس پر موقوف ہیں۔ اسی کو اس طرح بھی بیان کیا

لہ اس مضمون کا اکثر حصہ سر ولیم ہیملٹن کے لکچرز (جلد چہارم) سے ماخوذ ہے

جاسکتا ہے کہ یہ تمام تجربے کا نتیجہ ہے۔ بغیر تجربے کے یہ ناممکن الحصول اور عدم محض ہوتا۔ اسی وجہ سے اِس قسم کے علم کو تجربی، یا شہودی کہا جاتا ہے۔ لیکن ہمارا تمام علم تجربے تک محدود نہیں ہوتا۔ بعض معلومات ایسی بھی ہوتی ہیں، جو حواس کی معلیت کا نتیجہ نہیں ہوتیں، برخلاف اس کے وہ پیدائش ہی کے وقت ہمارے ذہنوں میں ہوتی ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ان کے وجود کا علم ہم کو تجربے کے وقت ہوتا ہے، لیکن یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ تجربے کا نتیجہ ہیں[۵]۔ تمام قوانین و نوامیس علم کی اسی قسم سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایک بچہ جو اپنے ہاتھ کی حرکات پر پوری طرح متصرف ہوچکا ہے، اپنی ناک پر کی مکھی کو اڑانے کیلئے اپنا ہاتھ ہلاتا ہے کیوں؟ صرف اس وجہ سے کہ مکھی کے بیٹھنے سے اس کو خاص قسم کا احساس ہوتا ہے۔ اب خیال آتا ہے کہ اس احساس کی کوئی نہ کوئی علت ہونی چاہیئے اور یہ کہ یہ احساس اس وقت تک رفع نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ علت دور نہ ہوجائے اسی علت کو دور کرنے کیلئے وہ ہاتھ ہلاتا ہے۔ بعینہ یہی منشا ہے قانون علت و معلول کا۔ اس کا علم تجربے کے موقعہ پر ہوا۔ لیکن اس کو تجربے کا نتیجہ نہیں کہا جا سکتا اس نوع کے علم کو خالص، وہبی، عقلی، یا حضوری کہتے ہیں اور یہ علم کی دوسری قسم ہے۔ علم کی ان دونوں قسموں کی خصوصیات امتیازی یہ ہیں کہ تجربے سے ہم کو کلیات کا علم نہیں ہوسکتا۔ یہاں ہمارا معلوم لازماً کوئی فرد ہوتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں ہمارا علم واجبات کے درجہ تک نہیں پہونچتا۔ برخلاف اس کے علم حضوری سے ہم کو کلیات کا علم ہوتا ہے۔

ہم نے اوپر اپنے علم کے وسائل کو دو قسموں پر تقسیم کیا ہے۔ اول تجربہ اور دوم عقل۔ اب تجربہ پھر دو قسموں پر منقسم ہوجاتا ہے ایک صورت تو یہ ہے کہ یہ خود میرا ذاتی تجربہ ہو مثلاً یہ کہ میں خود اپنی آنکھوں سے کتاب کو میز پر رکھا ہوا دیکھوں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ یہ کسی

---

۵ ڈاکٹر مینسل تمام علم کو تجربی کہتا ہے کیونکہ یہ یا تو تجربہ سے حاصل ہوتا ہے یا تجربہ کے وقت۔ تجربہ دونوں صورتوں میں حاصل

اور کا تجربہ ہو۔ یعنی یہ کہ کوئی اور شخص مجھ سے آکر بیان کرے کہ اس نے وہ کتاب میز پر دیکھی تھی ان میں سے صورت اول کو "اپنا تجربہ" اور صورت دوم کو "غیر کا تجربہ" کہا جاسکتا ہے۔ اگرچہ ان دونوں ذرائع سے ہم کو کتاب کا علم ہو سکتا ہے لیکن یہ ظاہر ہے کہ جس قدر اعتماد اور یقین ہمکو "اپنے تجربہ" پر ہوتا ہے وہ "غیر کے تجربہ" پر نہیں ہوتا۔ اگر ہم نے خود اپنی آنکھوں سے کتاب کو میز پر رکھا ہوا دیکھا ہے تو ہم اس علم میں شبہہ نہیں کرتے۔ لیکن اگر کوئی اور شخص آکر بیان کرتا ہے کہ اس نے وہ کتاب دیکھی تھی تو ہم کو شبہہ رہتا ہے کہ کہیں وہ دانستہ یا نادانستہ طور پر جھوٹ نہ بول رہا ہو دوسرے الفاظ میں "اپنا تجربہ" "غیر کے تجربہ" کے مقابلے میں زیادہ واضح، صاف اور مکمل ہوتا ہے اسی طرح صداقت، یقین اور صحت کا بہت غلبہ ہوتا ہے۔ لیکن غیر کا تجربہ" ہمارے اپنے تجربہ پر اس لحاظ سے فوقیت رکھتا ہے کہ اس میں جامعیت زیادہ ہوتی ہے اور یہ کہ اس کے بغیر انسان اکثر ایسی معلومات سے محروم رہتا ہے جو اس کیلئے بہت اہم ہیں اسکا مطلب یہ ہے کہ کسی چیز کے متعلق تجربی واقفیت حاصل کرنے میں "اپنا تجربہ" اور "غیر کا تجربہ" دونوں اپنی اپنی جگہ بہت اہم اور فائق ہیں۔ ہم ان میں سے کسی ایک کو ترک کرکے دوسرے کو اختیار نہیں کرسکتے۔ اور اگر کرتے ہیں تو صحت و صداقت، یا جامعیت دافادیت کے ایثار کے بعد۔

ہمارا "اپنا تجربہ" لازمی طور پر ہمارے انہی آلات حس کے تہیج پر منحصر ہوا کرتا ہے۔ اگر ان آلات میں کسی قسم کا تہیج نہ ہو تو ہم کو کسی قسم کا "اپنا تجربہ" نہیں ہوسکتا۔ دوسرے الفاظ میں اگر بچہ پیدائش ہی کے وقت سے بالکل فاقد الحس ہو[۵] یعنی یہ کہ وہ اندھا بھی اور بہرہ بھی، ناک بھی بیکار ہو اور زبان بھی جلد بھی غیر ذی حس ہو اور عضلات بھی، تو اس کو کسی قسم کا علم نہیں ہوسکتا اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ اس دنیا میں اس کی عمر چند لمحوں کی ہوگی۔ کیونکہ

۵؎ گویا اس کی حالت مشہور فرانسیسی فلسفی کانڈیلک (۱۷۱۵–۱۷۸۰) کے مفروضہ کی سی ہو

یہی آلات حس ہیں جن کے ذریعہ سے ہم مفید و مضر میں تمیز کرتے ہیں۔ ہماری ان آلات حس کو ماہرین نفسیات دو قسموں میں تقسیم کرتے ہیں ایک قسم آلات حس کی وہ ہوتی ہے جن کے تہیج یا اثر پذیری کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ مہیج ان کے متقارن ہو۔ یعنی یہ کہ جب تک مہیج ان کیساتھ مس نہیں کرتا اس وقت تک ان میں کسی قسم کا تہیج پیدا نہیں ہوتا۔ اور اس لئے ان کے ذریعہ سے کوئی علم حاصل نہیں ہوتا۔ زبان اور جلد اس قسم کے آلات حس کی مثالیں ہیں۔ کسی چیز کا ذائقہ ہم کو اس وقت تک معلوم نہیں ہو سکتا جب تک کہ ہم اس کو زبان پر نہ رکھیں۔ اسی طرح کسی چیز کی سختی و نرمی، ہمواری ناہمواری و گرمی سردی اس وقت تک محسوس نہیں ہوتی جب تک کہ وہ چیز ہماری جلد کیساتھ مس نہیں کرتی۔ ان آلات حس کو مقارنہ کہا جاتا ہے ان کے مقابلہ میں آلات حس کی دوسری قسم ہوتی ہے جن کے تہیج کے لئے مہیج کا اتصال ضروری نہیں۔ وہ دور ہی سے اس کے اثر کو قبول کر لیتے ہیں اور اسی اثر کی وجہ سے ان میں تہیج شروع ہو جاتا ہے۔ آنکھ ناک اور کان آلات حس کی اس قسم میں داخل ہیں۔ کسی چیز کو دیکھنے کیلئے ضروری نہیں کہ وہ چیز کے ساتھ مس کرے۔ اسی طرح ہم ایک میل کے فاصلے پر بیٹھکر آواز کو سن اور بو کو سونگھ سکتے ہیں۔ اس دوسری قسم کے آلات کو بعیدہ کہا جاتا ہے

ماحصل اس تمام تقریر کا یہ ہے کہ "اپنے تجربہ" کے لئے آلات حس کا تہیج لازمی ہے۔ آلات حس دو قسم کے ہوتے ہیں مقارنہ اور بعیدہ۔ اب ذرا غور کرنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ مقارنہ قسم کے آلات حس کا دائرہ عمل اس قدر محدود ہے کہ وہ بلحاظ ذرائع علم کے تقریباً بیکار ہیں اس سے انکار نہیں کہ ان کے ذریعے سے علم حاصل ہو سکتا اور ہوتا ہے لیکن اس علم کی کیفیت و مقدار یقیناً بہت تھوڑی ہوگی۔ اگر ہر چیز کے متعلق معلومات حاصل کرنے کیلئے ضروری ہو کہ اس کو آلات حس سے متصل کیا جائے تو ہماری تمام عمر میں صرف معدودے چند معلومات

ہی حاصل ہوں ان کے مقابلے میں آلات بعیدہ کا دائرہ عمل وسیع تر ضرور ہے لیکن وہ اتنا وسیع نہیں کہ ان کے ذریعے سے ہر قسم کی اور تمام معلومات حاصل ہو جائیں آنکھ ناک اور کان دور کی اشیاء سے تہیج ہو سکتے ہیں لیکن اگر ہیج اور ان کے درمیان فاصلہ بہت دور ہو جائے تب یہ ذرائع بھی بے کار ثابت ہوتے ہیں ہم یہاں بیٹھکر علیگڈھ جوبلی کی رونق کو نہ دیکھ سکتے ہیں، نہ وہاں کی تقریروں کو سن سکتے ہیں۔ گویا ان کے متعلق ہم کو کسی قسم کا "اپنا تجربہ" نہیں ہو سکتا۔

پھر اس کے ساتھ اس کو بھی شامل کیجئے کہ ہمارے آلات حس کی فعلیت صرف زمانۂ حال تک محدود ہوتی ہے۔ ماضی مستقبل ان کی دسترس سے باہر رہتے ہیں۔ ان زمانوں کے واقعات واشیاء کا ہم کو "اپنا تجربہ" نہیں ہو سکتا۔ یہ صحیح ہے کہ ہم بعض گذشتہ واقعات کو دہرا اور مٹی ہوئی چیزوں کا احیا کرا سکتے ہیں لیکن بعض ایسی بھی ہوتی ہیں جن کا دہرانا یا احیا کرنا ناممکن ہوتا ہے۔ ہم خود اس بات کی تصدیق کر سکتے ہیں کہ پانی دو مختلف گیسوں کے ملنے سے بنتا ہے لیکن ہیلی کے دمدار ستارے یا پانی پت کی دوسری لڑائی کا احیا کرنا کس طرح ممکن ہی ہے اگر ہم تمام گذشتہ باتوں اور واقعات کی اسی طرح تصدیق کرنا شروع کریں تو ہماری تمام عمر اسی میں گزر جائے۔ اور ہم کو نئی معلومات حاصل کرنے کی فرصت ہی نہ ملے۔

ہم کسی طریقہ سے بھی اپنے آلات حس کے ان نقائص کو بالکلیہ رفع نہیں کر سکتے۔ اسمیں شک نہیں کہ جدید اختراعات کے طفیل ہم ہزاروں میل پر بیٹھکر کسی مغنی کا گانا سن سکتے ہیں۔ اسکی شکل دیکھ سکتے ہیں۔ لیکن اول تو یہ ذرائع ہر ایک کو میسر نہیں آسکتے، اور اگر آئیں بھی تو بعض چیزیں ایسی رہ ہی جاتی ہیں جن کا ہمکو ذاتی تجربہ نہیں ہو سکتا

اگر بفرض محال ان نقائص کا بالکلیہ استیصال ممکن ہو بھی تب بھی دنیا میں قابل تحقیق باتیں
اس قدر ہیں کہ ان میں سے ہر ایک کے ذاتی تجربہ کے لئے عمر نوح بھی کفالت نہ کریگی معمولی
بات ہے کہ تمام دنیا کی سیاحت کیلئے کسی قدر وقت کی ضرورت ہے پھر اس سیاحت کے علاوہ
اور بہت سی چیزیں اور باتیں اس قسم کی ہیں جن کے لئے الگ الگ توجہ درکار ہوگی۔ اسی
طرح اگر ہر ایک چیز کو الگ الگ توجہ کے مرکز میں لایا جائے تو آسانی کے ساتھ اندازہ کیا جاسکتا
ہے کہ کس قدر وقت درکار ہوگا۔ لیکن ہر شخص واقف ہے کہ ہماری حیات مستعار میں یہ تمام
باتیں حاصل ہونا ناممکن ہے۔ یہ اس قدر قلیل المدت اور اس کی مصروفتیں اس قدر
بہ کثرت ہیں کہ اس قسم کی تمنا کرنا ہی حماقت کی نشانی ہے۔

ان تمام باتوں کے علاوہ یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ معلومات انسانی کے مختلف شعبوں
(جن کو عرف عام میں علوم کہا جاتا ہے) کے حدود اس قدر وسیع ہیں کہ کوئی تن تنہا ان کو
قطع نہیں کرسکتا۔ اس کو یار و مددگار کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہر علم کی تمام باتوں کو وہ اپنے
تجربہ میں نہیں لاسکتا۔ اس کو اکثر مقدمات فرض کرنے پڑتے ہیں۔ ان کی صداقت کا
وہ اور علوم کو ضامن ٹھہراتا ہے۔ بعض نتائج وہ اس قسم کے چھوڑ جاتا ہے کہ اخلاف کو
ان کی تصدیق کرنی پڑتی ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ افزائش و ترقی علم اس وقت تک خیال باطل ہے جبتک کہ ہم اپنے
ذاتی تجربہ کے ساتھ غیر کا تجربہ شامل نہ کریں۔ جو چیزیں کہ آلات حس کے دائرہ عمل سے کسی
وجہ سے خارج ہیں ان کے متعلق اوروں سے استفسار اور ان کے بیانات پر اعتبار کریں
اپنی حیات مستعار کی قلت مدت کو ملحوظ رکھکر ہم اوروں کو اپنا شریک کار بنائیں اور
ان کی معلومات سے استفادہ کریں جن گزشتہ چیزوں اور باتوں کا ہم خود تجربہ نہیں

کر سکتے" یا جن کا اعادہ نہیں ہو سکتا ان کے متعلق اسلاف کی تحریروں کو دلیل راہ بنائیں مختصر یہ کہ "اپنے تجربے کے نقائص غیر کے تجربہ سے رفع کریں اور اس طرح اپنے تجربے کے نقصان کی تلافی کریں۔ یہی مطلب تھا ہمارے اس جملے کا کہ "اپنے تجربہ میں غیر کے تجربہ کے مقابلہ میں، جامعیت کم ہوتی ہے اور یہ جامعیت اس طرح پیدا ہوتی ہے کہ ہم اپنے تجربہ سے اوروں کو مطلع کریں اور لوگ اپنے اپنے تجربے سے ہم کو مستفید ہونے کا موقعہ دیں۔ یعنی یہ کہ اگر ہمارے پاس اطلاع دہی کے ذرائع نہیں اگر ہم اوروں کو اپنے تجربہ سے مطلع کرنیکے قابل نہ ہوں، اگر ہم سب ملکر معلومات فراہم نہ کریں تو ہمارا علم نہ ترقی کر سکتا ہے نہ اس میں کسی قسم کی افزائش کی اُمید کی جا سکتی ہے۔ لیکن خوش قسمتی سے ہم میں یہ قابلیت اطلاع دہی بدرجہ اتم موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اوروں کے تجربے سے، اور اور ہمارے تجربہ سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ یہ استفادہ ان بیانات کے ذریعہ سے ہوتا ہے جو ہم اپنے ذاتی تجربوں کے متعلق دیتے ہیں۔ ان ہی بیانات کو وسیع معنوں میں شہادت کہا جاتا ہے۔ ایک شخص آ کر علیگڈھ جوبلی کے حالات بیان کرتا ہے یعنی ان تمام باتوں کا ذکر کرتا ہے جو اس نے وہاں دیکھیں یا سنیں۔ دوسرے الفاظ میں وہ اپنے ذاتی تجربے کے متعلق بیانات دیتا ہے اور ان کے ذریعے سے ہمکو وہاں کے حالات سے مطلع کرتا ہے وسیع معنوں میں اس کو شہادت کہا جائیگا اور بیان دینے والے کو شاہد۔

لیکن محدود معنوں میں شہادت ایسے بیان کو کہتے ہیں جس سے ہم کچھ منتج کر سکیں، اور اس استنتاج کے لئے ہمکو اس بیان کی صحت کو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ یہ استنتاج کسی قسم کا ہو سکتا ہے سادہ اور مرکب اور یقینی و فرضی۔ یہ کسی قسم کا بھی ہو جس بیان پر اس کو مبنی کیا جاتا ہے اس کو شہادت کہتے ہیں۔ میرا ایک دوست مجھ سے آ کر کہتا ہے کہ اس نے

زیدکو بازار میں دیکھا ہے میرے نزدیک یہ شہادت ہے اس امر کی کہ وہ واقعی یہاں موجود تھا
ہو سکتا ہے کہ بعد کو یہ ثابت ہو کہ میرے دوست نے شناخت میں غلطی کی اور یہ کہ جس شخص کو اس نے
دیکھا تھا وہ زید نہ تھا۔ لیکن اس حالت میں بھی اس کو شہادت ہی کہا جائیگا۔ اسی بیان
سے اور نتائج بھی اخذ کئے جا سکتے تھے۔ مثلاً یہ کہ زید کی بیماری کی خبر غلط ہے کیونکہ اگر وہ
بیمار ہوتا تو بازار میں چلتا پھرتا دکھائی نہ دیتا۔ یا یہ کہ اس نے اپنا سفر کا ارادہ فسخ کر دیا۔
اسی طرح اخبار میں میں ایک خبر دیکھتا ہوں کہ مولانا محمد علی نے دہلی میں تقریر کی۔ یہ بیان
شہادت ہے اس بات کی کہ مولانا ئے موصوف دہلی میں ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ میرا یہ نتیجہ
غلط ہو اور مولانا محمد علی دہلی میں مقیم نہ ہوں بلکہ کہیں اور جاتے ہوئے دہلی میں اتر گئے ہوں
اور تقریر کر کے آگے روانہ ہو گئے ہوں۔ لیکن ان غلط نتائج سے اس بیان کے شہادت
ہونے میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بعض اوقات ایک ہی بات کے متعلق مختلف شہادتیں ہوتی
ہیں۔ ایسی حالت میں ہم ان تمام شہادتوں کا ایک دوسرے سے مقابلہ کرتے ہیں اور
پھر اسکی صحت و غلطی کو معلوم کرتے ہیں۔

بعینہٖ یہی کیفیت ہمارے "اپنے تجربے" کی ہوتی ہے لیکن یہاں ہم کو اپنے بیان
کی صحت کو فرض کرنا نہیں پڑتا۔ یہاں یہ فرض کرتے ہیں کہ ہمارا مشاہدہ غلطی سے پاک ہے
اور یہ کہ ہمارے حواس صحیح صحیح علم ہم پہونچا سکتے ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ ہمارا مشاہدہ بعد میں
غلط ثابت ہو۔ پھر جو کچھ علم کہ ہم کو اپنے حواس سے حاصل ہوتا ہے وہ اوروں کیلئے شہادت
کا کام دیتا ہے۔ اسی بات کے متعلق ہم اوروں کی شہادت کو شامل کر کے نتائج اخذ کرلیتے
ہیں۔ میں ایک شخص کو پہاڑ کے دامن میں بیہوش پڑا دیکھتا ہوں اس سے میں اس نتیجہ پر
پہونچتا ہوں کہ وہ اوپر سے گر پڑا ہے۔ یہ بیان میرے لئے شہادت ہے کیونکہ اسی پر

میرا نتیجہ مبنی ہے۔ جب میں اسکا ذکر اوروں سے کرتا ہوں تو میرا یہی بیان اوروں کیلئے شہادت بن جاتا ہے لیکن اسکے ساتھ یہ ضروری ہے کہ وہ مجکو معتبر سمجھتے ہوں۔ پھر وہ بھی اس سے نتائج اخذ کر سکتے ہیں۔ ایک ڈاکٹر کسی جاں بلب مریض کو دیکھنے آتا ہے۔ وہ اسکی علالت کو خود دیکھتا ہے اور اس کے متعلق دوسروں کے بیان سنتا ہے۔ اب وہ ڈاکٹر خود اپنے مشاہدہ اور دوسروں کے بیانات پر اپنے نتائج کو مبنی کرتا ہے۔ اس کا اپنا مشاہدہ اور اوروں کے بیانات اس کیلئے شہادت ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ شہادت کی ضرورت ہمکو اسوقت پڑتی ہے جب وہ بات جو اس میں بیان کی گئی ہے خود ہمارے مشاہدہ میں نہ آسکتی ہو اگر ہم خود علیگڈھ کی جوبلی میں شریک ہوئے ہیں تو ہم اوروں کے منہ سے اس کے حالات سننے کے خواہشمند نہ ہونگے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ہمارے استدلالات دوسروں کے مشاہدہ پر نہ مبنی ہوتے ہیں اور نہ ہونے چاہئیں کیونکہ انکی صداقت کا ثبوت ہر شخص دیسکتا ہے اسکا مطلب یہ ہے کہ شہادت ہمیشہ تجربات ہی کے متعلق ہوتی ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ یہ ہمارے اپنے تجربات کی حدود سے باہر ہوں۔ اس لحاظ سے اب ہم شہادت کی محدود ترین معنوں میں تعریف اسطرح کر سکتے ہیں کہ یہ ایک تجربہ کی اطلاع دہی ہے۔ اسی کو دوسرے الفاظ میں اسطرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ شہادت مشاہدہ کئے گئے کی وہ اطلاع ہے جو ان لوگوں کو دی جاتی ہے جن کے ذاتی تجربے میں وہ منظر نہ آسکتا تھا۔ جس منظر یا بات کے متعلق شہادت دی جاتی ہے اس کو اصطلاحاً واقعہ کہا جاتا ہے اور شہادت کی صحت کو تاریخی قابلیت اعتبار یا یقینیت۔

شہادت دو قسم کی ہوتی ہے بلا واسطہ اور بالواسطہ بلا واسطہ اسکو اسوقت کہا جاتا ہے جب اس واقعہ کا جس کے متعلق شہادت دی جارہی ہے خود شاہد نے مشاہدہ کیا ہو

بالواسطہ اس حالت میں ہوتی ہے جب وہ واقعہ خود شاہد کے مشاہدہ میں نہ آیا ہو بلکہ اوروں کی شہادت پر اس نے اسکو تسلیم کیا ہو۔ مثلاً میں خود علیگڈھ جوبلی میں شریک ہوں اور وہاں سے واپس آکر خود اپنے مشاہدات بیان کروں میرے یہ تمام بیانات بلاواسطہ شہادت میں شمار ہونگے۔ لیکن اگر میں خود وہاں کی تقاریب میں شامل نہ ہوں بلکہ اوروں کی سُنی سُنائی باتیں بیان کروں تو یہ شہادت بالواسطہ ہوگی۔ بلاواسطہ شہادت کو عینی شہادت' اور بالواسطہ کو اُذنی شہادت بھی کہا جاتا ہے یہ ظاہر ہے کہ عینی شہادت ہمیشہ اُذنی شہادت پر فائق ہوتی ہے عینی شہادت میں یقین کا درجہ اُذنی شہادت کے مقابلہ میں بڑا ہوتا ہے۔ بالواسطہ شہادت میں جس شخص کی شہادت پر ایک واقعہ بیان کرتے ہیں اس کو ضامن کہتے ہیں مثلاً میں علیگڈھ جوبلی سے واپس آکر زید سے وہاں کے حالات بیان کروں اور زید عمر سے۔ اب زید کی یہ شہادت بالواسطہ ہوگی اور میں جسکی شہادت پر اس نے یہ تمام واقعات بیان کئے ضامن۔ ضامن خود بلاواسطہ یا بالواسطہ شاہد ہوسکتا ہے۔ چنانچہ ممکن ہو کہ میں خود علیگڈھ جوبلی میں شریک نہ ہوں لیکن خالد سے وہاں کے حالات سنوں اور سنکر زید سے بیان کروں اور زید عمر سے۔ اس تمام سلسلہ میں میں زید کی شہادت کا ضامن ہوں لیکن ظاہر ہے کہ خود میری شہادت بلاواسطہ نہیں کیونکہ وہ تمام واقعات جن کو میں نے زید سے بیان کیا ہے۔ خود میرے مشاہدے میں نہ آئے تھے ضامن اگر بالواسطہ شاہد ہو تو شاہد متوسط' یا منقول عنہ کہلاتا ہے۔ پھر بلاواسطہ اور بالواسطہ دونوں قسموں کی شہادت جزئی ہوتی ہے یا مکمل اور متناسب ہوتی ہے یا متناقض ان قسموں کی تشریح کی خاص ضرورت نہیں۔ پھر یہ مستقیم ہوتی ہے یا غیر مستقیم۔ مستقیم اس وقت ہوتی ہے جب اس واقعہ کی اطلاع دہی کے علاوہ اور کچھ مقصود نہ ہو مثلاً علیگڈھ جوبلی

کے حالات صرف اس لئے بیان کئے جائیں کہ لوگوں کو ان حالات سے واقفیت ہو جائے۔ غیر مستقیم استحالت میں ہوتی ہے جب اس اطلاع دہی کی غایت کچھ اور ہو مثلاً ان ہی حالات کو اس غرض سے بیان کیا جائے کہ عوام الناس کو وہاں کے ارباب حل عقد کی فضول خرچیوں اور جا و بیجا خوشامدوں کا علم ہو جائے

یہاں تک جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ گویا اصل بحث کا مقدمہ تھا۔ عنوان میں ہم نے اس بات کا اعلان کیا ہے کہ ہم شہادت پر منطقی نقطہ نظر سے بحث کرینگے۔ اس لحاظ سے ہمارا اصلی کام یہ ہونا چاہئیے کہ ہم یہ دکھائیں کہ کس وقت کن حالات اور کن شرائط کے ایفا کے بعد بیتقابل اعتبار لائق وثوق یا صحیح ہوتی ہے۔ وجہ اس کی ظاہر ہے منطق میں ان اصول و قوانین سے بحث ہوتی ہے جن کا اتباع صحت وسلامتی فکر کے لئے ضروری ہے۔ لہذا اس مضمون کا اصلی موضوع ان شرائط کو بیان کرنا ہے جن کے ذریعے سے ہم شہادت کی صحت یا غلطی کو معلوم کر سکتے ہیں اسی ضمن میں ان اصول پر بھی بحث ہو گی جن سے شاہد کا امتحان ہو سکتا ہے۔

سہولت تفہیم کے لئے ہم اپنی بحث کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ پہلے حصے میں عام شہادت کی قابلیت اعتبار پر بحث ہو گی اور دوسرے میں بلا واسطہ اور بالواسطہ قسموں پر علیحدہ علیحدہ نظر ڈالی جائیگی۔ ان میں سے حصہ اول پھر دو حصوں میں تقسیم ہوتا ہے۔ یعنی جب ہم معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ ایک خاص شہادت لائق اعتبار ہے یا نہیں تو ہم کو اس مسئلہ پر دو مختلف حیثیتوں سے نگاہ کرنی چاہئیے۔ اول تو یہ دیکھنا چاہیئے کہ جس واقعہ کے متعلق شہادت دی جارہی ہے وہ کہاں تک ممکن الوقوع ہے۔ پھر یہ معلوم کرنا لازمی ہے کہ شاہد کہاں تک معتبر ہے۔ دوسرے الفاظ میں عام شہادت کی بحث دو حصوں میں تقسیم

ہوتی ہے جن میں سے پہلے کو مشہود سے اور دوسرے کو شاہد سے تعلق ہے۔ ان میں یک پہلے کے مطابق زیر تحقیق یہ امر ہوتا ہے کہ مشہود کے تعلق سے شہادت کی قابلیت اعتبار کے شرائط کیا ہیں؟ اور دوسرا سوال یہ ہے کہ شاہد کے لحاظ سے شہادت کن کن حالتوں میں قابل اعتبار ہوتی ہے۔ اب ہم اپنی تقسیم کے مطابق اور اسی ترتیب سے ان کا تذکرہ کرینگے۔

مشہود (یعنی وہ واقعہ جس کے متعلق شہادت دی جارہی ہے) کے تعلق سے شہادت کی قابلیت اعتبار کے معلوم کرنیکے لئے پہلی شرط تو یہ ہے کہ وہ واقعہ اطلاقاً اور اضافاً دونوں حیثیتوں سے ممکن الوقوع ہو۔ اس بیان میں اطلاقی اور اضافی امکان وقوع تشریح طلب ہیں۔ ایک واقعہ کو اطلاقاً یا بنفسہٖ ممکن الوقوع اس وقت کہا جاتا ہے جب یہ منطقی قوانین فکر کے مغائر و مخالف نہ ہو۔ ایک شخص آکر شہادت دیتا ہے کہ اس نے ایک پرندہ ایسا دیکھا ہے جو ایک ہی وقت میں بالکل سفید بھی تھا اور سیاہ بھی اب قانون فکر کا تقاضا ہے کہ یہ ناممکن ہے۔ ایک ہی چیز ایک ہی وقت ب اور غیر ب نہیں ہوسکتی چونکہ یہ واقعہ منطق کے اس قانون کے خلاف ہے اس لئے اسکو اطلاقاً ناممکن الوقوع کہا جائیگا جب یہ ثابت ہوگیا کہ ایک ہی پرندے کا ایک ہی وقت میں بالکل سیاہ و سفید ہونا ناممکن ہے تو بداہتہً یہ شہادت بھی بے کار ہوگئی۔ کیونکہ مشہود اطلاقاً ممکن الوقوع نہیں اس کے مقابلہ میں اضافی امکان وقوع اس واقعہ کا ہوتا ہے جو داخلی خارجی ادراک معروض بن سکے جو حواس یا شعور ذات پر اثر آفریں ہوسکے اور اسی اثر کی وجہ سے اس کا علم ہوسکے۔ اس حیثیت سے جن اشیاء کا ہم کو ادراک ہوسکتا ہے یہ اشیاء بلحاظ زمان و مکان کہیں ہوں وہ اضافاً ممکن الوقوع کہلائینگی۔ جن کا ادراک نہیں

ہو سکتا وہ اضافاً ناممکن الوقوع ہو نگی۔ ان اشیاء کے متعلق تمام شہادت بالکل لایعنی اور ناقابل اعتبار ہوگی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس شہادت کا مشہود بنفسہٖ یا احضاری قوا کی حیثیت سے ناممکن ہو اس کو بلا کھٹکے رد کر دینا چاہیئے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ ایک چیز کی محالیت کا فیصلہ دو طریقوں سے ہو سکتا ہے۔ ایک صورت تو یہ ہو سکتی ہے کہ وہ چیز بحیثیت سے کے ناممکن ہو یا محال ہو یا یہ کہ عالم مادی کے قوانین و قوامیس کے مطابق اس کا ادراک نہ ہو سکتا ہو۔ اس قسم کی محالیت کو طبعی محالیت کہا جاتا ہے۔ اس کے مقابلے میں ایک حالت یہ ہو سکتی ہے کہ اس کا ادراک کسی فطری طریقوں میں سے کسی ایک سے بھی ممکن نہ ہو۔ اس قسم کی محالیت کو الہیاتی محالیت کہتے ہیں۔ کسی چیز کی طبعی محالیت کو ثابت کرنیکے لئے صرف یہی دکھانا کافی نہیں ہوتا کہ اس کے وجود کی توجیہ عام قوانین فطرت سے نہیں ہو سکتی، یا یہ کہ اس کا وجود قوانین فطرت کے بظاہر بالکل خلاف ہے، برعکس اس کے ضرورت اس بات کی ہوتی ہے کہ پہلے ایک کلی اور اٹل قانون فطرت کے وجود کو ثابت کیا جائے اور اگر یہ چیز طبعی طور پر ممکن ثابت ہو جائے تو وہ قانون فطرت خود بخود مسترد ہو جاتا ہے اسی طرح الہیاتی محالیت کو ظاہر کرنے کے لئے صرف یہی دکھانا کافی نہیں، کہ قوانین فطرت کے مطابق اس کی توجیہ نہیں ہو سکتی، یا یہ کہ ایک خاص قانون فطرت اس کے مخالف ہے اس کے ساتھ یہ بھی واضح کرنا لازم ہے کہ ایک مافوق فطری ذات بھی اس کی تکوین و تخلیق کا باعث نہیں ہو سکتی، اور یہ کہ اسکے وجود کو تسلیم کرنا کسی نہ کسی عقلی اصول کے منافی ہے۔ جب کسی چیز کی طبعی یا الہیاتی محالیت ثابت ہو جائے تو اس کے متعلق ہر شہادت کو بلا تردد رد کیا جا سکتا ہے۔

مشہود کے تعلق سے شہادت کی قابلیت اعتبار کو ثابت کرنے کیلئے اس کے امکان کے ثابت ہونیکے علاوہ یہ بھی ثابت ہونا چاہیئے کہ وہ اضافتاً ممکن الوقوع ہے۔ امکان کی یہ دونوں صورتیں ایک دوسری کیساتھ لازم وملزوم ہیں۔ ان میں سے ایک دوسری کی غیبت میں ناقص اور بے کار ہو جاتی ہے۔ اضافی امکان سے ہماری مراد یہ ہے کہ اس چیز کی لازمی اور ضروری صفات میں کسی قسم کا کوئی تناقض نہ ہو اس کے ساتھ ہی اس کو بھی نظر انداز نہ کرنا چاہیئے کہ جن صفات کو شہادت میں بیان کیا جا رہا ہے وہ بھی تناقض سے بری ہوں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک شہادت بحیثیت شہادت کے اگر متناقض بیانات کا مجموعہ ہے تو اس کو قابل اعتبار نہ سمجھنا چاہیئے کیونکہ ہر وہ چیز جو خود اپنی تنقیض کرے منطقی لحاظ سے بالکل بے کار ہوتی ہے۔ اس کو معلوم کرنے کے لئے صرف یہ دیکھنا کافی ہوتا ہے کہ یہ شہادت خود اپنی تنقیض تو نہیں کرتی کیونکہ ممکن ہے یہ تناقض خود شاہد کی رائے سے پیدا ہوا ہو۔ اگر اس قسم کے تناقض کو نظر انداز کر دیا جائے تو شہادت کی قابلیت اعتبار میں کسی قسم کا فتور و نقص واقع نہیں ہوتا۔ اور اس لئے اس کو نہ متروک کیا جا سکتا ہے ورنہ اسکی تکذیب لازم آتی ہے۔ ایک چیز کے وجود کی شہادت کو صرف اس بنا پر رد کر دینا یقیناً غلطی ہے کہ شاہد نے اس کی علت کے متعلق خود اپنی رائے ظاہر کی۔ مثلاً ایک شخص نے آکر بیان کیا کہ فلاں مقام پر زمین شق ہوئی ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ بیان کرتا ہے کہ ایک شخص کے سر پر جن سوار تھا۔ ایک عامل نے اپنے عمل سے اس جن کو اتارا اور وہ جن اس زمین کو شق کر کے غائب ہو گیا۔ اب اس شہادت کو صرف اس وجہ سے بے کار اور ناقص سمجھنا یقیناً غلطی ہے کہ یہ تعلیل و توجیہ ناقص ہے

کیونکہ زمین کا شق ہونا صحیح ہو سکتا ہے وجہ اسکی خواہ کچھ ہی ہو۔ دوسرے الفاظ میں شہادت کی جانچ کرتے وقت مشہود اور مشہود کے متعلق شاہد کی ذاتی رائے کو نہایت احتیاط سے علیحدہ کرنا بہت ضروری ہے۔ ایسا نہ کرنے سے ممکن ہے کہ غلط شہادت صحیح ہو جائے اور صحیح غلط۔ شہادت کے اس نقص کو صرف اسی طرح معلوم کیا جا سکتا ہے کہ اسکی تناقض بیانی کو معلوم کیا جائے۔

یہاں تک ہم نے اپنے آپ کو صرف مشہود تک محدود رکھا ہے۔ اب فرض کیا جائے کہ مشہود ا' ملا' دونوں طرح ممکن الوقوع ہے اسمیں نہ طبعی محالیت پائی جاتی ہے نہ الہیاتی۔ لیکن شہادت کی صحت کے لئے صرف یہی کافی نہیں ہوتا۔ ایک شخص آکر بیان کرتا ہے کہ فلاں مقام پر بلوہ ہو گیا بلوے کا ہونا ظاہر ہے کہ ناممکن الوقوع نہیں۔ اس وجود میں کسی قسم کی محالیت معلوم نہیں ہوتی۔ لیکن کیا یہ ممکن نہیں کہ اس شخص نے آکر جھوٹ بولا ہو؟ بلوے کا ہو ناممکن الوقوع ہونا ضرور نہیں لیکن اسکے امکان وقوع سے یہ کیسے لازم آتا ہے کہ اس شخص کی شہادت صحیح بھی ہے؟ کیا ہم کو اپنی روزمرہ زندگی میں اکثر ایسی شہادتوں سے سابقہ نہیں پڑتا جن کا مشہود ممکن ہے لیکن باوجود اسکے شہادت بے کار ہے؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی شہادت کی جانچ کرتے وقت پہلے تو یہ دیکھنا چاہیئے کہ مشہود ناممکن تو نہیں۔ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ یہ ناممکن ہے تو شہادت کی غلطی میں کسی قسم کا شبہ نہیں رہتا۔ لیکن اگر اس کا امکان ثابت ہو جائے تو دوسرا سوال یہ ہونا چاہیئے کہ شاہد کہاں تک معتبر ہے اس کے قول کا کس حد تک اعتبار کیا جا سکتا ہے۔

شہادت کی ماہیت کو جن الفاظ میں ہم نے پیچھے کہیں بیان کیا ہے ان پر نظر غائر ڈالنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ یہ در اصل دو اجزا سے مرکب ہوتی ہے

ہم نے کہا ہے کہ ایک واقعہ کو کسی ایسے شخص سے بیان کرنے کو شہادت کہتے ہیں جو
بذات خود اس واقعہ کا مشاہدہ۔نہ کر سکتا تھا۔ اب ظاہر ہے کہ اگر میں کوئی واقعہ
کسی شخص سے بیان کروں تو لازمی یہ ہے کہ وہ پہلے میرے مشاہدہ میں آئے یا اگر میری
شہادت بالواسطہ ہے تو کسی اور کے مشاہدے میں آئے کیونکہ جب تک وہ واقعہ خود
میرے منقول عنہ کے مشاہدہ میں نہ آئے یا میرا منقول عنہ اپنے مشاہدے کو مجھ سے
بیان نہ کرے اسوقت تک میں اس کے متعلق کوئی بیان نہیں دے سکتا اس تمام تقریر
کو دوسرے الفاظ میں اس طرح بھی بیان کیا جا سکتا ہے کہ شہادت اصل میں مشاہدہ
اور اس مشاہدہ کی اطلاع دہی سے مرکب ہوتی ہے یہی اس کے غیر منفک اور لازمی اجزا
ہیں۔ان میں سے ایک غائب ہو تو شہادت بھی کالعدم ہو جاتی ہے جب یہ مسلم ہے تو یہ بھی
ظاہر ہے کہ قابل اعتبار شاہد وہی ہو سکتا ہے جسمیں یہ دونوں باتیں بدرجہ اتم موجود
ہوں۔یعنی یہ کہ اس میں مشاہدہ کرنیکی قابلیت واہلیت بھی ہو اور اس مشاہدہ کو
مناسب طور پر بیان کرنیکی صلاحیت بھی۔لیکن اس کیساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ
جو کچھ وہ بیان کرے صدق دل اور خلوص نیت سے بیان کرے۔ اسمیں مبالغہ آمیزی
نہ کرے۔جہانتک ہو سکے اس کو واقعہ کے مطابق بیان کرے۔جھوٹ کا اسمیں دخل
نہ ہونے دے۔ باقی آئیندہ

جناب سید انور حسین صاحب آرزو لکھنوی جانشین

حضرت جلال

جب سے دل پر داغ کھا بیٹھے اثر شیون میں ہے
بو جہاں میں پھیل نکلی پھول ابھی گلشن میں ہے

کون ہے محو دعا اے جوش رحمت سچ بتا
شمع باہر جل رہی ہے روشنی مدفن میں ہے

بانکپن زہر ہلاہل بھولا پن میٹھی چھری
مرنا آتا ہو تو سب کچھ ایک ہی چتون میں ہے

دھوکے دھبہ خون کا نادان قاتل خوش ہے کیا
رنگ پر دھوکا نہ کھانا بو ابھی دامن میں ہے

لاش کس کی جاؤ بھی مٹی میں مٹی مل گئی
اب جو کچھ مدفن کے باہر ہے وہی مدفن میں ہے

عطر کب آتا ہے پسینے سے ہے بہتر آرزو
یہ بھی ہے ہلکا سا پردہ بو جو پیراہن میں ہے

ستی

از

(قمر جہاں بیگم صاحبہ بنت کبریٰ جناب ڈپٹی محمد بشیر صاحب صدیقی۔ رائے بریلی)

ستی کا رواج عرصہ ہوا کہ لارڈ ولیم بینٹنگ کے عہد وزارت میں ہندوستان سے نیست و نابود ہوا۔ اِس رسم کے مٹانے کی شہنشاہ اکبر نے بھی سر توڑ کوششیں کیں تھیں مگر ناکامیاب رہا۔ لیکن ہمیں نہیں معلوم ہوتا کہ یہ وحشیانہ قاعدہ کب سے اور کیونکر شروع ہوا۔ ایک مؤرخ ستی کی ابتدا دریافت کرنے میں کتنا ہی کوشاں کیوں نہ ہو اس کا پتہ و نشان ملنا مشکل بلکہ محال ہے۔ کیونکہ ستی کا نہ ویدوں میں تذکرہ ہے نہ پرانوں میں اشارہ ہے اور نہ منو صاحب ہی نے اپنی سمرتی میں کچھ فرمایا ہے۔

منو سمرتی ہندوؤں کی نہایت جامع اور مانع مذہبی کتاب ہے جس میں طرز معاشرت و تمدن کے صدہا قوانین درج ہیں اور خصوصاً عورتوں کے طریقہ رہائش کے متعلق اُنھوں نے جُدا باب قائم کیا ہے۔ اگر اُس زمانہ میں بیوہ عورتوں کا زندہ جلانا کسی طرح سے ضروری خیال کیا جاتا تو یہ دُور اندیش قانون داں اس کے متعلق کچھ لکھنے سے کیوں گریز کرتا۔

ہندوؤں کی بعض کتابوں میں لکھا ہے کہ برہمو اوتار کے جسم سے تمام فرقے ظہور میں آئے۔ سر سے برہمن بنے ہاتھوں سے چھتری یا کشتری۔ پیٹ سے ویش اور پاؤں سے شودر۔ اِس تقسیم کو مختلف ذاتوں اور ان کے فرائض سے جو مناسبت ہے وہ ظاہر ہے۔ لیکن برہمن برہمو کے دماغ سے ضرور بنے ہونگے۔ کیونکہ یہ فرقہ وقتاً فوقتاً اپنے

مفید مطلب سینکڑوں اُصول وضع کرتا رہا۔ ہندو اپنے مذہب کی باگ ڈور تو ان کے ہاتھوں میں دے ہی چکے تھے۔ برہمنوں نے جس جس طرف اشارہ کیا اُسی طرف چلتے رہے۔ چنانچہ رسم ستی کا اجرا انہیں کی طبع کا رہین منّت معلوم ہوتا ہے۔ برہمنوں نے ستی کے بہت سے آئین بھی مقرر کئے اُن میں سے دو قاعدے یہ تھے کہ کوئی عورت بغیر زیورات پہنے ستی نہیں ہو سکتی۔ اور ستی کے بعد اس کی راکھ کو سوا برہمن کے کوئی دوسرا ہاتھ نہیں لگا سکتا۔ چنانچہ ایک فرانسیسی سیاح نے اپنے سفرنامہ میں صاف طور سے لکھا ہے کہ ستی کے بعد برہمن راکھ سے سونا چاندی نکال لیا کرتے تھے۔

افسوس ان کی خودغرضی کی وجہ سے غریب عورتوں کو اپنے شوہروں کے مرنے پر دہکتی آگ میں لقمہ اجل ہونا پڑتا تھا۔ اور جب ایک خضر راہ سنجیدگی اور متانت کے ساتھ خودکشی کی تلقین کرے تو بھلا ایک کم فہم انسان کو کیا عار ہو سکتا ہے۔ صحیح طور سے گو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ستی کی رسم کس خاص زمانہ سے شروع ہوئی لیکن اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ یہ طریقہ قدیم سے رائج ہے اور اہل ہنود آخری زمانہ تک اس رسم کو بڑی پابندی سے ادا کرتے تھے۔

تبصرہ جات

جدید مطبوعات پر تبصرہ کرنا رسالہ شمع کا ضروری مقصد ہے ہم چاہتے ہیں کہ بذریعہ تبصرہ و تنقید اپنے ناظرین کو ملک کی دماغی محنتوں کے نتائج سے بہرہ مطلع کرتے رہیں تاکہ اچھی کتابوں کی خوبیوں سے پہلے ناظرین واقف رہیں اور ان کی کوششوں کے ساتھ خریدیں اس لحاظ سے کہ اس رسالہ میں نہایت توجہ کے ساتھ تبصرے لکھے جاتے ہیں رسالہ کے پڑھنے والے ملک کے بہترین حضرات ہیں انکو امید ہے کہ حضرات مصنفین و اہل مطابع اپنی مطبوعات ہمارے پاس بھیجنا ضروری فرض تصور فرمائیں۔

(منیجر)

افکارِ عالیہ

جناب پروفیسر مولوی وحید الدین صاحب سلیم

پیغام کس کا لائی تھی یارب! نسیمِ صبح
جو گل چمن میں تھا ہمہ تن چشم و گوش تھا
پرتو پڑا جو حُسن کا جسمِ خیال پر
عالم تمام اک سبدِ گُل فروش تھا
صُبحِ ازل کی پہلی کرن کا یہ تھا اثر
ہستی کا ذرّہ ذرّہ تبسم فروش تھا
تاروں کو اُس کے تیر اشاروں نے دی کمک
ورنہ یہ سازِ ہستیِ انساں خموش تھا

پہلو میں ہے تیرے وہ جسے ڈھونڈتا ہے تو
منزل میں بیٹھ۔ پاؤں اگر لنگ ہے تیرا
دَر اپنے دل کا کھول کے۔ دیکھ اُسکی وسعتیں
دُنیا کی اس فضا سے جو دل تنگ ہے تیرا
از راہِ طنز کہتے ہیں اہلِ سخن سلیم
دہلی و لکھنؤ سے جدا رنگ ہے تیرا

بکس رہی ہیں چمن میں کلیاں　لرز رہے ہیں فلک پہ تارے
کسی نے دیکھا نہ تھا ابھی تک　یہ جلوۂ بے نقاب تیرا

نہ میری کشتی کو چھو سکے گا　یہ تیرے قہر و غضب کا طوفان
کہو سمندر کی موج سے تم　عبث ہے یہ اضطراب تیرا

بہشت دیدار کا پتہ دے　اگرچہ دوزخ سے ہو گزرنا
رہے مبارک یہ تجھ کو واعظ!　عذاب تیرا ثواب تیرا

میری ہمت کے جو ذرّے تھے بکھر کر سمٹے
کیوں نہ ممنوں ہوں تری حوصلہ افزائی کا

تتلیاں اڑ گئیں انجام کو پریاں بن کر
شوق فطرت کو ہے ازبسکہ خود آرائی کا

جو خموشی میں مزا پایا ہے کیونکر ہو بیاں
ناطقہ بند ہے یارب! مری گویائی کا

ساقیٔ حسن سے جلوہ ذرا روک کے دے
کہ چھلکنے کو ہے ساغر مری بینائی کا

زندہ[۱] ریزوں کا جو ہے خون کے قطروں میں ہجوم
اک نمونہ ہے تری انجمن آرائی کا

۱؎ وہ ننھے ننھے کیڑے جو خوردبین کی مدد سے دکھائی دیتے ہیں۔ آنکھ سے نظر نہیں آتے۔

کشتیاں قوم کی قسمت کی الٹتی ہیں وہیں
اک تلاطم ہے جہاں عیش کے سامانوں کا
موشگافی ہے نظر ہیں۔ تو ذرا غور سے دیکھ
ریشۂ نے میں ہے انبوہ نیستانوں کا
میری کشتی گئی گرداب سے بچ بچ کے نکل
دیکھنا ہے ابھی تیور مجھے طوفانوں کا
گلگی ارنگ جو غفلت نے ہے مونھ پر پھیرا
یہی دیباچہ ہے ادبار کے افسانوں کا
بزم گردوں میں ستاروں پہ نظر کر غافل!
کوئی ساقی بھی ہے ان نور کے پیمانوں کا؟
آنچ آئیگی ترے در کے گدا پر نہ کبھی
طنطنہ خاک میں مل جائے گا سلطانوں کا

عشق و انسان میں ہے جو ربط۔ نہ مجھ سے پوچھو
مشتِ خس پر ہے یہ اک شعلہ کا لرزاں ہونا
حسن کامل ہو۔ تو ہے آج بھی ممکن غافل!
پارۂ سنگ کا پھر لعل بدخشاں ہونا
بعدِ مُردن جو کھلی آنکھ تو معلوم ہوا
ساری بیداری کا اک خواب پریشاں ہونا۔

قابلیت ہو تو فطرت کو ذرا بخل نہیں
ایک ریشہ سے بھی ممکن ہے نیستاں ہونا

غفلت کی بیخودی یہ کب تک رہے گی اے دل۔
سو بار گر چکا ہے۔ اک بار تو سنبھل جا
چہرہ پہ مُردنی سی چھائی رہے گی کب تک
اُٹھ اور زندگی کے سانچے میں اُٹھ کے ڈھل جا
دیکھیں تو زندہ کیونکر رہتا نہیں تو اے دل
میری سُنے تو ناداں اُٹھتے ہی پر مچل جا
ایسی حیاتِ شیریں سب کو نہیں میسّر
دُنیا کی تلخیوں کے گھونٹ ایکدم نگل جا

سلیم

العجاب

مترجمہ

جناب مولوی عبدالحمید صاحب نعمانی مالی گاؤنی

"مصر کے مشہور انشاپرداز لطفی منفلوطی ممکن ہے ہندوستان کے دائرہ ادبا میں محتاج تعارف ہوں لیکن بلاد عرب کا کوئی ادبی حلقہ ایسا نہیں جو موصوف سے بیگانہ ہو، آپ نے متعدد ادبی کتابیں اپنے مخصوص طرز تحریر میں تصنیف فرمائی ہیں جو عام مقبولیت کی دولت سے مالا مال ہیں۔ آپ کے جادو نگار قلم نے قوم سے "امیر النثر العصری" کا خطاب حاصل کیا، فاضل موصوف کی جس مشہور کتاب کا ایک مضمون ہم ناظرین کے پیش نظر کرنا چاہتے ہیں۔ اس کا نام العبرات ہے"

العبرات چھوٹے بڑے آٹھ مضامین کا ایک دردناک مجموعہ ہے جسے آٹھ آنسو کہنا چاہیئے، جو قوم کے "مختلف معاشرتی و اخلاقی نقائص پر بہائے گئے ہیں، ان میں سے چار تو خود موصوف کی آنکھوں سے ٹپکے ہیں اور چار غیر کی آنکھوں سے، پیش خدمت مضمون موصوف کا طبعزاد ہے

(مترجم)

ہمارے فلاں دوست یورپ تشریف لیگئے، اور ہمیں ان سے کچھ شکایت نہ تھی، کچھ دنوں وہاں رہکر واپس آئے اب ان میں پہلی ایک بات بھی باقی نہیں۔ جاتے وقت ان کا چہرہ کسی دوشیزہ عروس کی طرح تھا؟ آئے ہیں تو

ایک چکنی چٹان کا سا چہرہ ہے جاتے وقت ان کے پہلو میں ایک
پاک وصاف دل تھا جو ہر گذر سے مانوس عفو ومعذرت سے آشنا تھا۔ آئے ہیں تو
وہ غضبناک دل لیکر کہ ارض وساکنان ارض آسمان وخالق آسمان سب پر تیور بدلے
ہیں، جاتے وقت خشوع وخاکساری کے مجسمہ تھے کہ ہر شخص کو اپنے سے بڑا جانتے تھے
آئے ہیں تو بس ہمچوں من دیگرے نیست شاید بھولے سے بھی ایک نظر پاؤں پر نہیں پڑتی
جاتے وقت عقل وحکمت سے بھرا سر لیگئے تھے آئے تو کھوکھلے مجسمہ کا سا سر ہے
جو آنے جانیوالی ہوا سے بجتا ہے، جاتے وقت تمام کائنات میں محبوب ترین دین وطن تھا،
آئے ہیں تو یہی دونوں ان کیلئے دنیا کی سب سے زیادہ حقیر وذلیل چیزیں ہیں۔

دیار مغرب سے آنیوالے ان نوجوانوں کی تبدیل شدہ صورتوں کو دیکھکر میں یہ سمجھتا
تھا کہ یہ درحقیقت ایک کچا رنگ ہے جو کسی طرح پائدار نہیں آفتاب مشرق طلوع ہوتے
ہی اسکو اس طرح اڑا دیگا کہ گویا تھا ہی نہیں، میرا خیال تھا کہ یورپ سے آنیوالے کا مغربی
تمدن سے ایسا ہی تعلق ہے جیسے آئینہ اور چہرہ کا کہ اگر آئینہ ہٹا لیا جائے تو چہرہ بھی
غائب ہو جائیگا، اس خبط خیالی کی بناء پر میں اپنے دوست کی یورپ پرستی کے فاسد
اطوار اور وحشتناک تصویرِیت کی مصیبتیں سہتا رہا اور سابق عہد یگانگت میں مطلق فرق نہ آنے
دیا، تا آنکہ ایک رات نہایت الم انگیز وحسرت خیز حادثہ پیش آیا اور وہی رات میری خبط
خیالی کی آخری رات تھی۔

ایک روز جب میں ان کے گھر گیا، انہیں کبیدہ خاطر اور خاموش پاکر سلام کے
بعد مزاج پرسی کی اشارۂ جواب سلام کے بعد کہنے لگے کیا کہوں اس عورت نے سب
رات سے پریشان ہوں اور رہائی کی کوئی سبیل نظر نہیں آتی میں نے کہا۔ کون عورت

کہنے لگے یہی جسے لوگ میری بیوی کہتے ہیں اور میں تو اسے ایک مستحکم چٹان کہتا ہوں
جو میرے مقاصد کی راہ میں پڑی ہے میں نے کہا آپ کے مقاصد کی فہرست تو بہت لمبی چوڑی
ہے آخر کس مقصد کی طرف اشارہ ہے کہنے لگے میں اپنی پوری زندگی میں صرف ایک
امید رکھتا ہوں اور وہ یہ کہ ایک مرتبہ آنکھ بند کروں اور پھر کھولوں تو مجھے قوم کی ایک
عورت بھی برقعہ پوش نظر نہ آئے میں نے کہا یہ تو شاید تنہا آپ کے بس کی بات نہیں
کہنے لگے بہت سے لوگ میرے ہمخیال ہیں اور ان کے دلوں میں وہی تمنا ہے جو میرے
دل میں ہے لیکن ضعف و پست ہمتی اور مرعوبیت جو ہمیشہ سے ایشیائی دماغ کیلئے
کسی نئی بات پر پیشقدمی کرنے سے روکتی چلی آئی ہے آج بھی سنگ راہ ہے۔ میں چاہتا
ہوں کہ عاد و ثمود کے وقت کی پرانی عمارت کو جو ایک زمانہ سے قوم کی فلاح و بہبود کے درمیان
دیوار کی طرح حائل ہے سب سے پہلے ڈھا دوں اور وہ کام میرے ہی ہاتھوں انجام پا جائے
جو آج تک حریت و آزادی کے بڑے بڑے لیڈروں سے بھی طے نہ ہو سکا اسی لئے
میں نے اپنی بیوی کے سامنے یہ بات پیش کی مگر وہ تو اسے ایک مصیبت کبریٰ تصور کرتی ہے،
اس کا خیال ہے کہ اگر وہ مردوں سے بے پردہ ہو جائے تو شرم و حیا کے مارے عورتوں کے
سامنے نہیں ہو سکتی اور یہ درحقیقت نہ کوئی شرم ہے نہ حیا، لیکن ذلت غفلت
اور جمود کا وہ تسلط .... خدا نے ان پر قائم کیا ہے کہ یہ عورتیں اپنی زندگی کے کچھ دن پردے
کی تاریک قبروں میں بسر کریں تا آنکہ موت آکر مقابر کے تنگ گوشوں میں پہونچا دے
اور یہ ایک قبر سے دوسری قبر میں منتقل ہو جائیں، پس میں نہایت ضروری سمجھتا
ہوں کہ اپنی کامیابی کیلئے بلیغ کوشش کروں اور (بیوی کے سر کی طرف اشارہ
کرکے) اس محروس دماغ کے علاج و معالجہ سے اس نتیجے پر پہنچوں کہ یا تو شفا حاصل ہو جائے

یا ہمیشہ کیلئے یہ کاسئہ سر ٹوٹ جائے۔
یہ سُنکر میرا دل غم و الم سے بھر آیا حسرت بھری ترحم آمیز نگاہوں سے میں نے اسے دیکھا اور کہا محبِ من! جو کچھ آپ کہتے ہیں کیا آپکے نزدیک یہ مسلّم امر ہے؟ کہنے لگے جی ہاں یہ حقائق میرے مسلّمہ معتقدات میں! میں نے کہا اجازت ہو تو میں پوچھوں کہ مدت تک جناب ایک بے حجاب قوم کے درمیان رہ چکے ہیں کیا آپ کو یاد ہے کہ آپ کے دل نے کبھی کسی غیر مملوک شے کی طامعانہ رغبت کی ہو اور حصول مالک کی لاعلمی و بے خبری میں وہ مطلوب شے آپ کو حاصل ہو گئی ہو کہنے لگے ہاں مجھے یاد ہے اکثر ایسا ہوا۔ پھر اس سے آپ کا مقصد؟ میں نے کہا مجھے آپ کی شرافت و آبرو کے متعلق یہ خوف ہے کہ اوروں کی طرح آپ کیساتھ بھی کہیں کوئی بُرا سلوک نہو۔ کہنے لگے ایک شریف عورت مردوں میں بے پردہ رہکر بھی اپنی شرافت و عصمت کے بلند و مستحکم قلعہ میں اسطرح رہ سکتی ہے کہ کوئی گردن اسکی طرف نہ اُٹھ سکے۔ یہ سُنکر میں بے تاب ہو گیا اور کہنے لگا یہی وہ دھوکا ہے، جسے شیطان کی فریب کاریاں تمہارے جیسے سطحی دماغ رکھنے والوں کے دلوں میں پیدا کرتی ہیں، شرافت ایک لفظ ہے جس کا وجود صرف لغت کی کتابوں میں باقی ہے، انسان کے صفحہ قلب سے یہ پاک نقش مٹ چکا، نفس انسانی کی مثال ایک محدود و مختصر تالاب کی ہے جو اگرچہ بالکل صاف و شفاف رہتا ہے۔ لیکن جب کوئی پتھر اسمیں آگرتا ہے تو ساری صفائی کی عمارت تارِ عنکبوت کا حکم رکھتی ہے عفت و عصمت کا شمار نفوس بشری کے جواہر میں نہیں بلکہ الوان میں ہوتا ہے، یہ محترم شے نفس انسانی کے رنگوں میں ایک رنگ ہے، اور ظاہر کہ آفتاب درخشاں کی تمازت شعاعوں کے مقابلے میں

رنگ کی کمزور ہستی کب تک قایم رہ سکتی ہے۔ کہنے لگے تو کیا آپ انسان میں شرافت کے وجود سے منکر ہیں؟ میں نے کہا مجھے انکار تو نہیں کیونکہ میں جانتا ہوں کہ کمزوروں، گنواروں اور سادہ لوح طبقوں میں اب تک شرافت کا وجود ہے لیکن ہاں صاحب مقدرت، عیار، شاطر مرد اور مہذب، خلیق، ملنسار۔ اور چالاک عورت کے مابین اگر پردہ نہو تو اسوقت مجھے شرافت کے وجود کا یقیناً انکار ہے۔

آخر اس شہر کی کس حصّہ میں آپ چاہتے ہیں کہ عورتیں مردوں سے بے پردہ ملیں۔؟

کیا مدارس کے طلبا کی فضا میں؟ جنکا یہ حال ہے کہ جب کوئی ان سے پوچھتا ہو کہ میاں شادی کیوں نہیں کرتے تو جواب ملتا ہے کہ قوم کی کل عورتیں ہماری ہی عورتیں ہیں یا یورپ سے آنیوالے طلبا کی فضا میں؟ حالانکہ ان میں سے ہر ایک کا ہینڈ بکس (صندوق) دلبران یورپ کی متعدد تصاویر نیز سیکڑوں عشق و محبت کے خطوط سے پر ہے جنہیں وہ اپنے احباب سے شرم و حیا کے مارے چھپاتا ہے

معلّمین و مدرّسین کے فضا میں؟ درحالیکہ شعبہ تعلیم و تربیت میں تلامذہ کے متعلق انکی وہی رائے ہے جو ایک تیوسی کی اولاد صلبیہ کے متعلق۔

یا عوام کی پر شور فضا میں؟ جنہیں اکثر انکا حال یہ ہے کہ گھروں میں ذلیل خادم بنکر داخل ہوتے ہیں اور محترم داماد بنکر نکلتے ہیں۔ عورتوں کی تہذیب و گفتگو حجاب و بے پردگی آزادی و قید، غرض پورے عالم نسواں کیساتھ اس انتہائی شفقت و پرداخت کے آخر کیا معنی؟ کیا قوم کے جملہ حقوق و درجات کی ادائیگی تنہا آپ ہی لوگوں کے سر ہے، غیر اس نعمت سے بالکلیہ محروم ہیں؟ ۔ (

عورتوں کو مہذب بنانے سے پہلے مردوں کو مہذب بناؤ اگر مردوں کی تعلیم و تربیت سے تم عاجز ہو تو عورتوں کی تہذیب و تربیت سے عاجز تر۔

نہارے سامنے عزت و افتخار کے اور بہت سے دروازے ہیں، ان میں سے جسکو جی چاہے کھٹکھٹاؤ۔ کھولو مگر اس دروازے کو اسی طرح مقفل چھوڑ دو، ورنہ یاد رکھو اگر اس کا قفل کھُل گیا تو ایک طویل شقاوت، اور مستمر بدبختی کا سامنا ہوگا۔

مجھے ایک مرد بھی ایسا بتاؤ جو کسی چاہنے والی عورت کے سامنے بزعم خود اپنی خواہشات پر قادر اور صابر رہ سکتا ہو لیکن میں اس بات کی تصدیق کروں گا کہ ایک عورت اپنے چاہنے والے مرد کے روبرو اپنی شرافت پر ثابت قدم رہ سکتی ہے۔

تم دیدہ و دانستہ عورت کو ایک ایسی بات پر مجبور کرتے ہو جس سے خود عاجز ہو تم اس سے وہ مطالبہ کرتے ہو جس پر خود قادر نہیں زندگی کی منڈی میں تمہاری ایسی تجارت ہے، جس کے متعلق تمہیں نہیں معلوم کہ نفع ہوگا یا نقصان، اور پیچھے تو منفعت کی امید نہیں،

عورت نے کبھی اپنی مظلومیت کی شکایت تم سے نہیں کی، نہ اس نے کبھی قید و بند سے آزادی کا مطالبہ کیا، پھر تمہاری یہ مداخلت کیا معنی رکھتی ہے؟

ہاں عورت کو اگر شکایت ہے تو تمہاری فضولیات سے، تمہاری بیہودگیوں سے۔ شکوہ ہے تو تمہاری غاصبانہ کارروائیوں سے، تم ہر وقت اس کے پیچھے

پڑے رہتے ہو جہاں کہیں جاتی ہے تم اسکے سامنے ہوتے ہو، حتی کہ وہ عالم ہستی کی بسیط فضا کو اپنے حق میں ایک تنگ دائرہ سمجھ کر خود کو گھر کی چار دیواری میں قید کر دیتی ہے، اس پر مستزاد اعزا و اقربا کی تاکید پردہ نشینی، اب وہ تمہارے ہاتھوں قید در قید اور بند در بند ہے، تعجب ہے کہ تم نے ہی اسے قید خانہ تک پہونچایا اور تمہیں اسکی شقاوت اسیری پر آنسو بہاتے ہو۔

تم نے اپنی گذشتہ زندگی کے کچھ دن ایک ایسے دیار میں گزارے ہیں۔ جہاں کی فضا سراپا زینت و ظہور ہے، جہاں بے پردگی و نمائش کا دریا بہتا ہے، جہاں آزادی و خودمختاری کا فوارہ چلتا ہے، اب عالم نسوانی پر اس مرثیہ خوانی، اس حسرت آمیز چیخ و پکار سے تمہارا مقصد یہ ہے کہ وہ چھوٹی ہوئی مزین فضا ظہور و نمائش کا وہ بہتا ہوا دریا، آزادی حریت کا وہ چلتا ہوا فوارا اپنے دلکش مناظر کیساتھ پھر آنکھوں کے سامنے آجائے۔

عصمت و عفت ہمارے ساتھ برقعوں میں مشک کی طرح بندھی تھی مگر تم اسے روزانہ چھیدتے رہے اور عفت قطرہ بنکر ٹپکتی رہی تا آنکہ بچ گئی پھر بھی تمہارے لئے کافی نہوا، اور آج چاہتے ہو کہ اس کا بند بھی کھول دیا جائے تاکہ ایک قطرہ بھی باقی نہ رہے۔

مصری عورت کا ایک زمانہ تھا جب وہ نہایت سکون و اطمینان کی زندگی بسر کرتی تھی، وہ اپنی پوری سعادت اس بات میں سمجھتی تھی کہ متعلقہ فرائض انجام دیدے یا چند لمحے اپنے مجازی خدا کی خدمت میں رہے۔ یا کچھ دیر بچوں کیساتھ پیار و الفت میں مصروف رہے، یا اپنی پڑوسن کے پاس قلبی مسرت کے اظہار میں کچھ وقت

گزار دے، اس کیلئے عزت وافتخار کا جلیل ترین مرتبہ یہ تھا کہ اپنے باپ کی خادمہ اور اپنے شوہر کی تابعدار رہے وہ محبت کے معنی سے آشنا تھی لیکن عشق و آشفتگی سے بے خبر بس وہ اپنے شوہر سے محبت کرتی تھی اس لئے کہ وہ اس کا شوہر تھا، جس طرح اسے اپنے بچوں سے محبت تھی اس لئے کہ وہ اسکے بچے تھے

زاہدہ چمکی نہ تھی انگلش سے جب بیگانہ تھی
اب ہے شمع انجمن پہلے چراغ خانہ تھی

(اکبر)

تم نے اسے تعلیم دی کہ اعزا و اقربا کو عورت کے معاملات میں جابرانہ مداخلت اور مستبدانہ کار فرمائی کا کوئی حق حاصل نہیں، اور نہ وہ عقل و فضل میں کچھ بڑا مرتبہ رکھتے ہیں، بلکہ عورت اپنے خیر و شر کی خود زیادہ عالم ہے اب کیا تھا، اس نے اپنے باپ کی نافرمانی کی، شوہر سے تمرد و سرکشی برتیں۔ وہ گھر جو کل تک عروسانہ مسرتوں کے ساتھ ہنس رہا تھا۔ آج ایک مستقل ماتم خانہ بنگیا جس میں آتش نوحہ کی شعلہ انگیزی و شرر خیزی روز بروز ترقی پر ہے۔

تم نے اسے سکھایا کہ عورت کو اپنا شوہر خود پسند کرنا چاہیئے' تاکہ رشتہ داروں کی فریب کاریوں سے حفاظت ہو سکے۔ اس کا انتخاب اقربا کے انتخاب سے بھی بدتر ثابت ہوا۔ اور اس مسکین کے لطف شباب کی عمر پہلی رات اور پہلے دن سے زیادہ وفا نکر سکی، اس کے بعد شقاوت اور بدبختی کے عذاب الیم میں مبتلا ہو گئی۔

تم نے اسے محبت کی تعلیم دی، اور باہم میل و ملاپ ارتباط و محبت کو اساس ازدواج بتایا، نتیجہ یہ ہے کہ بیاہ و شادی تو دور رہی اسے چاہنے والوں کی تلاش ہی سے فرصت نصیب نہیں ہوتی۔

تم نے حیات نسوانی کی بدترین سعادت کا نقشہ اس کے سامنے یہ کھینچا کہ عورت کا شوہر اس کا عاشق ہو، اب وہ غریب جو ہمیشہ سے اس کی معتقد ہے کہ شوہر غیر عاشق ہوتا ہے، روزانہ ایک نئے شوہر کی فکر میں رہتی ہے جو سابق حیات مردہ کیلئے زندگی بخش ثابت ہو اس طرح نہ قدیم باقی رہا اور نہ جدید سے کچھ نفع ہو سکا۔

تم نے اس سے کہا کہ تعلیم نہایت ضروری ہے، تاکہ اولاد کی تربیت اور سیاست منزل کے کل کام باحسن وجوہ انجام پا سکیں، ماشاء اللہ اس نے جملہ علوم و فنون میں مہارت حاصل کر لی باستثنائے علم تربیت و انتظام خانہ داری

تم نے اس سے کہا کہ ہم اسی عورت کو اپنی زوجیت میں قبول کرینگے، جسے خود پسند کریں، جو ہمارے شعور و ذوق کے مناسب ہماری حیات و اعیات کے مطابق ہو، اب اس کیلئے ضروری تھا کہ ان مواقع سے مطلع ہو جو آپ کی خواہشات کے مظہر ہوں، ان مناظر سے باخبر ہو جنھیں آپ کی آنکھیں پسند کرتی ہیں، جب اس نے آپ کی کتاب زندگی کا ایک ایک صفحہ دیکھا۔ آپ کے اعمال و مرغوبات کی فہرست اس کے مطالعہ سے گذری تو وہ اس نتیجہ پر پہونچی کہ آپ عورت کی ذکاوت و فطانت کے بڑے مداح و شیدا ہیں، نیز حسب ذیل عورتیں آپ کی محبوبہ بن سکتی ہیں۔

الخلیعات ۔ بے شرم و بے حیا، بیہودہ۔

المستہترات۔ شتر بے مہار، آزاد، خود مختار، بے پردہ، ذلیل، بے آبرو۔

الضاحکات الاعبات ۔ مصروف مذاق و مضحکہ،

پس اس نے آپ کیلئے حیا کا دامن چاک کیا معاشرت میں حریت و آزادی

کر لیک کہکر اپنے کو اس رقیق و شفاف پوشاک میں آپ کے سامنے اس طرح پیش کیا جس طرح نخاس لونڈی کو غلاموں کے بازار میں پیش کرتا ہے، اب تم اس سے اعراض کرتے ہو اور کہتے ہو کہ آبرو ریختہ عورتوں کو زوجیت میں نہیں لا سکتے، ایسی حالت میں اس ناکام کیلئے بجز سقوط (بازاریت) اور کوئی راستہ نہیں جس پر وہ چل کھڑی ہوتی ہے۔

عورت پر آپ کا یہی رحم و کرم ہے، یہی آپ کے الطاف و عنایات میں جنس لطیف کے نازک حالات پر آپ کی مرثیہ خوانی و نوحہ گری کی حقیقت یہی ہے

تمہاری طرح ہم بھی جانتے ہیں کہ عورت علم کی محتاج ہے اسے ذاتی تہذیب و تربیت کی ضرورت ہے لیکن اس ضرورت کو اس کا باپ پورا کرے یا اس کا بھائی ہمیں اس امر سے بھی انکار نہیں کہ شوہر عادل اور مخلص ہونا چاہیئے، لیکن یہ والدین کا فرض ہے کہ انتخاب در جانچ میں کوتاہی نکریں، یہ شوہر کا فرض ہے کہ حسن معاشرت کو نظر انداز نہ کیا جائے، ہمیں یہ بھی تسلیم ہے کہ عورت کیلئے سیر و تفریح ضروری ہے، اور لطف زندگی کے حصول میں مناظر قدرت سے متمتع ہونے کی وہ جائز حقدار ہے، لیکن کیوں نہ یہ مسئلہ سرپرستوں کی اجازت سے طے ہو، کیوں نہ ایک محرم کا ساتھ ہونا ضروری سمجھا ئے، جو آمد و رفت میں چرواہے کی طرح اپنی بکریوں کو بھیڑیوں سے بچائے، اگر ہم عورت کے سرپرستوں والدوں، بھائیوں اور شوہروں سے اتنا بھی نہیں کرا سکتے تو ہمیں پوری قوم کی اصلاح سے ہاتھ اُٹھا لینا چاہیئے، اس لئے کہ عورت اصلاح نفس اور

ذاتی تہذیب و تربیت میں مرد سے زیادہ قادر العمل نہیں۔

سب سے زیادہ مجھے تعجب اس بات کا ہے کہ تم نے سب کچھ سیکھا لیکن جو چیز تمہارے ادراک و احساس کے قریب بلکہ قریب تر تھی اور جسے سب سے پہلے سیکھنا چاہیئے اس سے بے خبر ہو اور وہ یہ کہ ہر گھاس کی ایک گھاز مین ہوتی ہے جس میں وہ اگتی ہے اور ہر گھاس کا ایک وقت ہوتا ہے جسمیں وہ نشو نما پاتی ہے۔

تم یورپین فاضلوں کو ایک ایسی قوم کے درمیان جو ضروریات زندگی سے فارغ ہو چکی ہے۔ علوم و فنون کی انتہائی فضا میں پرواز کرتے ہوئے دیکھکر انکی تقلید ایک ایسی قوم میں کرنا چاہتے ہو جس کا سواد اعظم تعلیم ابجد کا محتاج ہے اوسکا غالب حصہ حروف تہجی کا بھی صورت شناس نہیں۔

تم نے یورپ میں فلاسفہ کو ایک ایسی قوم میں کفر و دہریت کا فلسفہ پھیلاتے دیکھا جو اپنی معقولیت و اہلیت کی بنا پر ایمان کی حفاظت کر سکتی ہے ان کا تتبع تم ایک سادہ لوح، ضعیف الراے قوم میں کرنا چاہتے ہو جسے ایمان کی حفاظت کا کوئی سامان میسر نہیں۔

تم نے ایک یورپین شخص کو دیکھا کہ وہ نہایت آزادانہ زندگی بسر کرتا ہے۔ اپنے اشتغال و اعمال میں بالکل مطلق العنانی سے کام لیتا ہے، اس لئے کہ وہ اپنے مقرر کردہ حدود حریت سے تجاوز نکرنے پر قادر ہے، یہی آزادی تم اس شخص کو عنایت کرنا چاہتے ہو جو ارادہ کا کمزور اور مغلوب ہے اور لغزش کے بعد سنبھلنا بھی نہیں جانتا،

تم نے دیکھا کہ ایک کمسن سال تجربہ کار یورپین شوہر جسکی مزاجی خشونت اور

سختی زمانہ کے ہاتھوں سلب ہو چکی ہے، اس امر پر قادر ہے کہ اسکی بیوی جس سے جی چاہے ملے جلے، جسکے ساتھ چاہے آئے جائے، خلوت میں من مانی ملاقاتیں کرے، اور وہ ٹھوس بنا یہ کل مناظر دیکھتا رہے تو تمہارا یہ خیال ہے کہ ایک حساس غیرتمند مشرقی کے پیش نظر بھی یہی حیاسوز مناظر ہوں اور وہ اسی طرح استقلال سے دیکھتا رہے۔

تم نے کسی یورپین، خوددار اور جری عورت کو دیکھا کہ بعض مواقع میں مردوں کے ساتھ خلط ملط کے بعد بھی معصوم باقی رہی، تو امید کرتے ہو کہ مصر کی سادہ لوح اور مغلوب الارادہ عورتیں مردوں میں مل جل کر بھی اپنے کو چاک دامانی سے بچالیں گی۔

ہر وہ گھانس جو کسی غیر زمین یا مخالف وقت میں بوئی جائیگی، یا تو زمین کا اختلاف اسے کھالیگا یا موسم اور وقت کی مخالفت اس کو برباد کردیگی۔

ہم حرمت ملی و شرف وطنی کا واسطہ دیکر تم سے التجا کرتے ہیں کہ قوم کی رہی سہی عورتوں کو ان کے گھروں میں امن وچین سے رہنے دو اور اپنے خواب و خیال کی بنا پر ان کو کبیدہ خاطر اور پریشان نکرو۔ اس لئے کہ قوم کے ہر زخم کا مرہم موجود ہے، اگر کوئی لاعلاج زخم ہے تو عزت و خودداری کا فقدان اور انکا ضائع ہو جانا۔ اس کے بعد بھی اگر تمہارا اصرار و انکار باقی ہے تو کچھ دن اور انتظار کرو تا آنکہ یہ آبائی غیرت جو تمہارے سینوں میں وراثتہً چلی آئی ہے نکل جائے، پھر تم اپنے نئے دور حیات میں سعادت و امن کی زندگی جیو۔

ان سب باتوں کا اثر ہمارے مغرب پرست نوجوان پر اس سے زیادہ کچھ نہوا کہ وہ

وہ تمسخر آمیز تبسم کے بعد یہ فرمانے لگے کہ انہیں حماقتوں کے مٹانے کے لئے تو ہم آئے ہیں، اور اسوقت تک کوشش کرتے رہیں گے، جب تک خدا کا فیصلہ معاملہ طے کردے میں نے کہا تو اب آپ جانیں اور آپ کی بیوی جو جی چاہے کیجئے، اور مجھے اجازت دیجئے، کہ آپ سے یہ کہدوں کہ میں آئندہ راہ ورسم جاری نہیں رکھ سکتا اس لئے کہ میری موجودگی میں آپ کے زنانہ کمرے کے کسی گوشہ کا کھلنا میری موت کا مرادف ہے۔

کچھ ہی روز بعد میں نے لوگوں کو یہ کہتے سنا کہ فلاں صاحب نے اپنے گھر میں پردہ اٹھالیا، اور اب احباب کی بے تکلفانہ ملاقاتوں کا سلسلہ ٹوٹتا ہی نہیں، یہ سنکر میری آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے، میں نہیں جانتا یہ غیرت کا آنسو تھا یا ایک گم شدہ دوست کے غم کا۔

تین برس کی طویل مدت گزر چکی نہ میں ان کی ملاقات کرتا ہوں نہ وہ میری راستوں میں چلتے چلاتے بھی دیکھنے کا بہت کم اتفاق ہوتا ہے، اور جب کبھی مل جاتے ہیں تو اجنبی کی طرح علیک سلیک ہوجاتی ہے، اور بلا کسی سابق عہد کے ذکر کے میں اپنے راستے چلا جاتا ہوں اور وہ اپنے راستے۔

کل کی رات جب میں اپنے گھر آرہا تھا، راستہ میں انہیں مضطربانہ رفتار سے جاتے دیکھا، ساتھ ہی ایک پولیس مین بھی تھا، یہ معلوم ہوتا تھا کہ پولیس مین انہی حراست میں کہیں لے جارہا ہے، یہ دیکھ کر میں ان کے پاس گیا، اور پوچھا خیر تو ہے کہاں جارہے ہو، کہنے لگے اس سے زیادہ مجھے کچھ نہیں معلوم کہ یہ پولیس مین ابھی میرے پاس آیا اور پولیس اسٹیشن میں حاضر ہونے کے لئے کہا، مجھے افیسر کی اس طلبی کا

مطلب معلوم نہیں ہوتا، میں کوئی مشتبہ آدمی نہیں اور نہ مجرم۔ کیا میں اپنے قدیم مخلص سے امید کرسکتا ہوں کہ وہ اسوقت میرا ساتھ دے۔ شاید مجھے وہاں پہونچکر کسی قسم کی ضرورت پڑے، میں نے کہا میرے لئے اس سے بڑھ کراور کیا ہوسکتا ہے! یہ کہکر میں ان کے ساتھ ہولیا، اب نہ وہ مجھ سے کچھ بولتے ہیں اور نہ میں ان سے میں نے یہ محسوس کیا کہ مجھ سے بولنا چاہتے ہیں لیکن شرم وحیا بولنے نہیں دیتی" میں نے خود گفتگو شروع کردی اور کہا، کیا اب تک اس بے وقت طلبی کی کوئی معقول وجہ آپ کے ذہن میں نہیں آئی، انہوں نے مجھ پر ایک مضطربانہ نگاہ ڈالی اور کہا سب سے زیادہ مجھے اس بات کا خوف ہے کہ اس رات میری بیوی کے سر کوئی مصیبت نہ آئی ہو، کیونکہ آج اب تک وہ مکان نہیں پہونچی حالانکہ وہ ذرا تا اپنے وقت پر گھر پہونچ جایا کرتی تھی، میں نے کہا کیا اس کے ساتھ کوئی نہیں فرمایا نہیں، میں نے کہا کیا آپ یہ بھی نہیں جانتے کہ وہ کہاں گئی ہے کہنے لگے نہیں، میں نے کہا پھر آپ کو خوف کس بات کا ہے؟ کہنے لگے اندیشہ صرف اسی قدر ہے کہ وہ سادہ لوح اور غیرت مند عورت ہے ممکن ہے راستہ میں کسی نے چھیڑ چھاڑ کی ہو اور اس نے خشونت اور درشتی کیساتھ اس کا جواب دیا ہو، جس سے کوئی وقوعہ رونما ہوا ہو اور کوتوالی تک نوبت پہونچی ہو، اب ہم پولیس اسٹیشن تک پہونچ چکے تھے پہونچتے ہی ہم افیسر کے کمرہ میں پیش کئے گئے، افیسر نے پولیس سے اشارۃً کچھ کہا جسے ہم نہ سمجھ سکے، اس کے بعد افیسر نے میرے دوست کو قریب بلاکر کہا میں نہایت رنج کیساتھ آپ سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آج کی رات کوتوالی کے جوانوں نے ایک مرد وعورت کو غیر مناسب حالت میں مشکوک مقام پر پایا، اور داخل حوالات کردیا

عورت کا بیان ہے کہ اسکو آپ سے کچھ قرابت ہے، لہذا آپ کو تکلیف دی گئی، کہ حقیقت حال سے اطلاع ہو، اگر یہ صحیح ہے کہ اس کو آپ سے قرابت ہے جو ہمیں جناب کی عزت و شرافت ملحوظ رکھتے ہوئے آپ کیساتھ رخصت کر دینے میں کچھ عذر نہ ہوگا ورنہ وہ سزایاب ہوگی، دیکھئے وہ دونوں آپ کے سامنے کھڑے ہیں، مڑ کر دیکھا تو عورت آپ کی بیوی اور مرد آپ کے ایک دوست تھے، دیکھتے ہی اس نے زور سے چیخ ماری کہ اسٹیشن گونج اٹھا اور ساتھ ہی میرا دوست غش کھا کر زمین پر گر پڑا میں نے افیسر سے کہکر عورت کو اس کے باپ کے گھر روانہ کیا، دوست داخل حوالات ہوئے اور سواری بلا کر اپنے دوست کو گھر لایا۔ فوراً ڈاکٹر بلوایا جس نے تشخیص کی کہ مریض سخت دماغی بخار میں مبتلا ہے رات بھر وہ غریب علاج و معالجہ میں لگا رہا صبح سے کچھ بیشتر یہ کہکر واپس گیا کہ اگر ضرورت ہوئی تو میں پھر ہو جاؤنگا اور مجھے تیمارداری کی سخت تاکید کر دی ۔

اب میں اپنے دوست کے پاس بیٹھا، اور اس کی حالت زار پر مرثیہ پڑھتا ہوا قضائے خدا وندا کا انتظار کرتا رہا، اتنے میں مریض نے حرکت کی اور آنکھیں کھول دیں، مجھے دیکھنے لگا اور دیر تک دیکھتا رہا، گویا مجھ سے کچھ کہنا چاہتا تھا اور کہہ نہ سکتا تھا میں نے اس سے بالکل قریب ہو کر کہا آپ کو کچھ ضرورت ہے؟ جواب ملا میں چاہتا ہوں کہ میرے پاس کوئی نہ آئے میں نے کہا آپ کی مرضی کے خلاف یہاں کوئی نہیں آسکتا، تھوڑی دیر بعد میں نے دیکھا اسکی دونوں آنکھوں سے آنسو جاری ہیں، پوچھا آپ روتے کیوں ہیں؟ کہنے لگے آپ کو معلوم ہے کہ میری بیوی

اسوقت کہاں ہے؟ میں نے کہا آپ اس سے کیا چاہتے ہیں؟ کہنے لگے کچھ نہیں، صرف اس قدر کہنا چاہتا ہوں کہ میں نے اسے معاف کیا، میں نے کہا وہ اپنے باپ کے گھر ہے کہنے لگے قابل رحم ہے وہ اور اس کا باپ اور اس کا سارا گھرانا اس لئے کہ مری قرابت سے پہلے وہ سب کے سب شریف اور عزت دار تھے مگر اپنے انتساب کے بعد میں نے انہیں ذلت و عار کا لباس پہنایا۔

کون ہے جو مری طرف سے انہیں مطلع کردے کہ میں بیمار قریب الموت ہوں، میں ڈرتا ہوں کہ خدائے قہار و جبار کے روبرو ان کے خون کا بوجھ اپنی گردن پر لئے جاؤں، میں روتا ہوں گڑگڑاتا ہوں کہ موت سے پہلے وہ میرا گناہ معاف کر دیں۔

میں نے عقد کے وقت اس کے والد سے قسم کھا کر کہا تھا کہ بیوی کی عزت و حرمت کی حفاظت جان کی طرح کروں گا، میں اسے ہر اس چیز سے بچاؤں گا جس سے خود بچوں گا، آہ میں نے قسم توڑ دی تو کیا اس کے والد میرا گناہ معاف کردینگے، تاکہ خدا بھی معاف کردے۔

آہ میری بیوی نے مجھے قتل کر دیا، لیکن وہ خنجر اس کے ہاتھ میں میں نے ہی دیا تھا جسے اس نے میری ہی سینے میں اتار دیا۔ پس میرے جرم کی ذمہ داری اس پر نہیں ہو سکتی۔

گھر میرا گھر تھا، بیوی میری بیوی تھی، اور دوست میرا دوست تھا، پھر میں نے اپنے دوست کے لئے گھر کا دروازہ کھولا اور بیوی تک پہونچا دیا۔ خطا میری ہے

اور صرف میری۔

پھر کچھ دیر تک خاموش رہا میں نے دیکھا کہ ایک سیاہی سی اسکی پیشانی پر نمودار ہوئی اور ایک زبردست آہ کی جس سے مجھے خیال ہوا کہ شاید اسکے دل کا پردہ پھٹ گیا، اور کہنے لگا۔

"آہ میری آنکھوں کے سامنے کس قدر اندھیرا ہے، دنیا میرے لئے اس چھت کے نیچے، اس پلنگ پر اس کمرہ میں کسقدر تنگ و تاریک ہے۔ میں ان دونوں کو باہم بیٹھا ہوا دیکھ کر خوشی سے پھول جاتا اور خدا کا شکر ادا کرتا تھا کہ اس نے مجھے ایک ایسا وفادار دوست عطا کیا ہے جو میری بیوی کے لئے وحشت تنہائی میں انیس ہے، اس نے مجھے ایک ایسی بیوی دی ہے جو میری غیر حاضری میں میرے دوستوں کا پورا احترام و اکرام کرتی ہے۔

آہ لوگوں سے کہدو جو شخص کل تک اپنی دانائی و عقل پر نازاں تھا، جو بزعم خود سب سے زیادہ دور اندیش و خردمند تھا، آج وہ اپنی حماقت و غباوت اپنی نادانی اور سطحیت کا صریح معترف ہے۔

اے وائے افسوس میری لاولد ماں اور میرے بے اولاد باپ پر جن کا اُنکے بیٹے میں کچھ حصّہ نہیں،

شاید لوگ میری نادانیوں سے اچھی طرح واقف تھے، میں جب ان کے درمیان گذرتا تھا آپس میں ایک دوسرے کا منہ تکتے باہم کچھ اشارے کرتے اور اپنی نگاہیں میرے چہرہ پر گاڑ دیتے، یہ سب اس لئے کہ حماقت و سفاہت کا وہ نقشہ جو میرے چہرہ میں منقوش تھا اسے بغور دیکھیں

شاید وہ لوگ جو میرے گرد پیش پھرتے، جنھیں میری دوستی کی بڑی خواہش تھی ان کا سبب میں نہ تھا میری بیوی تھی -

بس رحم، رحم میرے لئے رحم اگر میں پردہ ہستی پر رہوں، اور حسرت و افسوس اس گوشۂ قبر پر جو مجھے میرے عار و ذلت سمیت اپنی گہرائیوں میں چھپالے" پھر اس نے آنکھیں بند کرلیں اور اپنے خیالات میں مستغرق ہوگیا، اتنے میں دایہ اس کے بچے کو لئے ہوئے آئی اور اس کے قریب بستر پر اسے چھوڑ کر چلی گئی بچہ کھسکتے کھسکتے باپ کے ہاتھ پر ہوتا ہوا سینہ پر جا پہونچا، باپ نے آنکھیں کھول دیں اور دیکھکر تبسم کیا، اور جوش محبت میں سینے سے لگایا، اور پیار کیلئے اپنا منہ اس کے رخساروں تک لیجا رہا تھا کہ یکایک اسکو پھینک دیا، جبین پر شکن آگئے اور کہنے لگا اسے یہاں سے دور لیجاؤ میں اسے نہیں پہچانتا، میرے عورت ہے نہ بال بچے، اسکی ماں سے اسکے باپ کا پتہ پوچھ اور وہاں پہونچا دو، میں زندگی میں شرم و عار کا لباس پہنا نہیں چاہتا میں نہیں چاہتا کہ مرنیکے بعد باقی رہنے والا چھوڑ جاؤں، بچہ کی آواز گریہ سنکر دایہ آئی اور اسے اٹھاکر لیجانے لگی، ابھی تھوڑی دور گئی تھی کہ اس نے چلاکر بلایا اور لڑکے کو اس سے لیکر بغور اس کا چہرہ دیکھنے لگا، اور کہا،

میرے بچے تیرے باپ کی طرف سے داغ یتیمی اور تیری ماں کی طرف سے ذلت و عار کا دھبہ درحقیقت خلوص و محبت کی بنا پر ہے، اس لئے تو ہم دونوں کے قصور معاف کردے تیری ماں بزدل اور کمزور تھی جو تقدیر کے

صدمات کی متحمل نہو سکی، اور پھسل پڑی، تیرا باپ اپنے جرم میں حسن نیت اور خلوص ارادہ رکھتا تھا، اس نے گناہ کیا لیکن اس کا ارادہ نیکی کرنے کا تھا بچے خواہ تو میرا ہو یا نہو بہرحال تیرے وجود سے مجھے کچھ دنوں آسودگی اور سعادت رہی ہے، اس لئے میں تیرا احسان بھولنا نہیں چاہتا مردوں یا زندہ رہوں۔

پھر اسے اپنے سینہ سے لگایا اور پیشانی پر بوسہ دیا، میں نہیں جانتا کہ یہ ایک رحمدل باپ کا بوسہ تھا یا کسی مہربان شخص کا اب اس کی تکلیف بڑھ چکی تھی، بخار دماغی عود کر آیا، سر کی حرارت تیزی کے ساتھ روبترقی تھی، مجھے اسکی جان کا خوف ہوا اور ڈاکٹر کو بلوا بھیجا، ڈاکٹر آیا اور مریض پر ایک طویل نگاہ ڈالی جو یاس وحسرت کیساتھ پھیر لی۔

اس کے بعد اس کے جسم میں ایک سخت کھنچاؤ پیدا ہوا اور وہ نہایت دردناک آواز سے کراہنے لگا، اب کیا تھا گردو پیش کی آنکھیں جس قدر رو سکیں روئیں ہم بیٹھے ہی تھے کہ موت اپنا سیاہ پردہ مریض کے ماحول پر گرانے لگی، اتنے میں ایک سیاہ پوش عورت کمرہ میں داخل ہوئی اور مریض کی طرف جھک کر اس کے ہاتھ جو سینے پر پڑا ہوا تھا بوسہ دیا اور کہنے لگی۔

تم دنیا سے بچے کے متعلق شک لیکر نہ جاؤ اس لئے کہ اس کی ماں تمہارے سامنے اعتراف کرتی ہے اور تم اپنے رب کے دربار میں جانے ہو وہاں میرے قول کی تصدیق کرلینا، کہ میں اگرچہ گناہ سے قریب ہو چکی تھی لیکن مرا دامن اس سے ملوث نہیں ہوا اور میں نے جرم کا ارتکاب نہیں کیا

پس میرے بچے کے باپ مجھے معاف کرو اور خدا کے دربار میں جا کر یہ دعا مانگو کہ مجھے بھی تم سے ملادے۔ اس لئے کہ تمہارے بعد زندگی میں میرے لئے بھلائی نہیں،

پھر زار زار رونے لگی، مریض نے آنکھ کھول دی اور اسے ایک تبسم نگاہ سے دیکھا جو زندگی کی آخری نگاہ تھی، اور انتقال کرگیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیہِ رَاجِعُون

اسوقت نوجوان دوست کو اپنے ہاتھوں قبر کے سپرد کرکے قبرستان سے واپس آرہا ہوں، اور یہ سطریں لکھنے بیٹھ گیا، اشکوں کا تار ہے کہ ٹوٹتا ہی نہیں ہے، صرف اسی خیال سے تسلی ہوجاتی ہے کہ پوری قوم ایک مصیبت کے گڑھے میں گرنے کو تھی میرا دوست آگے بڑھا، اور خود اس گڑھے میں گر کر جان دیدی جس سے قوم نے نجات پائی۔

غزل

هزاران زخم در هر گوشهٔ قلب و جگر دارم
برای زندگی من برگ و سامانی دگر دارم

جهان در هم خورد از نالہ های فتنه سامانم
فلک لرزد بخود از جوش غوغائی که بر دارم

جمالش را بآغوش تصور تنگ می گیرم
ز تاثیر فروغش شام هجران را سحر دارم

بایں آزردگیها از خیال او نمی افتم
بایں آشفتگیها بر جمال او نظر دارم

اگر پایم خورد بر سنگ شوق من فزون گردد
دگر خاری بیابم در رهش از دیده بر دارم

نیاید زحمتم از تیرگیهای شب فرقت
ز یاد روی تابانش که تنویر سحر دارم

اگر چه بیخودانه میروم در راه عشق او
ولی از رسم و آئین سر منزل خبر دارم

ز تاثیر محبت از بیابان هم گلی چینم
ز یاد روی رنگینش گلستان در نظر دارم

بعشق از زحمت مایوسی حالم چه میپرسی
که در دل سوز و بر لب نالهائی پر اثر دارم

بجز جرح دل نمی آید امید لطف چشمانش
بغارت میرود هر خرمن شوقی که بر دارم

نمی زیبد که حرفی رانم از جور و جفای او
بتیغش ساختم هادی از آن روزی که سر دارم

(هادی مچھلی شهری)

روزے اور بیسویں صدی

کچھ عرصہ کی بات ہے کہ ہندوستان کے ایک یونیورسٹی کے پروفیسر صاحب نے بیسویں صدی کے مروجہ مذہب میں روزے کے وجود پر اعتراض کیا اور فرمایا کہ اس زمانہ میں انسان عام طور پر تعلیم یافتہ ہوتا ہے اور قدیم تمدن کے باقیات صالحات کی امداد بغیر اپنی تندرستی کی حفاظت کر سکتا ہے۔ چونکہ معترض کا اعتراض بظاہر خالصاً طبی اور فزیالوجیائی ضرورت روزہ کے خلاف تھا اور ان دنوں ایک ایسی جماعت موجود ہے جو اجہی طور پر معاملات کی گتھیوں کو خود ہی سلجھانا چاہتی ہے اور مذہبی تعلیمات کی پیچ در پیچ باریکیوں کو نظر انداز کرنا چاہتی ہے میں مندرجہ ذیل سطور میں اپنے خیالات کے بموجب روزے کی تائید کرنا چاہتا ہوں اور بیسویں صدی اور اسکے بعد کی ضروریات کو پیش نظر رکھتے ہوئے فزیالوجیائی۔ اخلاقیاتی اور اقتصادی نقطہ خیال سے بحث کروں گا۔

طبی اصول کو پیش کر کے اس معاملہ پر اس قدر بحث ہو چکی ہے کہ اب دماغ اسکا متحمل نہیں رہا ہے میں یہ جملہ اس وجہ سے لکھ رہا ہوں کہ اس راستہ سے ہٹ کر ہم کو آزادانہ رائے قائم کرنیکا موقع ملے۔ مگر میں یہ بھی بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ خیالات میرے ذاتی ہیں۔ [illegible] اور جیسے کچھ بھی ہیں اُن کو بلا کم و کاست قارئین کے سامنے پیش کرتا ہوں کیونکہ حضرت ہمارا اسکی تعلیم ہے کہ

ہر شخص کو حقیقت کی تلاش کرنی چاہیئے۔ اور محض دوسروں کے کہنے کے بموجب اس پر یقین نہ کرلینا چاہیئے۔

بیسویں صدی کی حالت یہ ہے کہ کوئی شخص بھی نہیں کہہ سکتا ہے کہ اسکی تمام عمر آسائش میں گذرے گی افراد کی جب اسقدر غیر مستقل حالت ہو تو خاندانوں کا کیا ذکر ہے۔ زمانہ کی حالت کو دیکھتے ہوئے ماننا پڑتا ہے کہ موجودہ اور آئندہ دور تہذیب کے حملے پہلے سے بھی زیادہ شدید اور سخت ہوں گے۔

پہلے یہ حال تھا اور اب بھی کہیں کہیں موجود ہے کہ ایک شخص کماتا تھا اور تمام کنبے کو کھلاتا تھا دور کے عزیز رشتہ داروں تک کی دستگیری کیا کرتا تھا۔ لیکن جہاں جہاں تمدنی ترقیاں ہو رہی ہیں یا جہاں کہیں پوری رفتار پر کام کر رہی ہیں وہاں ہر انسان کو اطمینان میسر نہیں ہے اور باوجود سخت کوششوں کے بھی یہ نعمت ہاتھ نہیں لگی ہے۔ بلکہ وہ دن اکثر نظروں میں پھر جاتا ہے جب کہ جمعیت خاطر رخصت ہو چکی ہوگی اور وہ سخت تشویش کے عالم میں دماغ پر زور ڈالکر سوچ رہا ہوگا کہ یا الٰہی کیا کروں بال بچوں کے پیٹ اور اپنی آبرو کے لئے کیا تدبیر اختیار کروں۔

جرائم کی تاریخ اور علم النفس کی تحقیقات ثابت کر رہی ہے کہ جن کی تقدیر یکایک گردش میں آجاتی ہے وہی لوگ دلوں کے بودے۔ ہوتے ہیں اور اپنے بچوں و اپنی تکالیف کے خیال سے بہت زیادہ متاثر ہوتے ہیں اپنی تکلیف فاقہ کشی کے خیال سے زیادہ روح فرسا اپنے بچوں کے فاقہ کی تکلیف کا خیال ہوا کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ جو لوگ یکایک پریشانیوں میں گرفتار ہو جاتے ہیں وہ دغا فریب اور جرائم کے

مرتکب ہوتے ہیں بمجبوراشخاص جو دو سری فکر سے آزاد ہوتے ہیں۔ ایسی مواقع پر مردی سے کام کرا لیتے ہیں اور وہ جرائم سے بچتے ہیں یہ وہ مقام ہے جہاں روزہ خاندان یا فرد واحد کی مدد کرتا ہے اور اس کی مشکلوں کو آسان کرتا ہے جو آدمی سال میں ایک ماہ تک روزہ رکھنے کا عادی ہوگا۔ آنے والی مشکلات پر بھی حاوی ہو سکے گا۔ اور جو خاندان بارہ مہینوں میں ایک مہینہ روزہ رکھ سکے گا وہ فاقہ کے زمانہ کو بھی بآسانی گذار سکے گا۔ اس طریقہ سے انسان عادی ہو جاتا ہے اس خدائے برتر پر بھروسہ کرنیکا جو تمام دن کے روزہ کے بعد شام کو رزق پہنچا دیتا ہے۔ اس بھروسہ اور توکل کا نتیجہ ہمت افزا ہوتا ہے اور مصیبت کے وقت پوری جماعت کے ذہنی۔ دماغی۔ اخلاقی۔ معاشرتی اور تمدنی حالتوں کو درست رکھتا ہے۔

کون واقف نہیں ہے کہ ایمان مضبوط ہو تو انسان سے جرأت انگیز کام ظہور پذیر ہوتے ہیں اور کس کی طاقت ہے خدا پر بھروسہ رکھے اور اپنی طبیعت پر قابو رکھے بغیر مصائب کا مقابلہ کر سکے

شیخ حشمت اللہ ایم اے اکبرآبادی

گوالن

وادی میں جھومتی ہیں کچھ رس بھری صدائیں — سبزہ کی چادر و نہر بدمست ہیں ہوائیں
بیٹھی ہوئی ہے گوالن، اک جھیل کے کنارے — ہونٹوں میں بانسری ہے۔ ہاتھوں سے کچھ اُبھارے
اُن نازک انگلیوں میں جادو بھرا ہوا ہے — جن پر مغنیّہ کا ہر سانس ناچتا ہے
مسرور سطحِ آبی پُرجوش تھرتھری سے — موجوں کا کانپ اُٹھنا عُریاں تھرتھری سے
چہرہ پہ بال بکھرے۔ سینہ کے بند کھولے — شرمیلی نیچی نظریں۔ سراک ادا سے تولی
دوپٹہ لہرئے کا اُڑتا ہوا ہوا میں — کاندھے سے گر کے اُبھرا سینہ کی کچھ فضا میں
خاموش گائیں بیٹھی ہیں چار سو سی گھیرے — ڈالے شباب نے ہیں جنگل میں آ کے ڈیرے
ٹکرا رہی ہیں چوٹی سے لوچدار تانیں — ہر نغمہ لوٹتا ہے لے سے کے لاکھ جانیں
پتھر کی دیویوں میں ہے سامعہ نوازی — قربان! سادگی کے۔ اللہ ری بے نیازی
رشکِ بہارِ عشرت محفل سی جم رہی ہے — بے شکوہ ہر زباں ہے۔ آرام بے بسی ہے
آبادیِ رضا ہے دنیائے آرزو میں — ہیں بے خلش ترانہ مرلوجا ریگ دُجو میں
گورے بدن کی میلے کپڑو نمیں آبداری — معصومیت ہیں نیچر کی اضطراب کاری

نا آشنائے اُلفت۔ کیا حُسن بے خبر ہے
بے کیف زیب و زینت اُنور رُخِ قمر ہے

سردار انور خلزئی - بی۔ اے (علیگ)

غلط فہمی

فسانہ

از
جناب خان بہادر نواب سید مظفر علیخاں صاحب رئیس و اسپیشل مجسٹریٹ سبانسٹھ

اکتوبر ۱۲ ۱۹ء میں شہر بنارس میں سیٹھ رام ناتھ کے یکایک قتل ہوجانے سے ایک سنسنی پھیلی ہوئی تھی۔ کیونکہ استنے بڑے آدمی کا دن دھاڑے اپنے مکان پر قتل ہوجانا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ پولیس نے ہرچند کوشش کی مگر قاتل کا پتہ لگنا تھا نہ لگا آخر محکمہ سی۔ آئی۔ ڈی۔ نے سراغ رسانی کے لئے مجھے مامور کیا۔ حکم ملتے ہی میں نے بنارس پہونچکر اپنا کام شروع کردیا۔

ایک روز میں اور مرا اسسٹنٹ موقع واردات کے قریب سراغ رسانی کی نیت سے پھر رہے تھے کہ ہماری نظر ایک چالاک عوت پر پڑی۔ اور ہمنے یہہ قیاس کرکے کہ ممکن ہے کہ اوسکا تعلق وقوعہ سے ہو اوسکی دیکھ بھال شروع کی۔

اسوقت دن کے تین بجے ہوں گے۔ اِس عورت نے وہ راستہ اختیار کیا جو گنگا کی طرف جاتا تھا۔ ہم دونوں بھی کچھ فاصلہ سے اوسکے پیچھے چلے۔ اخر وہ ایک گھاٹ پر پہونچکر ایک پنڈت کے جھونپڑی میں داخل ہوگئی۔ ہم دور بیٹھے ہوئے اوس کا انتظار کرتے رہے۔ یہاں تک کہ افتاب اپنا نورانی چہرہ چھپا کر رخصت ہوگیا آٹھ بجے کے قریب اوس عورت نے وہاں سے نکل کر پھر شہر کا رُخ کیا۔ اور ہم دونوں اوسکی حرکات وسکنات کی نگرانی کرتے ہوئے اوسکے ساتھ ساتھ چلے۔

اس وقت اوسکی رفتار معمول سے کسی قدر زیادہ تیز تھی۔ ساڑھے نو بجے یہ عورت شہر کی تنگ و تاریک گلیوں سے گذرتی ہوئی ایک چھوٹے سے مکان کے سامنے رکی اور دروازہ کھٹکھٹایا۔ اندر سے کسی نے آکر دروازہ کھولا اور اس کے اندر داخل ہوتے ہی دروازہ پھر بند ہوگیا۔

ہم دونوں بارہ بجے تک مکان سے باہر اس امید میں ٹھہرے رہے کہ شاید کوئی مفید مطلب بات معلوم ہو۔ لیکن نہ پھر دروازہ کھلا اور نہ کوئی ایسا آدمی ملا جس سے کچھ حال معلوم ہوتا۔ مجبوراً ہم نے اپنی قیام گاہ پر واپس آنے کا ارادہ کیا۔

وہاں سے روانہ ہونیکے بعد ہمارا گذر ایک ایسے محلہ میں ہوا جہاں شرفا کی آبادی تھی اور سربفلک عمارتیں بنی ہوئیں تھیں۔ مجھے پہلے سے معلوم تھا کہ یہاں ان عمارتوں میں عہدہ داران سرکاری اور شرفا معہ اپنے اہل وعیال کے رہتے ہیں۔ ہمنے اس محلہ کا ابھی تھوڑا ہی ساحصہ طے کیا تھا کہ میرے کان میں کسی عورت کے رونے کی آواز آئی۔ میں سڑک پر رک گیا اور معلوم کرنیکی کوشش کرنے لگا کہ یہ آواز کدھر سے آتی ہے۔ مجھے معلوم ہوگیا کہ یہ آواز مکان کی دوسری منزل سے آئی تھی۔ ہمیں سامنے ہی ایک زینہ نظر آیا۔ میں اور میرا اسسٹنٹ دبے پاؤں اوس پر چڑھ گئے۔ اور اُس کمرہ کے سامنے پہونچگئے جہاں سے رونے کی آواز آرہی تھی۔ کمرہ کا دروازہ بند تھا۔ مگر کوشش کرنے سے ایک سوراخ مل گیا۔ اوس میں سے جب میں نے دیکھا تو معلوم ہوا کہ کرسی پر ایک حسین لڑکی ساڑھی باندھے ہوئے بیٹھی ہے ہاتھ میں ریشمی رومال ہے

(جس سے کبھی وہ اپنی آنکھیں صاف کرتی ہے اور کبھی اپنے چہرہ کو چھپا کر رونے لگتی ہے۔ کچھ فاصلے سے ایک نوجوان کھڑا ہوا للچائی ہوئی نظروں سے اوس کی طرف دیکھ رہا ہے اور یہ گفتگو ہو رہی ہے۔

نوجوان۔ جانکی۔ اس رونے سے کچھ فائدہ نہیں۔ میری بات کا صاف صاف جواب دو۔

جانکی۔ (خاموش)

نوجوان۔ جانکی۔ دیکھو اسوقت تم ہر طرح میرے بس میں ہو۔ خوب سوچ سمجھ کر جواب دو مگر یاد رکھو کہ اگر تم نے میری بات نہ مانی تو بری طرح پیش آؤں گا۔

جانکی۔ رومال سے اپنی آنکھیں پونچھتے ہوئے) او ظالم۔ تیرا کدھر خیال ہے۔ ادھر کی دنیا اُدھر ہو جائے تب بھی تیری شیطانی خواہش پوری نہیں ہو سکتی۔

نوجوان۔ تجھے خیال کرنا چاہیئے باوجودیکہ تو ہر طرح میرے قابو میں ہے پھر بھی تیرے ساتھ نرمی سے پیش آتا ہوں۔ اگر تیری یہی مرضی ہے کہ سختی کیجائے تو میں اس پر بھی تیار ہوں۔

جانکی۔ پرشوتم۔ پرمیشور کا خوف کر۔ وہ تیری ان شیطانی حرکات اور میری بے بسی کو دیکھ رہا ہے۔ اوسے عاجز مت خیال کر۔ وہ ایک منٹ میں کچھ سے کچھ کر سکتا ہے۔

پرشوتم (ذرا سخت لہجہ میں)۔ بس بس اپنی نصیحت کو بند کر میری بات کا جواب دے۔ میں صرف ہاں یا نہیں چاہتا ہوں!

جانکی۔ بے حیا۔ بے شرم۔ ایک ایسی عورت سے جس کی رگوں میں چھتری کا خون ہو کسی طرح ممکن نہیں کہ وہ صرف تیری خوشنودی کے لئے اپنی عصمت کو

برباد کردے۔

پرشوتم۔ خیر۔ معلوم ہو گیا کہ تجھے مری خوشی منظور نہیں۔ تیرا خود دل چاہتا ہے کہ میں تجھ پر سختی کروں۔ میں نے تو بہت چاہا کہ نرمی سے کام نکالوں لیکن جبکہ تیرے داغ سے عقل ہی رفو چکر ہو گئی ہو تو میں بھی مجبور ہوں۔

یہہ کہہ کر پرشوتم نے الماری سے ایک چمکتا ہوا چھرا نکالا۔ اور کہنے لگا۔

پرشوتم۔ جانکی۔ ذرا آنکھیں کھولکر اسی دیکھہ لے۔ ایک منٹ میں اس سے زندگی کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اب بھی ہوش میں آ جا۔ اور میری بات منظور کرلے۔ ورنہ یہ چھرا ہے اور تیری نازک گردن۔ جانکی میں ضد کا پورا ہوں۔ جو کہتا ہوں کر دکھاؤنگا اور اسی چھرے سے اپنا بھی کام تمام کرلوں گا۔ کیونکہ تیرے بعد اس دنیا میں رہنا بیکار ہے۔ جانکی۔ اگر تجھے میری محبت کی قدر نہیں تو اپنی جوانی پر رحم کر۔

جانکی۔ بس بس رے مکار۔ کیا تو مجھے موت سے ڈراتا ہے۔ میں ہرگز تجھ جیسے پاپی کا مُنہ دیکھنا نہیں چاہتی۔ لے میں اپنی آنکھیں بند کرکے زمین پر لیٹتی ہوں تو شوق سے میرا کام تمام کردے۔ پرشوتم۔ تجھے شرم نہیں آتی۔ تعجب ہے کہ تری زبان سے کیونکر یہ الفاظ نکلتے ہیں۔

یہہ حالت دیکھکر مرا خون کھولنے لگا۔ اور میں نے اپنے اسسٹنٹ سے آہستہ کہا کہ بہت جلد دہ چوکی سے پولیس کو بلا لائے جو قریب ہی تھی مرا اسسٹنٹ تو اود ہر روانہ ہو گیا۔ اور یہاں میں پھر ان دونوں کی باتیں سُننے لگا۔

پرشوتم۔ جانکی۔ میں خیال کرتا تھا کہ پڑھ لکھ کر تجھہ میں عقل آ گئی ہو گی۔ مگر تو تو بالکل بھولی بھالی ہے۔ اری بیوقوف یہہ تو پرمیشور مردوں اور عورتوں کو اسـ

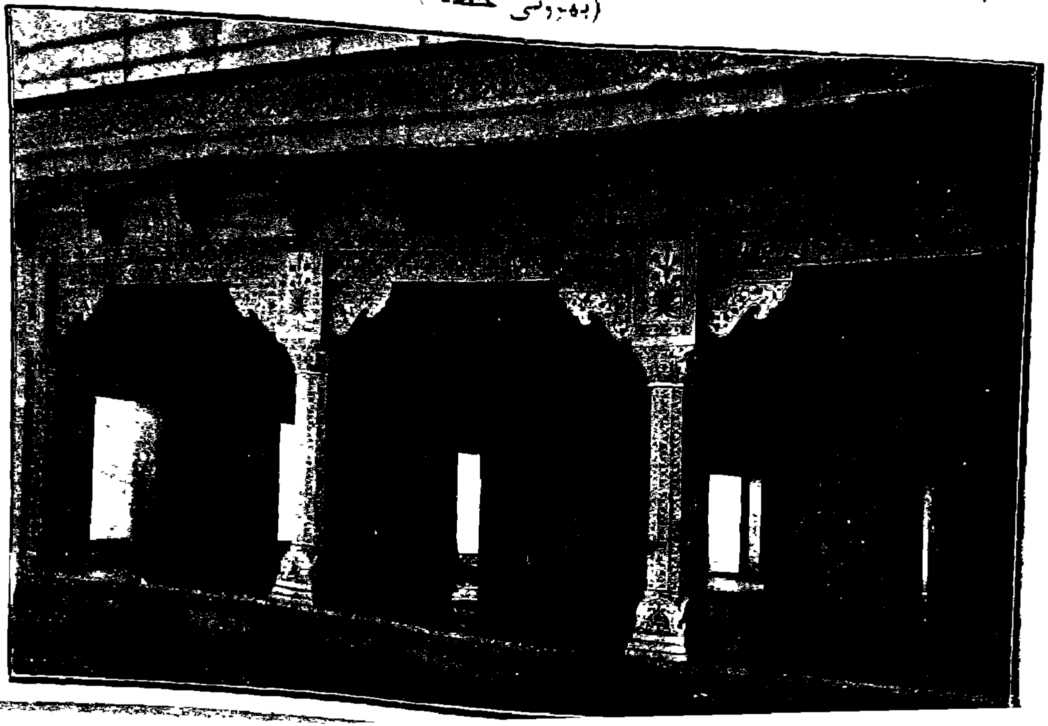
پیدا کرتا ہے ہر مرد ہر عورت پر تصرف کر سکتا ہے۔ بہر حال۔ میں تجھے پانچ منٹ کی مہلت دیتا ہوں۔ تو خوب سوچ لے ورنہ پھر یہ میرا چھرا ہے اور تو ہے۔

اس دقعہ میں میرا اسسٹنٹ بھی پولیس کے ہیڈ کنسٹبل اور چند سپاہیوں کو لیکر آ پہونچا اور ہم سب نے یکایک حملہ کر کے دروازہ کھول دیا اور ایک دم کمرہ میں داخل ہو کر نوجوان کو گرفتار کر لیا۔

یہہ دیکھ کر وہ لڑکی قہقہہ لگا کر کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

ہماری حیرت و شرمندگی کی کوئی حد نہ رہی جب ان دونوں نے بیان کیا کہ "کل ہمارے اسکول میں ڈراما ہوگا۔ ہم دونوں لڑکے اوسی اسکول کے طالبعلم ہیں اور اپنے اپنے پارٹ کی مشق کر رہے ہیں"

آرام گاہ نورجہاں بیگم سمن برج (بیرونی حصہ) قلعہ آگرہ



تزک جہانگیری

بہ سلسلہ ماہ فروری سنہ رواں

از جناب مولوی محمد معشوق حسین خاں صاحب بی۔ اے (علیگ)

اپنے احباب کے ساتھ جو خود اس کے ملازمین میں سے ہوتے شراب نوشی کے جلسوں میں بے تکلفانہ ملتا جلتا اگر کہیں سیر کے لئے جاتا تو پیدل چلنے میں عار نہ کرتا۔ خربوزوں کی تالیوں اور کشمیر کے پھولوں کے تختوں پر دن دن بھر پیدل چکر لگاتا رہتا۔ پھلوں کو خود اپنے ہاتھ سے ڈال سے توڑ کر کھانا پسند کرتا تھا۔ تمام امیروں غریبوں سے بلا تکلف کلام کرتا تھا۔ اس کے دربار میں کچھ زیادہ روک ٹوک نہ تھی اور ہر شخص باریاب ہو سکتا تھا۔

عزیز و اقربا کی محبت

جہانگیر کو اپنے عزیز و اقربا کی بہت محبت تھی۔ یہی محبت ہم بابر۔ ہمایوں اور اکبر میں بھی پاتے ہیں اس کے بعد اس میں شک نہیں کہ یہ صفت کم ہوتی گئی۔ جہانگیر جب کابل گیا تو خسرو اس کے ساتھ ساتھ تھا خسرو اپنی بغاوت کے بعد سے پابجولاں رہا کرتا تھا مگر شہر آرا باغ کی سیر کو جب جہانگیر جاتا ہے تو لکھتا ہے کہ:۔

"میں نے خسرو کو بھی بلا بھیجا اور حکم دیا کہ اس کے پیروں کی بیڑیاں کاٹ دیں"
"تاکہ شہر آرا باغ میں چل پھر سکے۔ میری محبت پدری نے اس کی اجازت"
"نہ دی کہ اس باغ میں سیر و تفریح کا اسے موقع نہ دوں۔"

اپنے جلوس کے تیسرے سال وہ اپنے باپ کی قبر پر زیارت کے لئے جاتا ہے تو جوش محبت سے بیتاب ہو کر لکھتا ہے :-

"اگر میسرم بود این راہ بہ سر و بہ سر می پیمودم۔ حضرت والد بزرگوارم"
"بجہت ولادت من از فتح پور بہ اجمیر کہ یک صد و بست کروہ است پیادہ"
"بزیارت حضرت معین الدین سنجری چشتی متوجہ گشتہ بودند اگر من بسر و"
"چشم این راہ بہ پیمایم ہنوز چہ کردہ باشم۔"

جب اس کی پہلی بیوی بادشاہ بیگم والدۂ خسرو کا انتقال ہوا جو راجہ بھگوان داس کی بیٹی تھی تو وفور غم سے کھانا پینا ترک کر دیا۔ لکھتا ہے :-

"از فوت او بنابر تعلقے کہ داشتم ایامے بر من گذشت کہ از حیات و زندگانی"
"خود ہیچگونہ لذتے نداشتم۔ چہار شبانہ روز کہ سی و دو پہر باشد از غایت"
"کلفت و اندوہ چیزے از ماکول و مشروب دارد طبیعت نگشت۔"

شہزادگی کے زمانہ میں راجہ کشن داس کی لڑکی سے اس کا عقد ہوا تھا جسے ملکہ جہاں کا خطاب دیا گیا تھا۔ بیگم کی محبت کے تقاضے سے اس خاندان کے ساتھ اس نے بے شمار احسانات کئے۔

شہزادہ خرم کی ایک لڑکی چھپی بیگم سے جہانگیر کو بہت الفت تھی۔ جلوس کے گیارہویں سال اس لڑکی کا چیچک سے انتقال ہو گیا۔ جہانگیر کو اتنا صدمہ ہوا کہ تزک میں اس واقعہ کو اپنے قلم سے نہ لکھ سکا۔ اعتماد الدولہ کو حکم دیا کہ تم اس واقعہ کو تزک میں لکھ دو۔ چنانچہ اعتماد الدولہ

نے یہ واقعہ حسب الحکم شاہنشاہی اپنے قلم سے تزک میں درج کیا ہے جس کے ایک ایک لفظ سے جہانگیر کے غم واندوہ کا اظہار ہوتا ہے۔

صرف اوقات یہ شخص جو اسقدر فطرت کا دلدادہ تھا۔ جس کی قدر دانیاں اور فیاضیاں اقصائے عالم سے اہل فن وہنر کو جذب کر کے ہندوستان میں لائی تھیں۔ جو اسقدر صلح پسند سازش سے متنفر۔ اسقدر محبت کرنے والا۔ خطا بخش و عذر پذیر اور سادہ مزاج بادشاہ تھا۔ اپنے اوقات کو بہت احتیاط سے صرف کیا کرتا تھا۔ اسمائے مفردات الٰہی اس کے معمول میں تھے۔ نماز پڑھا کرتا۔ روزہ رکھا کرتا تھا۔ ممکن ہے کہ اصحاب ترتیب میں سے ذہو۔ شراب اتنی نہیں پیا کرتا تھا کہ متوالا اور مدہوش کہا جائے۔ وہ خود کہتا ہے کہ رات کے کھانے پر کچھ تھوڑی سی ہضمہ کے خیال سے پی لیا کرتا ہوں۔ افطار کے لئے علما و فضلا کو دعوت دیا کرتا تھا۔ مالوہ کے دورہ پر ایک مرتبہ گیا ہے تو پرانے شاہانِ مالوہ کے مکانات میں سیر و شکار کے لئے چند روز قیام کرتا ہے۔ وہاں کے سبزہ اور ہریالی کو دیکھ کر بہت خوش ہوتا ہے اور سیر و تفریح کے بعد مغرب کی نماز اور تسبیح پڑھ کر پھر واپس ہوتا ہے وہ خود لکھتا ہے کہ:-

"بعد از ادائے عبادت و تسبیح شام متوجہ مستقر دولت گردیدم"

جلوس کے تیرھویں سال احمد آباد کے دورہ کے زمانہ میں باوجود علالت کے پھر بھی رعایا کی بہبودی کے خیال سے باہر نکل کر جھروکہ میں بیٹھا کرتا تھا۔ کہتا ہے کہ:-

"ہر روز بعد فراغ عبادت دو پہر جھروکہ طرف دریا کہ ہیچ گونہ حائلے"

"و مانعے از دیوار ویساول و چوبدار ندارد برآمدہ دو سہ ساعت"

"بتومی می نشستم و بمقتضائے عدالت بفریاد داد خواہان رسیدہ دستم"

"پیش ازاں منظور جاہم و تقصیرات سیاست می فرمائم حتیٰ کہ در ایام ضعف با کمال"
"درد دایم ہر روز بدستور معہود بہ جھروکہ برآمدہ تن آسانی بر خود حرام"
"داشتم" ؎

بہر نگہبانی خلق خدا ۔ شب نہ کنم دیدہ بخواب آشنا
از پے آسودگی جملہ تن ۔ رنج پسندم بہ تن خویشتن

"بہ کرم الٰہی عادت چناں شدہ کہ درمیان شبانہ روز سے پیش از دو سہ"
"ساعت نجومی لغدوقت بہ تاراج خواب نمی رود۔ و درین ضمن دو فائدہ"
"منظور است ایں بیداری را کہ دیگر در خواب نہ خواہم دید غنیمت شمردہ"
"یک چشم زدن از یاد حق غافل نباید بود" ع

"باش بیدار کہ خوابے عجبے در پیش است"

رات کو جب آرام کرتا تو قصہ گو فصیح زبان میں گزشتہ بادشاہوں کے قصے بیان کیا کرتے تھے۔ ملا اسد اس کا مشہور قصہ گو تھا۔ قصہ شروع کرنے کے پہلے قصہ خواں بلند آواز سے خود جہانگیر کا یہ شعر پڑھتے ؎

بود بر آسماں تا مہر را نور ۔ مبادا عکس او از چتر شہ دور

اس کے بعد داستان شروع کرتے۔ چراغچیوں کو بھی حکم تھا کہ چراغ روشن کرنے کے بعد جب وہ سلام کیا کریں تو یہ شعر پڑھا کریں۔ چراغ جلانے کے بعد سلام کرنے کی یہ رسم ریاست حیدرآباد کے اضلاع تک میں اب تک موجود ہے۔

شعر و شاعری | شعر و شاعری سے جہانگیر کی لطیف طبیعت کو شروع ہی سے خاص مناسبت تھی، اور شعرا کی بہت قدر دانی کرتا تھا۔ سعیدای گیلانی

زرگرباشی کو ایک قصیدہ کے صلہ میں اس نے سونے میں تلوادیا۔ اس کے زمانہ کے مشہور شعرا یہ تھے :۔

بابا طالب اصفہانی۔ حیاتی گیلانی۔ ملا نظیری نیشاپوری۔ ملا محمد صوفی مازندرانی۔ ملک الشعرا طالبا آملی۔ سعیدائے گیلانی زرگر باشی۔ میر معصوم کاشی۔ قول شورہ کاشی۔ ملا حیدر حصائی۔ شیدا۔

جہانگیر خود بھی کبھی کبھی کچھ کہتا تھا۔ شاہجہاں کی شادی کا زمانہ تھا یکشنبہ کو مظفر حسین میرزا کی لڑکی سے جو شاہ اسمٰعیل صفوی کا پرپوتا تھا اس کا عقد ہونے والا تھا۔ جمعہ کو جہانگیر نے یہ غزل کہی۔ لکھتا ہے کہ :۔

"روز جمعہ سیزدہم مضمونے بخاطر رسیدہ ایں غزل درسلک نظم در آمدہ"

من چوں کنم کہ تیر غمت بر جگر رسد — تا چشم نارسیدہ دگر بر دگر رسد
مستانہ می خرامی و مست تو عالمے — اسپندمی کنم کہ مبادا نظر رسد
در وصل دوست مستم و در ہجر بے قرار — داد از چنیں غمے کہ مرا سر بسر رسد
مدہوش گشتہ ام کہ بپویم رہ وصال — فریاد ازاں زماں کہ مراایں خبر رسد
وقت نیاز و عجز جہانگیر ہر سحر — امید آنکہ شعلہ نور اثر رسد

ایک مرتبہ کسی تقریب میں امیرالامرا شریف خاں کا ایک شعر اس کے سامنے پڑھا گیا ؂

بگذر مسیح از سر ما کشتگان عشق — یک زندہ کردن تو بصد خون برابر است

شعر سنکر کہتا ہے کہ :۔

" چوں طبع من موزون است گاہے باختیار گاہے بے اختیار مصراعی و "
" رباعی یا بیتے در خاطرم سر می زند ایں بیت بر زباں گذشت ؎ "
" از من متاب رخ کہ نیم بے تو یک نفس یک دل شکستن تو بصد خوں برابر است "
" چوں خواندہ شد ہر کس کہ طبع نظمے داشت دریں زمین بیتے گفتہ گذرانید "
" ملا علی احمد مہر کن کہ احوال او پیش ازیں گذشت بد نہ گفتہ بود ؎ "
" اے محتسب ز گریہ پیر مغاں بترس یک خم شکستن تو بصد خوں برابر است "

ایک مرتبہ کا حال لکھتا ہے کہ :۔
" بعرض رسید کہ سپہ سالار آتالیق خانخاناں در تتبع ایں مصرعہ مشہور "
" کہ ع "

" بہر یک گل زحمت صد خار می باید کشید "

غزلے گفتہ و میرزا رستم صفوی و مرزا مراد پسر او نیز طبع آزمائی نمودہ اند مطلعے در بدیہہ بخاطر رسید ؎

ساغر می بر رخ گلزار می باید کشید ابر بسیار است می بسیار می باید کشید

موسیقی اسی طرح موسیقی سے اسے کمال درجہ شوق تھا۔ اس کے زمانہ کے مشہور نغمہ سرا اور ساز بجانے والے استاد محمد نائی۔ چتر خاں پردیہ۔ داؤ ماکل حمزہ وغیرہ تھے۔ ایک مرتبہ استاد محمد نائی کو روپیہ میں تلوا دیا و لکھتا ہے :۔
" چند روز قبل ازیں استاد محمد نائی را کہ در فن خود از بے نظیران بود "
" فرزند خرم بموجب طلب فرستادہ بود چند مجلس ساز او شنیدہ شد "

"نقشے کہ در غزل بنام من بستہ بود گذرانید۔ در دو از دہم ماہ مذکور بہ دہیہ"
"وذن نوذند شش ہزار و سی صد روپیہ و فیل حوضہ داری نیز با و عنایت"
"نمودہ مقرر فرمودم کہ بر آن فیل سوار شدہ در زر ہا بر اطراف و جوانب خود"
"چیدہ و پاشیدہ بہ منزل خود برود"

عادل خاں والئی بیجاپور کا ایک شخص نجبر خاں اس کے پاس آیا تھا جس کے حال میں لکھتا ہے کہ:۔
"بشبہا بہ ملازمت بسری بردو در بہائے کہ عادل خاں بستہ و مخترع"
"آن طرز است و آن را نورس نام نہادہ می شنوانید"

اس کے باپ کے زمانہ میں تان سین کلاونت بہت مشہور تھا جس نے حضرت شیخ سلیم چشتی مرحوم کے وفات کے وقت بھی گایا تھا یہ جہانگیر کی شہزادگی کا زمانہ تھا مگر خود جہانگیر کی تخت نشینی کے بعد اس کا حال نظر سے نہیں گذرا۔ غرضکہ موسیقی کے ایسے ایسے اہل کمال کا وہ زمانہ تھا جو اپنے فن کے امام تھے اور جن کی نظیر آج تک ہندوستان نے نہیں پیدا کی۔

فن تعمیر اس میں شک نہیں کہ فن تعمیر عمارت میں شاہجہاں کے زمانہ میں ہندوستان نے جو ترقی کی وہ سارے عالم کے لئے باعث ناز ہے مگر جہانگیر کا زمانہ وہ زمانہ تھا جبکہ اس انتہا پر پہونچنے کی ہندوستان تیاری کر رہا تھا اس کے زمانہ میں کابل کشمیر مانڈو اور آگرہ میں عمارتیں تیار ہوئیں جو بے نظیر و قت تھیں۔ اس کے عہد میں شعبہ تعمیر عمارات میں بھی اہل فن کی بڑی قدر دانیاں ہوا کرتی تھیں۔ مانڈو میں اس نے جو محل بنوایا تھا وہ اس کے مشہور انجنیر عبدالکریم کے زیر نگرانی و اہتمام تیار ہوا تھا۔ وہ لکھتا ہے:۔

"عبدالکریم را بہ جلدوئے عمارت مانڈو کہ بہ حسن سعی و اہتمام او با تمام رسید"
"ببلود بہ منصب ہشت صدی ذات و چہار صد سوار از اصل و اضافہ"

"سرفراز ساختہ بخطاب معمور خانی بلند نام گردانیدیم"

یہی قدر دانیاں تھیں جن کی وجہ سے لوگ کام کیا کرتے تھے۔

لاہور میں اسی انجنیر سے اپنے محلات بنوائے تھے ایک مرتبہ اپنے جلوس کے پندرہویں سال کشمیر سے واپسی کے وقت لاہور کے نواح میں راوی کے کنارے موضع عشق باز کے باغ میں کیمپ کرتا ہے۔ وہاں سے ایک مبارک ساعت میں دوشنبہ کے روز شہر لاہور میں داخل ہو کر اپنے نئے محل میں قیام فرماتا ہے وہ لکھتا ہے کہ :۔

"درعماراتے کہ مجدد آباہتمام معمور خاں حسن انجام پذیرفتہ مبارکی و فرخی"
"نزول فرمودم بے تکلف منازل دلکشا و نشیمن ہائے روح افزا در غایت"
"لطافت و نزاہت ہمہ منقش و مصور بعمل استادان نادرکار آراستگی"
"یافتہ باغہائے سبز و خرم بانواع و اقسام گل و ریاحین نظر"
"فریب گشتہ ۔"

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم   کرشمہ دامن دل میکشد کہ جا اینجاست

مصوری

فن مصوری جہانگیر کے زمانہ میں ہندوستان میں درجہ کمال کو پہونچ گیا تھا۔ خود جہانگیر کا ذوق تصویر اور حسن و قبح کی تمیز اسقدر تھی کہ کم لوگوں میں ہو گی۔ لکھتا ہے کہ :۔

"مرا ذوق تصویر و مہارت تمیز او بجائے رسید کہ از استادان"
"گذشتہ و حال۔ کار ہر کس بنظر درمی آید بے آنکہ نامش مذکور شود بدیہہ"
"دریابم کہ کار فلان است بلکہ اگر مجلسے باشد مشتمل بر چند چہرہ و ہر چہرہ"
"کار یکے از استادان باشد می توانم یافت کہ ہر چہرہ کار کیست و"

" اگر در یک صورت چشم و ابرو را دیگرے کشیدہ باشد در آں صورت "
" می فہم کہ اصل چہرہ کار کیست و چشم و ابرو را کہ ساخت "

اس کے زمانہ میں دو مصور سب سے زیادہ نام آور تھے ایک استاد منصور۔ دوسرا استاد ابوالحسن۔ ابوالحسن کی تربیت و پرورش بچپن سے بادشاہ کے دامن عاطفت میں ہوئی تھی اور خود جہانگیر کا ساختہ پرداختہ تھا۔ اس کا باپ آقا رضا بھی مشہور مصور تھا مگر بیٹے کا ہنر سب سے بڑھ گیا تھا۔ ایک دن کا حال جہانگیر لکھتا ہے کہ :-

" آج ابوالحسن نے جسے میں نے نادر الزماں کا خطاب دیا تھا جہانگیر نامے کے "
" دیباچہ میں میرے جلوس کے مجلس کی تصویر کھینچکر میرے سامنے پیش کی "
" چونکہ تحسین و آفرین کا مستحق تھا۔ میں نے بہت الطاف اس پر فرمائے "
" اس کا فن کمال کو پہونچ گیا تھا اور اس کی تصویر روزگار کے کارناموں "
" میں سے ہے۔ اس زمانہ میں اس کا کہیں نظیر و عدیل نہیں ہے۔ اگر "
" آج استاد عبدالحی اور بہزاد زندہ ہوتے تو اس کے کام کی داد دیتے "

استاد منصور کی بھی بہت تعریف کرتا ہے۔ ایک موقعہ پر لکھتا ہے کہ :-

" استاد منصور جسے میں نے نادر العصری کا خطاب دیا ہے فن نقاشی "
" میں یگانہ روزگار ہے "

منصور نقاش نے بابرنامہ میں بھی تصویریں بنائی ہیں۔ برٹش میوزیم میں جو نسخہ ہے اس میں اسکے ہاتھ کی بنائی ہوئی تصویریں موجود ہیں۔ ان کے علاوہ بادشاہ کے دربار میں اور بھی مصور تھے مثلاً حسین نقاش اور کشن داس وغیرہ۔ جو اپنے فن میں بڑے صاحب کمال تھے مگر ان دونوں یعنی ابوالحسن اور استاد منصور کے برابر کوئی نہ تھا۔ جانوروں کی تصاویر تزک کے

لئے یہ اکثر کھوایا کرتا تھا۔ ازآنجملہ ایک مرتبہ ایک باز کا حسن و رنگ جہانگیر کو بہت پسند آیا تو استاد منصور سے اس کی تصویر کھنچوائی اور جہانگیر نامہ میں داخل کی۔ اس کا ایک تصویر خانہ تھا جہاں بڑے بڑے صاحب کمالوں کی بنائی ہوئی تصویریں موجود تھیں۔ اس کا حال لکھتا ہے کہ:۔

"خانہ تصویرے کہ در باغ واقع است و حکم بہ تعمیر آن شدہ بود در ینولا"
"بہ تصویر استادان نادرہ کار آہستگی یافتہ در مرتبہ بالا شبیہ جنت"
"آشیانی (ہمایوں) و عرش آشیانی (اکبر) و در مقابل شبیہ مرا و"
"برادرم شاہ عباس را کشیدہ اند بعد ازاں شبیہ میرزا کامراں و"
"مرزا حکیم شاہ مراد و سلطان دانیال و مرتبہ دوم شبیہ امرا و بندہ ہائے"
"خاص را تصویر کردہ اند و در اطراف بیرون خانہ سواد منازل راہ"
"کشمیر بہ ترتیبے کہ آمدہ شد نگاشتہ اند یکے از شعرا ایں مصرعہ را"
"تاریخ یافتہ۔ ع

"مجلس شاہان سلیمان حشم"[۱]

بادشاہ کو نادر تصویروں اور مرقعوں کا بہت شوق تھا۔ ۱۴ جلوس میں جب خانعالم عراق جانے لگا تو بشن داس مصور کو جو یکتائے روزگار تھا ہمراہ بھیجا تاکہ شاہ عباس صفوی اور اسکے ارکان سلطنت کی تصویر کھینچکر لائے۔ چنانچہ جب یہ تصویریں لایا تو ملاحظہ فرمایا۔ لکھتا ہے کہ:۔

"شبیہ شاہ برادرم بسیار خوب کشیدہ بود"

---

[۱] ۱۰۲۹ھ ہجری (مطابق ۱۶۲۰ء)

خانعالم نے ایک مرتبہ ایک مرقع پیش کیا جو امیر تیمور کے ایک معرکہ جنگ کا تھا - اسقدر خوش ہوا کہ لکھتا ہے :-

"از نفائس و نوادر روزگار کہ خانعالم آوردہ الحق از تائیدات طالع او بود کہ"

"چنیں تحفہ بدست افتادہ مجلس جنگ صاحبقران (امیر تیمور) است -"

جو چیز عجیب نظر سے گذرتی - جانور - پھول پتی - اس کی تصویر اُتروا تا - چنانچہ کشمیر کے پھول جن کی تصویریں اُستاد منصور نے کھنچوائی تھیں سو سے زیادہ تھے - ساج آبی جسے کشمیری اپنی زبان میں گلکر کہتے ہیں اس کی تصویر کھینچنے کا اوستاد منصور کو حکم دیا تھا کہتا ہے کہ :-

"یہ نادر العصری اُستاد منصور نقاش فرمودم کہ شبیہ آں را"

"بہ کشند"

غرضکہ تصویر کشی کا شوق اسقدر غالب تھا کہ اس کے شکار کے شوق کے برابر برابر کہا جاسکتا ہے اور اس کے ساتھ ہی بڑی قدردانی کرتا تھا - انہیں قدردانیوں کا یہ نتیجہ تھا کہ یہ فن اس کے زمانہ میں کمال کو پہنچ گیا تھا -

خاتم بندی

خاتم بندی یعنی نقش ونگار بنانے و منبت کاری کے فن میں اس کے زمانہ کے سب سے بڑے اُستاد دو شخص تھے - ایک اوستاد پورن اور دوسرا کلیان - آخرالذکر کو اس نے "عجیب دست" کا خطاب دیا تھا - ان دونوں نے جہانگیر کے لئے والروس کے دانت کا خنجر کا قبضہ بنایا تھا اور جہانگیر نے جو انعام دیا تھا اوس کا اوپر ذکر ہو چکا ہے اعادہ کی ضرورت نہیں -

---

۵۱ ([illegible])

حکما و فضلا مرزا محمد ہادی نے اپنے دیباچہ تزک میں حکما و فضلا کے یہ نام لکھے ہیں۔

فضلا:۔ ملا روزبہان تبریزی۔ ملا شکراللہ شیرازی۔ میر ابوالقاسم گیلانی۔ ملا باقر کشمیری۔ ملا محمد سستانی۔ ملا مقصود علی۔ قاضی نوراللہ۔ ملا فاضل کابلی۔ ملا عبدالحکیم سیالکوٹی۔ ملا عبداللطیف سلطان پوری۔ ملا عبدالرحمن بہورہ گجراتی۔ ملا حسن مراغی۔ ملا محمد جون پوری۔

حکما۔ حکیم اکنا کاشی۔ انہیں جہانگیر نے بدمزاجی کی وجہ سے موقوف کردیا تھا اور کہا تھا کہ جہاں چاہو چلے جاؤ۔

حکیم صدر الملقب بہ مسیح الزماں۔ یہ بھی بڑے نازک مزاج تھے۔ خود جہانگیر ایک مرتبہ علیل تھا لیکن انہوں نے انتہائے بدخلقی سے ایسے وقت میں بجائے اس کی صحت کا انتظار کئے ہوئے حج کو جانے کی اجازت مانگی۔ جہانگیر ان کی اس حرکت پر یہ ریمارک کرتا ہے۔

"پیش ازیں مجملی از احوال مسیح الزماں ثبت افتاد کہ باوجود چندیں"
"حقوق تربیت و نوازش دریں قسم بیماری توفیق خدمتگاری نیافت"
"غریب تر آنکہ بیکبار پردہ آزرم از پیش برگرفتہ التماس سفر حجاز"
"و زیارت خانہ مبارک نمود!"

جہانگیر نے خوشی خوشی رخصت کردیا بلکہ بیس ہزار روپئے اور ... خرچ کے طور پر دیئے۔ ان دونوں کے علاوہ اور دوسرے حکما یہ تھے:۔

حکیم ابوالقاسم گیلانی ملقب بہ حکیم الملک۔ حکیم مومنائے شیرازی۔ حکیم روح اللہ

کابلی۔مقیم بیگ گجراتی۔حکیم تقی گجراتی۔

میرزا ہادی نے اسی قدر حکما کا ذکر کیا ہے مگر ان کے علاوہ تزک میں اور حکیموں کا بھی ذکر ہے۔مثلاً حکیم حامد گجراتی۔جنہیں مرتضےٰ خاں نے بڑی تعریفوں کیسا تھ پیش کیا تھا۔جہانگیر کہتا ہے کہ "ان کے عمدہ صفات اور تقدس ان کے معالجہ سے زیادہ بہتر ہیں"

نیز حکیم جلال الدین اردستانی جو علاوہ کمال فن کے حسن صورت میں بھی کمال رکھتے تھے۔جہانگیر کے دربار میں آنے کے پہلے شاہ طہماسپ صفوی کے دربار میں تھے نیز حکیم علی۔ان کے بھی دست شفا اور کمال فن کی جہانگیر بہت تعریف کرتا ہے۔یہ صاحب ریاضی میں بھی بڑا کمال رکھتے تھے۔نیز حکیم عبدالشکور و حکیم خوش حال پسر حکیم ہمام۔

فرہنگ جہانگیری عضدالدولہ میر جلال الدین حسن انجو نے ایک لغت موسوم بہ فرہنگ جہانگیری تیار کی تھی جس کا ذکر جہانگیر ان الفاظ میں کرتا ہے:۔

"میر عضدالدولہ از آگرہ آمدہ ملازمت نمود فرہنگے کہ در لغت"
"ترتیب دادہ بنظر در آورد الحق بسیار محنت کشیدہ و خوب"
"پیروی ساختہ و جمیع لغات را از اشعار علما و قدما مستشہد آوردہ"
"و دریں فن کتابے مثل ایں فن نمی باشد"

ترجمہ قرآن پاک حضرت شاہ عالم گجراتی رح کے پانچویں پشت میں ایک بزرگ سید محمد تھے۔جہانگیر کے قیام گجرات (احمد آباد) کے

زمانہ میں اس سے ملنے آئے۔ اس نے کچھ نذر پیش کرنی چاہی اور قسم دیکر کہا کہ بلاتکلف جو جی چاہے مانگئے آپ نے کہا میں نے قسم کھائی ہے کہ میں قرآن پاک کا ایک نسخہ مانگوں گا جسے ہمیشہ اپنے پاس رکھوں گا تاکہ اس کی تلاوت کا ثواب بادشاہ کو ملتا رہے۔ جہانگیر نے یاقوت کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک قرآن انہیں دیا۔ یہ ذکر خود اس طرح کرتا ہے اور قرآن پاک کے فارسی ترجمہ کی فرمائش کرتا ہے۔

"مصحفے بہ خط یاقوت تقطیع مطبوعہ مختصر کہ از نفائس و نوادر روزگار"
"بود بمیر مذکور عنایت شد۔ در پشت آں بہ خط خاص مرقوم گشت کہ در"
"فلاں تاریخ در فلاں مقام بہ سید محمد ایں کرامت بہ ظہور رسید نفس الامر"
"آنکہ میر بغایت نیک نہاد و مغتنم است۔ با نجابت ذاتی و فضایل"
"کسبی با خلاق حمیدہ و اطوار پسندیدہ آراستہ بسیار شگفتہ رو و کشادہ"
"پیشانی است و از مردم ایں ملک بخوش ذاتی میر کسے دیدہ نہ شد۔"
"بہ اشارالیہ فرمودم کہ مصحف بہ عبارت سلیس خالی از تکلف و تصنع"
"ترجمہ نماید و اصلا بہ شرح و بسط و شان نزول آں مقید نہ شدہ"
"ریختہ قرآن را لفظ بہ لفظ فارسی ترجمہ کند و یک حرف بر معنی تحت اللفظ"
"نیفزاید و بعد از اتمام آن مصحف مصحوب فرزند خویش جلال الدین"
سید روانہ درگاہ سازد۔

ایجادات جہانگیری جہانگیر کو ایجادات کا بہت شوق تھا۔ نئے قسم کے سکے اور طلائی سکے اس نے جاری کئے زائین پر مہر التمغا کے بجائے مہر التون تمغے ایجاد کئے۔ ان کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ ان کے علاوہ دو ایک

چیزیں اور یہاں اشارتاً بیان کی جاتی ہیں۔

عطر جہانگیری یہ عطر نورجہاں بیگم کی والدہ نے ایجاد کیا تھا جہانگیر اس کی بہت تعریف کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ:۔

" ایں اختراعیست کہ در زمان دولت ابد پیوند ما بسعی والدہ نورجہاں بیگم "
" بہ ظہور آمدہ در ہنگامے کہ گلاب می گیرند نی الجملہ چربے بر بالائے ظرفہائے "
" کہ گلاب ما گرم از کوزہ بمی آرند در آنجا ظاہر می شود۔ آن چربے را "
" اندک اندک جمع ساختند۔ چوں از گل بسیارے گلاب گرفتہ شود "
" قدر محسوسے ازاں چربی بہم می رسد۔ در خوشبوئے وعطریت بدرجہ "
" ایست کہ اگر یک قطرہ ازاں بر کف دست مالیدہ شود مجلسے را "
" معطر می سازد و چناں ظاہر می شود کہ چندیں غنچہ گل سرخ بیکبار "
" در شگفتگی آمدہ بایں شوخی و ملائمت بوئے نمی باشد دلہائے رفتہ "
" را بجامی آرد و جانہائے پژمردہ را شگفتہ می سازد "

نادری ۔ ایک قسم کا دگلہ تھا جو قبا کے اوپر پہنا کرتے تھے۔ اس کی آستین نہیں ہوتی تھیں اور لمبائی کمر کے نیچے تک ہوتی تھی۔ سامنے تکمے لگائے جاتے تھے۔

الماس و دیگر جواہرات بہار گرد واقع ملک گونڈوانہ میں الماس کی ایک کان تھی جو خاندیش کے راجہ بہوکے قبضہ میں تھی۔ آئین اکبری میں اس موضع کا نام بیرا گاؤں درج ہے۔ خانخاناں کے بیٹے امراﷲ نے ایک فوج لیجا کر اس ملک کو فتح کر کے پھر راجہ کو دیدیا اور الماس کی کان شاہی قبضہ میں رہی۔ جہانگیر لکھتا ہے کہ

" الماس آنجا باصالت ونفاست از سائر اقسام الماس امتیاز تمام ...

"وزن و جوہریان بغایت معتبر و بہ نیک اندام و بہتر و بر تر می شوند"

کوہرہ - واقع ملک بہار۔ یہاں ایک دریا میں سے الماس برآمد ہوا کرتا تھا بارش کے موسم میں پہاڑوں سے جو سیل آتا تھا اُسے بند ڈال کر روکتے تھے۔ جب سیل بند کے اوپر سے گذر جاتا اور پانی کم ہو جاتا تو جن لوگوں کو مہارت ہوتی وہ اس مقام سے الماس ڈھونڈھ کر نکالتے۔ جن سوراخوں میں الماس پڑے ہوئے ہوتے وہاں کثرت سے بھینگے نظر آتے تھے۔ اس مقام کا الماس اول الذکر موضع کے الماس سے دوسرے درجہ پر ہوتا ہے۔ اسی کان کے چند الماس ابراہیم خاں فتح جنگ نے جہانگیر کی خدمت میں بھیجے تھے ان میں سے ایک الماس کا رنگ بنفشی تھا اور بظاہر نیلم معلوم ہوتا تھا۔ جہانگیر لکھتا ہے کہ:-

"تا حال الماس بایں رنگ دیدہ نہ شدہ چند وزن در آمد و جوہریان"

"سہ ہزار روپیہ قیمت کردند و عرض کردند کہ اگر سفید و تمام عیاری بود بست"

"ہزار روپیہ می آرزد"

یہ کان پہلے ایک زمیندار درجن سال کے قبضہ میں تھی مگر ابراہیم خاں نے فتح کرکے ممالک محروسہ سے ملحق کر دیا۔ اسی مقام سے ابراہیم خاں فتح جنگ نے نو (۹) الماس کے ٹکڑے اور پیش کئے تھے جن میں سے ایک کا وزن ۱/۲ ۱۴ ٹانک (ایک ٹانک موازی ۴ ماشہ) تھا اور ایک لاکھ روپیہ قیمت آنکی گئی تھی۔

کرناٹک میں قطب الملک کے سرحد پر پچاس کوس کے اندر چار کانیں تھیں۔ جہانگیر لکھتا ہے کہ :-

"الماس آنجا اکثر پختہ بہم می رسد"

مقرب خاں حاکم گجرات (احمد آباد) نے ایک الماس نذر میں بھیجا تھا جس کی بہت تعریف کرتا

ہے۔ لکھتا ہے کہ

"بیست وسہ سرخ وزن داشت چنانکہ جوہریان بہ سی ہزار قیمت"

"نمودند۔ فرد اعلیٰ الماس بود نہایت پسند افتاد"

عضدولہ میر جمال الدین حسن انجو نے جو عادل خاں بیجاپوری کے پاس جہانگیر کے سفیر کی حیثیت سے مقیم تھے ایک خنجر مرصع پیش کیا جس کے دستہ میں ایک یاقوت زرد لگا ہوا تھا جو نہایت درجہ صاف وشفاف تھا اور جسامت میں مرغی کے انڈے کا نصف تھا۔

جہانگیر کہتا ہے کہ "اسقدر بڑا اور خوبصورت یاقوت زرد اس سے پہلے میری نظر سے نہیں گذرا تھا"۔ مسٹر بیوریج لکھتے ہیں کہ غالباً یہ پکھراج ہوگا۔

اودے پور کے رانا امر سنگھ نے ایک لعل جو اس خاندان میں عرصہ سے چلا آتا تھا شاہجہاں کے نذر کیا تھا جو اُس نے اپنے باپ کی خدمت میں پیش کیا۔ اس لعل کا وزن (۳۲) ماشہ تھا۔ مگر جہانگیر لکھتا ہے کہ یہ اتنا اچھا نہ تھا جتنی کہ تعریف کی جاتی تھی۔

جلوس جہانگیری کے گیارہویں سال شاہجہاں نے ایک لعل بے بہا پیش کیا جو آب وصفائی میں بے نظیر تھا اور اسی ہزار (۸۰۰۰۰) اس کی قیمت آنکی گئی تھی۔ شاہجہاں نے رانا کے فتح کے بعد اپنے باپ کو ایک لعل نذر دیا جس کی ساٹھ ہزار روپئے قیمت آنکی گئی تھی۔ جہانگیر لکھتا ہے کہ :-

"در خاطرم گذشت کہ ایں لعل را در بازوئے خود باید بست۔ غالباً"

"دو مروارید نادر خوش آب یک اندام کہ ہم آغوشی ایں نوع لعلے را سزد"

"می بایست تا آنکہ یک دانہ مروارید اعلیٰ بہ قیمت بست ہزار روپیہ"

"مقرب خاں بدست آورده در پیش کش نوروزے گذرانیدہ بخاطرم"

"رسید کہ اگر بتمامے ایں ہمہ رسد بانزد بند کل خواہد شد۔ خرم کہ از"
"خوردی بار شرف ملازمت حضرت والد بزرگوارم دریافتہ"
"شب و روز در خدمت بود عرض رسانید کہ در مروارید ہائے سر بند"
"قدیم بہمیں وزن و انرام مروارید بہ نظر من در آمدہ است۔ سر پیچ"
"کلاں قدیمے را خاطر ساختند بعد از ملاحظہ بہمیں مقدار و وزن"
"اندام مروارید ظاہر شد ..... مروارید ہا ... لعل کش"
"بر بازوئے خود بستم و سر بہ شکرانہ خداوند بندہ نواز بزمین"
"نیاز و فروتنی نہادہ زبان بہ شکر گویا ساختم ؎

از دست و زباں کہ بر آید کز عہدہ شکرش بدر آید

نورجہاں بیگم کا اثر

جہانگیر کے لائف میں سب سے زیادہ افسوس ناک اس عورت کا اثر تھا۔ بادشاہ کو اس درجہ محبت تھی کہ بیان میں نہیں آ سکتا مگر نورجہاں بیگم حرم کے فرائض سے قدم باہر نکال کر شریک سلطنت ہو گئی تھیں۔ یہی نہیں بلکہ جہانگیر کو اس کے سب سے زیادہ سعادت مند اور لائق لڑکے یعنی شاہجہاں سے لڑوا دیا تھا جب تک شاہجہاں کی والدہ جودھا بائی زندہ رہیں بادشاہ کے کان کبھی بھرے جاتے تو جودھا بائی کی کوششوں سے صفائی ہو جاتی لیکن ان کے مرنے کے بعد شاہجہاں کا اثر مخدرات شاہنشاہی کے واسطہ سے بالکل نہ رہا اور نورجہاں بیگم اگر کبھی اس کے خلاف زہر اگلتیں تو اس کا ردعمل کرنے والا کوئی نہ ہوتا۔ نورجہاں بیگم کی ہوس جاہ و سلطنت اتنی بڑھ گئی تھی کہ انہوں نے جہانگیر کے آخر عمر میں خود سلطنت کرنی شروع کر دی تھی۔ جھروکہ میں بیٹھتیں۔ امرا کا مجرا لیتیں۔ انعام و اکرام و خلعت دیتیں

گران کی اس خواہش حکمرانی کا مقصد یہہ تھا کہ شاہجہاں کو نظر سے گرا کر اپنے داماد شہریار کو بادشاہ بنائیں اور اسکے پردے میں خود حکومت کریں۔ ان کی سازشوں کا نتیجہ یہہ ہوا کہ شاہجہاں ایسے سعادتمند لڑکے کو در بدر تقریباً افلاس کی حالت میں دکن میں مارا مارا پھرنا پڑا۔

نورجہاں بیگم بذات خود بڑی خوبیوں کی بی بی تھیں اور اسمیں شک نہیں کہ دنیا میں ایسی عورتیں کم ہوتی ہیں۔ مرزا ہادی لکھتے ہیں کہ:-

" از خوبی و نیکنامی بیگم چہ نویسم۔ خیر او غالب بر شر بود بلکہ شر نہ بود۔"
" ہر جا کہ کار افتادہ را عقدہ پیش می آمد بخدمت بیگم ملتجی گشت۔ "
" گرہ از کارش بر کشودہ کامیاب مراد ساخت و ہر کسے بدرگاہ او "
" پناہ برد از آسیب ظلم و ستم محفوظ ماند۔"

یہ سب خوبیاں ضرور تھیں اور ان سے انکار نہیں ہو سکتا مگر اُن میں جاہ طلبی اور حکومت کی خواہش اسقدر تھی کہ جہانگیر کی زندگی آخر عہد میں انہیں کی ہوا و ہوس کی وجہ سے تلخ ہو گئی۔ ایک سعادتمند لڑکے کا باغی ہو جانا اور بادشاہ کا مہابت خاں کے قید میں چند روز کے لئے رہنا یہہ کچھ کم زندگی تلخ کرنے والی باتیں نہ تھیں۔ اسکے ساتھ جہانگیر کے دمہ کی شکایت اور آخری عمر کی علالت ان سب باتوں نے ملکر ایک ایسے بادشاہ کو جو عیش میں پلا اور عیش ہی میں زندگی بسر کرنا چاہتا تھا تکلیف و آلام میں مبتلا رکھا۔ یہہ سب باتیں جہانگیر پر بیگم کے دوسرے افعال کے نتیجہ کے طور پر اثر پذیر ہوئیں تاہم اسمیں کوئی کلام نہیں کہ انہوں نے بادشاہ کی براہ راست خدمت و ہوا خواہی کرنے اور دلچسپیوں کے سامان مہیا رکھنے میں کبھی کوتاہی نہ کی یہہ بادشاہ

کی شراب بھی کم کرتی رہتی تھیں - جب ایک مرتبہ دمہ کی شکایت بہت ہوئی اور طبیبوں نے جواب دیدیا اور بادشاہ نے شراب زیادہ کردی تو انہیں کی تیمارداری اور خدمت کا نتیجہ یہہ ہوا کہ شراب کم ہوگئی، مضر غذائیں بند ہوئیں اور بادشاہ کی طبیعت رفتہ رفتہ اعتدال پر آئی۔

بادشاہ کی وفات مگر بیماری کا سلسلہ کسی قدر وقفہ کے ساتھ جاری رہا حتیٰ کہ جلوس کا بائیسواں سال آیا جو جہانگیر کی عمر کا آخری سال تھا جہانگیر نے اب تزک لکھنا بند کردیا تھا۔ مرزا محمد ہادی تکملہ میں لکھتے ہیں کہ دریائے چناب پر جشن نوروز منانے کے بعد بادشاہ نے کشمیر کی طرف کوچ فرمایا۔ کشمیر پہونچکر بھی مرض میں کوئی کمی نہ ہوئی بلکہ اور اضافہ ہوگیا اور نالکی پر سوار ہوکر سیر و شکار کے لئے نکلا کرتے تھے۔ ایک روز کا واقعہ صاحب "تکملہ" لکھتے ہیں کہ

" روزے درد وجع بہ شدت کشید و آثار یاس وارتحال بر وجنات احوال "
" پرتو افگند وحرفہاے کہ بوسے ناامیداں ازاں می آمد بے اختیار بر زبان "
" جاری شد شورے عظیم در مردم افتادہ پرستاران بساط را بغایت "
" مضطرب ساخت لیکن چوں روزے چند از حیات مستعار "
" باقی بود دراں مرتبہ بخیر گذشت "

اس کے چند روز بعد بھوک اڑ گئی اور افیون جسے چالیس سال سے کھا رہے تھے اس تک سے طبیعت ہٹ گئی۔ شراب انگوری کے چند پیالوں کے سوا کسی اور طرف طبیعت بالکل رخ نہیں کرتی تھی۔ اس زمانہ میں شاہزادہ پرویز کا انتقال ہوچکا تھا شاہجہاں وادئ غربت میں مارا مارا پھر رہا تھا۔ شہریار کو مرض داء الثعلب سے

سخت تکلیف تھی۔ چہرے کے تمام بال گر گئے تھے اور شرم کے مارے سامنے حاضر نہیں ہو سکتا تھا اور علاج کرانے کے بہانہ سے لاہور میں پڑا ہوا تھا۔ بادشاہ نے بھی بھون۔ رجول اور ویرناگ (واقع کشمیر) کے سیر کا مقصد فرمایا۔ اس سیر سے بھی جب طبیعت بھر گئی تو لاہور کا ارادہ فرمایا اور راہ میں ایک مقام بیرم کلہ پر شکار سے جی بہلانا چاہا یہاں ایک بہت بلند پہاڑ تھا اسکے دامن میں بندوق اندازی کے لئے ایک نشیمن گاہ تیار کی گئی۔ زمیندار ہرنوں کو ہانک کر تیغہ کوہ پر لاتے تھے جب وہ نظر کے سامنے آتے تو بادشاہ بندوق اٹھاکر سر کرتے۔ ہرن بندوق کھاکر پہاڑ کی بلندی سے قلابازی کھاتا ہوا نیچے گرتا۔ اسی شکار کے اثنا میں ایک غریب پیادہ ہرن ہنکاتا ہوا آیا وہ ہرن پتھر کے ایک ٹکڑے پر جو نظر سے اوجھل تھا کھڑا ہو گیا۔ پیادہ نے چاہا کہ آگے بڑھ کر ہرن کو وہاں سے بھگائے۔ جیوں قدم آگے بڑھایا پھر سنبھل نہ سکے۔ وہاں سے گرا اور اسی طرح ہوا میں قلابازی کھاتا ہوا زمین پر آیا اور پاش پاش ہو گیا۔ یہ حال دیکھکر بادشاہ کی طبیعت میں شورش و آشوب پیدا ہوا اور خاطر قدسی بغایت مکدر ہوئی۔ فوراً شکار ترک فرماکر دولت خانہ پر تشریف لائے۔ یہاں اس پیادہ کی ماں نے آکر جزع فزع کرنا شروع کیا۔ بادشاہ نے بہت کچھہ زر نقد دیکر اسکی تسلی کی مگر خود اپنی تسلی نہ ہوئی اُسی وقت سے بے چینی بڑھ گئی اور آرام و قرار بالکل اٹھ گیا اور حالت متغیر ہونے لگی اور بیرم کلہ سے کوچ کرنے کا حکم فرمایا۔ اثنائے راہ میں جام شراب طلب کیا مگر منہ تک لیجاکر ہٹا لیا اور طبیعت بالکل مائل نہ ہوئی اور دولت خانہ پہونچنے تک طبیعت کا یہی حال رہا۔ رات ہوئی مگر رات مشکل سے کٹی۔ دوسرا دن ہوا مگر حالت بد سے بدتر ہوتی گئی بالآخر یکشنبہ کے روز ماہ صفر سنہ ایکہزار سینتیس ہجری (دم صفر ۱۰۳۷ھ)

کو چاشت کے وقت جلوس کے بائیسویں سال قمری حساب سے ساٹھ سال کی عمر میں
اس عالم فانی سے عالم جاودانی کی طرف انتقال فرمایا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔
شاہجہاں بمقام جونیر دکن میں تھا۔ آصف خاں نے بذریعہ ڈاک ایک شخص
کو جس کا نام بنارسی تھا اس واقعہ ہائلہ کی اطلاع دینے کو روانہ کیا اور اسکی غیبت
میں خسرو کے بیٹے داور بخش کو قید سے نکالکر تخت پر بٹھایا اور لاہور پہونچکر اس باغ میں
جو نورجہاں بیگم نے بنوایا تھا بادشاہ کو دفن کیا۔ نورجہاں بیگم اس فتنہ و تدبیر میں تھیں
کہ شہریار کو تخت پر بٹھائیں۔ آصف خاں کو اندر بلاتی تھیں وہ بہانہ کرکے ٹال دیتا تھا
یہاں جب شاہجہاں کے پاس بنارسی پہونچا تو یہ نظام الملک کے سرحد پر تھے خبر سنکر
رونے لگے مہابت خاں بھی جہانگیر کے پاس سے بھاگ کر یہاں آگیا تھا اسنے کہا اب غم
کرنے کا وقت نہیں ہے جلد روانہ ہوجئے چنانچہ شاہجہاں گجرات کے راستے سے
اکبرآباد کی طرف روانہ ہوئے اور شب پنجشنبہ چھبیس جمادی الاول کو آگرہ میں پہونچکر
تخت سلطنت پر جلوس فرمایا۔

جہانگیر کا حلیہ

مسٹر بیورج لکھتے ہیں کہ کوریاٹ نے جو جہانگیر کے زمانہ میں ہندوستان آیا تھا اوسکا حلیہ یہہ بیان کیا ہے۔

• بادشاہ کی عمر ترپن (۵۳) سال کی ہوگی اوسکے سالگرہ کے جشن کی تقریب
میرے آنے کے بعد نہایت تزک و احتشام سے منائی گئی اس روز وہ سونے کی
ایک ترازو میں تلا جسے حسن اتفاق سے اوسی روز میں نے بھی دیکھا یہہ رسم ملاناغہ
ہر سال ادا کی جاتی ہے اس کا (یعنے بادشاہ کا) رنگ نہ بہت گورا ہے اور نہ کالا بلکہ
بیچ بیچ ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ زیتون کے رنگ سے زیادہ اور کس شئے کا نام

لیکن میں اسے واضح اور صاف طور پر بیان کرسکتا ہوں۔ اسکا جسم سڈول اور خوبصورت ہے قد کسی قدر میرے قد سے متفاوت ہے لیکن بدن میرے مقابلہ میں زیادہ پُرگوشت ہے۔"

جہانگیر ایک خوبصورت آدمی تھا۔ آنکھیں بڑی بڑی۔ پیشانی خوبصورت اور ناک ستواں تھی۔ رخسار پر چھلکے رکھتا تھا جبڑے کے نیچے سے ٹھوڑی تک ڈاڑھی منڈی ہوئی تھی۔ مونچھیں مانگ پر سے کسی قدر کتری ہوئی اور دونوں طرف بڑھی ہوئی تھیں عموماً کانوں میں موتی پہنتا تھا اور دونوں بازوں پر ایک ایک لعل جن کے دونوں جانب موتی گوندھے ہوئے ہوں باندھتا تھا گلے میں موتیوں کا ہار جس میں بیچ بیچ میں لعل و یاقوت گوندھے رہتے تھے پڑا رہتا تھا۔ کمر میں خنجر باندھتا تھا جس کا دستہ و الرس کے سیاہ دانت کا بنا ہوا تھا جس کا ذکر خود جہانگیر نے اپنے تزک میں کیا ہے کہ اس کے خزانہ کی بہ نسبت سب سے نادر تر شئے تھی سر پر اسی قسم کی پگڑی رہتی تھی جو اکثر مغل بادشاہوں کی تصویروں میں نظر آتی ہے اور موتی اور لعل کے مالے سپر لپیٹے رہتے تھے۔ ہاتھوں کی کلائیوں میں بھی موتی پہنتا تھا۔

(۳)

تزک کی جہانگیر نے دو جلدیں کی ہیں۔ پہلی جلد میں اول سنہ جلوس سے بارھویں سال تک کے حالات قلمبند کئے گئے ہیں جب یہ ختم ہوئی تو بادشاہ نے حکم دیا کہ

" ایں دوازدہ سالہ احوال را یک جلد ساختہ نسخہ ہائے متعدد ترتیب "

" نمایند تو بہ بندہ ہائے خاص عنایت فرمائم و بلسائر بلاد فرستادہ "

" شود کہ ارباب دولت واصحاب سعادت دستور العمل روزگار خود "

" سازند "

دوسری جلد میں چھ سال مابعد کے حالات ہیں مگر جہانگیر نے سب اپنے قلم سے نہیں لکھے ہیں۔ سترہویں سال جلوس میں ابھی چند ماہ باقی تھے کہ بادشاہ نے اپنے ایک امیر معتمد خاں کے ہاتھ سے مسودہ تزک لکھوانا شروع کیا۔ وہ لکھتا ہے

" چوں از عارضے کہ دو سال پیش ازیں عارض شدہ بود ہنوز ہست "

" دل و دماغ ہمراہی نہ نمود کہ بمسودات سوانح وقائع توانم پرداخت "

" دریں ولا کہ معتمد خاں از خدمت دکن آمدہ سعادت آستاں بوس "

" دریافت چوں از بندہ ہائے مزاجداران و شاگردان سخن فہم بود "

" سابق نیز سررشتہ ایں خدمت و ضبط وقائع بعہدہ او بود حکم "

" فرمودم کہ از تاریخے کہ نوشتہ ام آیندہ مشار الیہ بخط خود نویسد "

" و در ذیل مسودات من داخل سازد و آنچہ بعد ازیں سوانح شود "

" بطریق روزنامچہ مسودہ نمودہ بہ تصحیح من رسانیدہ بہ بیاض "

" می سپردہ شود "

معتمد خاں کے قلم سے جس مقام سے یہ سوانح شروع ہوئی اسکے پہلے ہی سے شاہجہاں سے خفگی کا اظہار ہونے لگا تھا مگر اب واقعات زیادہ پیچیدہ ہونے لگے اور شاہجہاں کی معذرت نورجہاں بیگم کے کان بھرنے کے سامنے کچھ پیش نہ گئی اس کے بعد سے جہانگیر شاہجہاں کو ہر جگہ "بے دولت" کے لقب سے یاد کرنے لگا۔ اس طرح بقیہ سنہ ہفتدہم۔ پورا سنہ ہیزدہم اور کسی قدر سنہ نوزدہم کے حالات

معتمد خاں کے قلم کے لکھے ہوئے ہیں جن میں جہانگیر کی اصلاح ہوئی ہے
اور شاہجہاں کے ملک اڑیسہ میں داخل ہونے تک کے حالات لکھے گئے ہیں
اسکے بعد تزک کا سلسلہ ختم ہوجاتا ہے اور پھر تاریخ وفات تک نہ جہانگیر کے قلم سے
اور نہ کسی اور امیر کے قلم سے بادشاہ کی اصلاح کے بعد کوئی حالات درج کئے
جاتے ہیں۔ غالباً بیماریوں کا ہجوم۔ شاہجہاں سے کشیدگی۔ مہابت خاں کی بغاوت کے
ناشدنی واقعات۔ یہہ سب ملکر بادشاہ کی طبیعت کو استقدر مکدر کر رہے تھے
کہ اسکی طبیعت پھر اسطرف مائل ہی نہ ہوئی مگر میرزا محمد ہادی نے بعد میں بادشاہ
کی وفات اور شاہجہاں کی تخت نشینی تک کے حالات اقبال نامہ جہانگیری وغیرہ
دیگر کتب سے لیکر تکملہ کر دیا ہے۔

جہانگیر نے تزک کے نسخے شاہزادہ پرویز اور شاہجہاں کو نیز بعض امیروں
کو دئے ہیں جس کا ذکر خود تزک میں ہے۔ یہہ تمام نسخے نہایت خوش خط عمدہ
لکھے ہوئے تھے جن میں تصویریں بھی تھیں جو وقتاً فوقتاً چرندوں۔ پرندوں یا
حشرات الارض کی جہانگیر نے اسمیں داخل کی تھیں۔ اس زمانہ میں جو نسخے موجود
ہیں ان میں انڈیا آفس کا نسخہ۔ اور رائل ایشیاٹک سوسائٹی کا نسخہ اور سرسید
احمد خاں کا اصلاح کیا ہوا نسخہ یہہ تین سب میں ممتاز ہیں۔ سرسید کے اس نسخہ
کے علاوہ ان کے بھائی سید محمد صاحب کے ہاتھ کا لکھا ہوا بھی ایک اور نسخہ
ہے جو پہلے جنرل طامس ٹیپرسن اسمتھہ کے قبضہ میں تھا مگر اب انڈیا آفس میں ہے
اور قلمی نسخہ جات کی فہرست کے صفحہ ۲۳۵ پر اس کا نمبر (۲۸۳۳) ہے
سید محمد صاحب نے یہہ نسخہ کتب خانہ شاہی کے نسخوں سے ۱۸۴۳ء میں نقل کیا تھا

جو راجہ رگھوناتھ سنگھ عرف لال سنگھ جالیور کے قبضہ میں تھی سر سید احمد خاں کو بھی دہلی کے شاہی کتب خانہ سے ایک نہایت عمدہ تصویر دار نسخہ ہاتھ آیا تھا مگر ہنگامہ ۱۸۵۷ء میں جہاں اور تمام اشیا رغارت ہوگئیں یہ نسخہ بھی نہ معلوم کہاں غائب ہوگیا کتب خانہ باڈلین میں خود سر سید احمد خاں کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک نسخہ موجود ہے اور وہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے دس عمدہ نسخوں سے مقابلہ کر کے اسے لکھا ہے۔ دیکھو فہرست کتب خانہ باڈلین صفحہ ۱۱۷ نمبر ۲۲۱۔ اسی فہرست میں نمبر ۲۲۰ بھی ایک عمدہ نسخہ ہے مگر اسمیں صرف چودھویں سال تک کے حالات ہیں۔

تزک جہانگیری کا ایک اُردو ملخص منشی احمد علی صاحب رامپوری نے کیا ہے یہ رامپورہ جہاں کے منشی صاحب رہنے والے تھے ریاست ٹونک میں واقع ہے مترجم کی نظر سے یہ نسخہ گذرا ہے یہ لفظی ترجمہ نہیں ہے بلکہ رواں ترجمہ ہے اور اسمیں بھی بہت کچھ کمی کی گئی ہے۔ گو واقعات خلاف نہیں کئے ہیں مگر عبارت مختصر کردی گئی ہے ۱۸۷۴ء (۱۲۹۱ھ) میں یہ ترجمہ منشی نولکشور کے مطبع میں طبع ہوا تھا۔ منشی دیبی پرشاد نے بھی تزک کا ایک ملخص ہندی زبان میں کیا ہے جو مسٹر بیورج کو مسٹر اروِن نے دیا تھا۔ اُنہوں نے دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہ بھی لفظی ترجمہ نہیں ہے بلکہ ملخص ہے جس میں منشی احمد علی کے ترجمہ سے بھی زیادہ اختصار سے کام لیا گیا ہے۔ یہ ہندی ترجمہ ۱۹۰۵ء میں مطبع بھارت متر کلکتہ میں طبع ہوا ہے مسٹر بیورج لکھتے ہیں کہ مسٹر بلن ہارٹ نے فہرست نسخہ جات ہندوستانی کے صفحہ (۶۱) پر جس اُردو ترجمہ کا ذکر کیا ہے اور دوسرا ترجمہ جس کا موسیو گارسان د تاسی نے حال بیان کیا ہے یہ سب اقبال نامہ کے ترجمے ہیں نہ کہ تزک جہانگیری کے

تزک کی زبان نہایت صاف، شُستہ اور سریع الفہم ہے۔ علامہ شبلی جہانگیر کی قوت تحریر کے متعلق لکھتے ہیں کہ

"وہ ہر قسم کے واقعات کو جس خوبی، سادگی، صفائی اور بے تکلفی"
"سے بیان کرسکتا ہے اور ساتھ ہی زبان کا بھی لطف قائم رکھتا"
"ہے فارسی انشا پردازوں میں کسی سے بن نہیں آسکتا۔۔۔۔"
"تزک جہانگیری میں وہ جس صوبہ یا شہر کا حال لکھتا ہے۔ اس کی"
"ابتدائی تاریخ، مساحت، پیداوار کے اقسام، آب و ہوا، اثمار"
"واشجار، رسوم و عادات ایک ایک چیز کو نہایت تفصیل سے"
"لکھتا ہے"۔

مثال کے طور پر کشمیر کے حالات جو اسنے لکھے ہیں انہیں کسی قدر اقتباس کرکے یہاں درج کیا جاتا ہے جس سے کشمیر کا حال اور جہانگیر کے قوت بیان وتذکرہ حالات کا اندازہ ہو سکے گا۔

کشمیر کا حال جہانگیر کشمیر ہمیشہ جاتا رہتا تھا اور اُسکا سفر براہ گجرات و بھمبر (پنجاب) ہوا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ اسی سفر کے بیان میں دریائے جہلم (بہٹ) کا حال لکھا ہے۔ وہاں خواص پور میں اسکا پڑاؤ تھا کہ سخت آب باراں نے آگھیرا۔ اور مرغی کے انڈے کے برابر اولے گرے۔ دریائے جہلم کا منبع کشمیر کے چشمہ ویرناگ میں ہے جو شہر کشمیر کے بیس کوس کے فاصلہ پر ہے۔ اسکا پانی اسقدر صاف ہے کہ خشخاش کا ایک دانہ جب تک تہ سے نہ لگ جائے برابر نظر آتا رہتا ہے۔ یہاں اسنے ایک باغ بنوایا۔ نہریں نکلوائیں گرداگرد وسیع مکانات

ہو اُسے اور ایسی جگہ تیار ہو گئی کہ " دنیا کے سیاح کم ایسے مقامات بتا سکیں گے"
کشمیر کی کاشت زعفران کے متعلق لکھا ہے کہ

" شہر سے دس کوس پر جب دریا ے۔ بہٹ (جھیلم) موضع پامپور "
" پہونچتا ہے تو وسیع ہو جاتا ہے کشمیر کی تمام زعفران اسی موضع "
" میں پیدا ہوتی ہے۔۔ ۔۔ ۔۔سالانہ پانسو ہندوستانی من کی "
" پیداوار ہے۔۔ ۔۔ ۔۔جس موسم میں پہول آتا ہے اوسوقت میں "
" والد بزرگوار کے ہمراہ اس مقام پر آیا تھا۔ دنیا کے دوسرے "
" پودوں میں پہلے شاخیں نکلتی ہیں پہر پتیاں اور پہول۔ مگر زعفران "
" میں جب اس کا تنہ خشک زمین سے چار انگل باہر نکل آتا ہے "
" تو اُسمیں چار پنکھڑی والے سوسنی رنگ کے پہول نکلتے ہیں اور "
" وسط میں گُل معصفر کی طرح نارنجی رنگ کے چار ریشے نکلتے ہیں "
" جنکی لمبائی بند انگشت کے برابر ہوتی ہے یہی زعفران ہے۔ "
" زمین پر نہ تو ہل چلایا جاتا ہے اور نہ پانی دیا جاتا ہے۔ مٹی کے "
" ڈہیلوں میں سے پودا نکلتا ہے اس کا تختہ کہیں ایک کوس "
" کا ہوتا ہے اور کہیں نصف کوس کا اور دور سے بہت بھلا "
" معلوم ہوتا ہے چنوائی کے وقت اسکی تیز خوشبو سے میرے "
" تمام ملازموں کے سر میں درد پیدا ہو گیا۔ گو میں شراب پیا کرتا "
" تھا اور ایک گلاس اُسوقت پیا بھی لیکن میرے سر میں بھی درد "
" پیدا ہو گیا۔ ۔۔ ۔۔ دریائے جہیلم تک شہر سے گذرتا ہے "

" اسکا پاٹ اکثر جگہ ایک تیر کے پرتاب سے زیادہ نہیں مگر اسکا "
" پانی بھاری اور ہاضمہ کیلئے اچھا نہیں ہوتا اسلئے کوئی نہیں پیتا "
" اور کشمیر کے تمام لوگ ایک جھیل کا پانی پیتے ہیں جو شہر کے قریب "
" ہے اور ڈل کے نام سے موسوم ہے۔"

اس کے بعد ایک موقعہ پر وادی کوری مرگ کی تعریف لکھتا ہے:۔

" چوں تعریف ایلاق کوری مرگ مکرر شنیدہ بود در ینولا خاطر بہ "
" تماشائے آں بسیار رغبت افزود در روز سہ شنبہ ہشتم امرداد بداں "
" صوب سواری شد از تعریف آں چہ نویسد چندانکہ نظر کاری کرد "
" گلہائے الوان شگفتہ و درمیاں سبزہ و گل جدول ہائے آب "
" رواں در غائت لطافت وصفا۔ گوئے صفا الیست از تصویر "
" کہ نقاش قضا بقلم صنع نگاشتہ دلہا از تماشائے آں می شگفت "
" بے تکلف آں ایلاق (مرغزار) را نسبت بہ دیگر ایلاقات "
" نیست و بہترین سیرگاہ ہائے کشمیر می تواں گفت۔"

کشمیر میں جو پرند ہوتے ہیں اُنکی فہرست یہ دی ہے

" کلنگ۔ سارس۔ طاوس۔ چرز (توغدار) لکلک۔ تغدا ع "
" دوسری قسم کا توغدار) کرد انک۔ زرد تلک۔ نقرہ پے۔ عمر پے "
" بوزہ لکلک۔ حواصل۔ کمہ۔ بگلا۔ قاز۔ کونکلا۔ دراج۔ شاوک "
" نول سرخ۔ پہ۔ ہاریل۔ دھینگ۔ کویل۔ شکر خوارہ۔ "
" موکما۔ غہرلات۔ دہنش کلچڑی۔ ٹیڑے کہ من اور ابد آواز "

"تمام کردہ ام"

طاعون کا حال

اسی طرح اسنے طاعون کا ذکر کیا ہے اور جس خوبی سے اسے بیان کیا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسکے قلم میں کس قدر زور تھا وہ لکھتا ہے کہ

" اس سال (یعنی گیارہویں سال جلوس) بلکہ سال دہم ہی میں "
" ہندوستان کے مقامات پر ایک عظیم وبا ظاہر ہوئی اور اس بلا "
" کا آغاز پنجاب کے پرگنوں سے ہوا۔ رفتہ رفتہ یہہ بلا لاہور "
" میں پہونچی اور بہت لوگ مسلمان ہندو اسمیں ضائع ہوئے "
" اسکے بعد سرہند وامیانہ دو آب و دہلی اور اس کے پرگنہ جات "
" اطراف واکناف تک پھیل گئی۔ لیکن ان ایام میں بہت کچھہ "
" تخفیف ہو گئی ہے بڑے بڑے عمر کے لوگ کہتے ہیں اور پرانی "
" تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہہ وبا اس ملک میں کبھی نہیں "
" آئی تھی بعض حکیموں اور دانشمندوں سے دریافت کیا گیا "
" بعض کہتے ہیں کہ جب دو سال تک متواتر خشک سالی ہو اور "
" موسم بارش میں مینھہ کی کمی ہو تو اوس عفونت کی وجہ سے جو "
" خشکی اور کمی باراں سے پیدا ہو جاتی ہے یہہ حادثہ واقع ہوتا "
" ہے بعضوں نے دوسرے وجوہات بتائے۔ العلم عند اللہ۔ "

اپنے جلوس کے تیرہویں سال کے حالات میں پھر اسکا ذکر کرتا ہے کہ

" ان دنوں دولت خواہوں کی عرضیوں سے مکرر یہہ بات معلوم ہوئی "

"کہ شہر آگرہ میں طاعون کی بیماری شائع ہے چنانچہ ایک دن میں"
"کم و بیش سو آدمی بغل میں یا کنج ران یا گلے کے نیچے گلٹی نکلنے"
"سے ضائع ہوئے یہہ تیسرا سال ہے کہ جاڑے کے موسم میں یہہ بیماری"
"بڑہتی ہے اور گرمیاں شروع ہوتے ہی غائب ہوجاتی ہے۔ حیرت"
"یہہ ہے کہ ان تین سال میں آگرہ کے ہر قصبہ و قریہ میں یہہ بیماری"
"نمودار ہوئی مگر فتحپور میں اصلا اس کا اثر نہ ہوا۔"

اس بیماری کا حال آصف خاں کی لڑکی سے جو خان اعظم کے لڑکے عبد اللہ خاں کو بیاہی گئی تہی سنکر اس صراحت کے ساتھ لکہتا ہے۔

صبیہ آصف خاں مرحوم کہ درخانہ عبد اللہ خاں پسر خان اعظم است نقلے عجیب غریب گذرانیدہ بہ نہایت تاکید در تصحیح آں نمود بجہت غرابت مرقوم گشت۔ گفت روزے در صحن خانہ موشے بنظر در آمد سراسیمہ افتاں و خیزاں بطرز مستاں ہر سو می رفت و نمی دانست کہ بکجا می رود بہ یکے از کنیزاں گفتم کہ دم آں را گرفتہ پیش گربہ انداخت گربہ بشوق و میل از جاے جستہ موش را بدہن گرفت و فی الفور گذاشتہ نفرت ظاہر ساخت۔ رفتہ رفتہ آثار ملال و آزردگی از چہرۂ او پیدا شد روز دیگر

آصف خاں مرحوم کی لڑکی نے جو خان اعظم کے بیٹے عبد اللہ خاں کے عقد میں ہے ایک عجیب غریب نقل بیان کی اور نہایت تاکید سے کہا کہ یہہ بالکل صحیح واقعہ ہے۔ چونکہ یہہ بالکل نئی قسم کی ہے اسلئے درج کی جاتی ہے۔ اس نے بیان کیا کہ ایک روز گہر کے صحن میں ایک چوہا نظر آیا جو پریشان گرتا پڑتا شرابیوں کی طرح ہر طرف دوڑ کر جاتا تہا اور نہیں جانتا تہا کہ کہاں جاؤں۔ ایک کنیز سے میں نے کہا کہ اسکی دم پکڑ کر بلی کے سامنے ڈالدو بلی نے بہت رغبت اور شوق سے اپنی جگہ

نزدیک مردن رسید بخاطر گذشت کہ اندک
تریاق فاروقی باید داد چوں دہانش کشودہ
شد کام و زبان سیاہ بنظر در آمد تا سہ روز
بحال تباہ گذرانیدہ در چہارم بہوش آمد
بعد ازاں کنیزکے را دانہ طاعون ظاہر شد
از افراط سوزش و فزونی درد آرام و قرار
ہیچ درو نماندہ و رنگش متغیر گشت زردی بسیاہی
مائل و تپ محرق کرد روز دیگر اسہال
اطلاق شدہ درگذشت و بہ ہمیں روش
ہفت و ہشت کس در آں خانہ ضائع گشتند
وچندے بیمار بودند کہ ازاں منزل برآمدہ
بباغ رفتم۔ آنہانیکہ بیماری داشتند در باغ
فوت شدند و در انجا دیگرے دانہ برنیاورد۔

سے کودکر چوہے کو مُنہ میں لیا مگر فوراً ہی چھوڑ
دیا اور اس سے نفرت کرنے لگی رفتہ رفتہ اس کے
چہرہ سے ملال و آزردگی کے آثار ظاہر ہونے
لگے اور دوسرے روز مرنے کے قریب ہو گئی
دل میں آیا کہ تھوڑی تریاق فاروقی دینی
چاہیئے۔ جب اس کا مُنہ کھولا گیا تو تالو اور
زبان سیاہ نظر آئے۔ تین روز تک اس نے
نہایت تباہ حال بسر کیا۔ چوتھے روز ہوش
میں آئی اسکے بعد ایک کنیز کے طاعون کی گلٹی نظر
آئی اور اسقدر زیادہ جلن اور درد تھا کہ اُسے
آرام و قرار نہیں ملتا تھا۔ اسکا چہرہ متغیر ہو گیا
اور اسکے رنگ کی زردی سیاہی سے بدل گئی
اور تپ محرقہ ہو گئی۔ دوسرے روز اسے قے
کی اور دست آئے اور مر گئی۔ اس گھر کے سات
آٹھ آدمی اور اسی طرح مر گئے اور کچھ اور بیمار
پڑے کہ میں اس مکان سے باغ میں اٹھ گئی جو
بیمار تھے وہ گذر گئے لیکن یہاں اور کسی کے گلٹی
نہیں نکلی۔

مسٹر بیورج لکھتے ہیں کہ "تزک بابری۔ حیدر مرزا کی کتاب تاریخ رشیدی اور

اور گلبدن نامہ کا ترجمہ انگریزی زبان میں ہو گیا ہے اور شاہ طہماسپ کی کتاب کا ترجمہ جرمنی زبان میں ہوا ہے لیکن سوء تقدیر سے جہانگیر کا پورا ترجمہ کبھی نہیں ہوا الیٹ اور ڈاسن کی تاریخ میں چند اقتباسات ہیں اور میجر پرائس نے عرصہ ہوا کہ اسکے تزک سے اکثر حالات بڑی رنگ آمیزی کے ساتھ ایک نامکمل مسودہ کی شکل میں ترتیب دئے تھے بایں ہم تزک جہانگیری دلچسپی کے لحاظ سے تزک بابری سے کچھ کم نہیں ہے بلکہ ہم یہہ کہہ سکتے ہیں کہ اسمیں تزک بابری سے دوچند مواد موجود ہے اور ان دونوں کتابوں میں یہہ کتاب یعنی تزک جہانگیری بہت زیادہ دلچسپ ہے۔ یہہ اس وجہ سے نہیں کہ جہانگیر اتنا بڑا آدمی تھا جتنا کہ اسکا پردادا (بابر) تھا۔ وہ تو ایک ایسا شخص تھا جس میں سب سے زیادہ خامیاں تھیں اور خود اس نے اپنا جو کچھ حال لکھا ہے اُسے پڑھ کر ہمیں اس سے نفرت سی ہوتی ہے لیکن اُسمیں اتنی سمجھ ضرور تھی کہ تزک کو صرف اپنے حالات تک محدود نہیں رکھا ہے اور اس نے اپنے باپ اکبر اعظم کی ایک ایسی تصویر دی ہے جو دلچسپی کے لحاظ سے تزک بابری سے کہیں زیادہ ہے۔ جہانگیر نے خود اپنے جو حالات بیان کئے ہیں انہیں بھی ایک قسم کی دلچسپی ضرور ہے کیونکہ انہیں پڑھ کر یہہ معلوم ہوتا ہے کہ یہہ کس قسم کا آدمی تھا۔

"تزک جہانگیری کی اہمیت کے متعلق کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں ساتویں صدی عیسوی کے ابتدائی زمانہ میں ہندوستان کی جو حالت تھی وہ جس صفائی اور خوبی کے ساتھ اس کتاب سے معلوم ہو سکتی ہے کم کتابوں سے معلوم ہو سکے گی۔ اگر اسے اکبرنامہ کے ایک ضمیمہ کے طور پر سمجھا جائے تو نہایت اچھا

ہوگا۔ مسٹر بیوریج نے ۱۹۰۶ء میں انڈین میگزین میں بھی تزک جہانگیری پر ایک مضمون لکھا تھا اوس میں وہ لکھتے ہیں کہ

" مشرق کے بعض بادشاہ جنہوں نے کتابیں لکھی ہیں ان میں بمقابلہ "
" اُن بادشاہوں کے جن کی ہورلیس والپول نے فہرست دی ہے "
" زیادہ حیات کے آثار بیّن پائے جاتے ہیں۔ ان کی نظیر ڈہونڈہنے "
" کیلئے ہمیں جولیس سیزر کے زمانہ تک جانا چاہیئے لیکن پہر بھی "
" یورپ کا پلہ بھاری نظر نہ آئیگا۔ اس مشہور رومی بادشاہ کے "
" (کتاب کی) جس قدر شرح ہیں سب کسی قدر مایوس کن ہیں اور "
" اس میں شک نہیں کہ بابر اور جہانگیر کی کتابیں جیگم اُسے گیلک کے "
" قصہ سے زیادہ معقول اور زیادہ دلچسپ مواد سے پُر ہیں۔ تمام "
" مسلمانوں کو تاریخ نگاری اور اپنی سوانح لکھنے کا شوق رہا ہے "
" حتیٰ کہ بعض مسلمان بادشاہ بھی اسی شوق میں گرفتار نظر آتے "
" ہیں چنانچہ وسطی ایشیا نے تزک تیموری۔ تزک بابری۔ حیدر میرزا "
" کی تاریخ رشیدی۔ وقائع ابوالغازی یہہ کتابیں ہمارے سامنے "
" پیش کیں۔ فارس نے شاہ طہماسپ کی تزک مہیا کی۔ اور "
" ہندوستان نے گلبدن بیگم کی کتاب۔ اور جہانگیر کی تزک ہمیں "
" دی اور اس موجودہ زمانہ میں بھی ہم دیکھہ رہے ہیں کہ یہہ شوق "
" الی الآن باقی ہے اور افغانستان کے امیر مرحوم (عبدالرحمن خان) "
" کی خود تحریر کردہ سوانح عمری اور شاہ ایران (ناصرالدین قاچار) کا "

"روزنامچہ (بطور مثال کے) ہمارے سامنے موجود ہے۔"

انگریزی زبان میں تزک جہانگیری کا ترجمہ بعض لوگوں نے کیا ہے مگر خام مسٹر ولیم ارسکن اور میجر ڈیوڈ پرائس نے جو ترجمے کئے وہ بالکل ناقص ہیں اور ان میں اسقدر الحاقات ہیں کہ ان کے اعتبار میں فرق آگیا ہے مسٹر بیورج نے ان سب ترجموں کو ناقص سمجھکر خود ایک ترجمہ کیا ہے جو رائل ایشیاٹک سوسائٹی نے ۱۹۰۹ء میں طبع کرایا ہے۔ اس ترجمہ میں بھی مرزا محمد ہادی کا تکملہ داخل نہیں ہے اور صرف اسی قدر حصّہ کا ترجمہ ہے جو جہانگیر کے اپنے قلم کا لکھا ہوا یا معتمد خاں سے لکھوایا ہوا ہے۔

ان چند اوراق میں جو اُردو ترجمہ ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے یہ سرسید کی اصلاح شدہ فارسی نسخہ تزک اور مسٹر بیورج کے انگریزی ترجمہ کی مدد سے کیا گیا ہے اور اس میں مرزا ہادی کے دیباچہ اور تکملہ دونوں کا ترجمہ ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ شاید اس سے وہ کمی کسی قدر پوری ہوجائے جو اس کتاب کے اُردو زبان میں نہ ہونے سے محسوس کی جارہی تھی۔

مطربہ

جناب عزیز احمد خاں صاحب بی۔ اے

مطربہ فسوں طراز ساز طرب بجائے جا
آگ سی اک لگائے جا سیل سی اک بہائے جا

(۱) زمزمہ حیات سے ہستیٔ دل مٹائے جا
اپنے خمار چشم سے مست مجھے بنائے جا
رقص سرود و رنگ سے دل کو مرے لبھائے جا
نغمۂ دل پسند سے روح میں تو سمائے جا
مطربہ فسوں طراز ساز طرب بجائے جا
آگ سی اک لگائے جا سیل سی اک بہائے جا

(۲) نشۂ لحن میں تیرے میرا دماغ چور رہے
دل میں ترے سرود سے کیفیت سرور رہے
تیری نوائے دلکشا آنکھ میں وجہ نور رہے
آرزوئے شکستہ کے حق میں صدائے صور رہے
مطربہ فسوں طراز ساز طرب بجائے جا
اگ سی اک لگائے جا سیل سی اک بہائے جا

(۳) تیرا دہن ہے نغمہ سنج بیخودیٔ شباب سے
نیل سرود ہے رواں چشمۂ آفتاب سے

پردہ میں نغمہ ریز ہے کوئی لبِ رباب سی
چشمِ مجاز باز سے اُٹھنے لگے حجاب سے

مطربہ فسوں طراز سازِ طرب بجائے جا
آگ سی اک لگائے جا سیل سی اک بہائے جا

(۴) تیری معیت حسین میرا جمال زندگی
تجھ پہ فدا ہوں جان و دل ہے یہ مآل زندگی
بڑھتا ہے تیرے نغمہ سے میرا نہال زندگی
جذبِ سرودِ روح ہو ہے یہ کمال زندگی
مطربہ فسوں طراز سازِ طرب بجائے جا
آگ سی اک لگائے جا سیل سی اک بہائے جا

دیکھئے دشت میں کیا حشر بپا ہوتا ہے

جناب حاجی محمد صادق صاحب صادق ایچ پی

دیکھئے دشت میں کیا حشر بپا ہوتا ہے؟ — عازم راہ کوئی آبلہ پا ہوتا ہے
ڈوبنے والے بھی ساحل پہ پہنچ جاتے ہیں — کون دریائے حقیقت میں فنا ہوتا ہے؟
میں نے مانا ہی غلط فلسفۂ جذب و کشش — کون پھر دیدۂ عاشق میں چھپا ہوتا ہے؟
داغ ہے پرسشِ آزارِ محبت کیوں ہے؟ — چارہ گر! درد مرا اور سوا ہوتا ہے
کس کا رہتا ہے تصور دلِ محزوں میں مدام؟ — کون آنکھوں میں مرے جلوہ نما ہوتا ہے؟
عوضِ اشک ٹپکتا ہے لہو کیوں صادق؟ — راز فاش آج قیامت سے مرا ہوتا ہے
کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیا ہوتا ہے — حق میں دشمن کے مرا نالہ دعا ہوتا ہے
کر رہے ہیں وہ دلِ زار کے زخموں کا شمار — آج اندازۂ اربابِ وفا ہوتا ہے
رہِ امید میں کیا غیر کی حاجت مجکو! — نقش پا آپ مرا راہ نما ہوتا ہے

کاٹنا قیدِ مصیبت کا ہے آسان کوئی!
مر کے صادق کہیں انسان رہا ہوتا ہے

غزل

جناب مجنوں گورکھپوری

بے رخی ناروا نہیں نہ سہی
میرے شکوے بجا نہیں نہ سہی

میں ہی ذوقِ وفا سے عاری ہوں
خیر تم بے وفا نہیں نہ سہی

دل ہی میرا بلا کا پتلا ہے
زلف دامِ بلا نہیں نہ سہی

مان لیتا ہوں "سب قصور مرا"
کچھ تمہاری خطا نہیں نہ سہی

آپ کے گیسوؤں کی عمر دراز
میرے نالے رسا نہیں نہ سہی

معلومات

جناب عزیز احمد خاں صاحب بی اے

شمالی افریقہ میں تُوارگ نامی ایک خانہ بدوش قبیلہ آباد ہے جس کا اصلی ذریعۂ معاش و خوراک اونٹ ہیں۔ توارگ عورتیں یورپ کی عورتوں کی طرح آزاد ہیں۔ وہ بے پردہ پھرتی ہیں اور اسکے بخلاف مرد ہمیشہ نقاب پوش رہتے ہیں۔ یہہ عورتیں اپنے شوہروں کا انتخاب آپ ہی کرتی ہیں اور اپنے بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھاتی ہیں وہ شادی کے بعد بھی اپنی جائداد پر قبضہ رکھ سکتی ہیں اور ان کے شوہروں کا اُس جائداد پر کوئی اختیار نہیں ذات اور عہدوں کی وراثت ماؤں کے ذریعہ سے ملتی ہے۔ عہ

برطانیہ عظمیٰ کی جس کمپنی میں مزدوروں کی تعداد سب سے زیادہ ہے وہ لندن مڈلینڈ اینڈ اسکاٹش ریلوے ہے اس کمپنی کی فہرست میں ۲۷۰۰۰۰ مزدوروں کی تعداد مندرج ہے۔

حال ہی میں انگلستان کی ایک نمائش میں ایک بجلی سے چلنے والی پلیٹ دھونے کی مشین پیش کی گئی تھی جو بیان کیا جاتا ہے کہ ایک گھنٹہ میں ۱۰۰۰ برتن دھو سکتی ہے

جب آپ اس کے بعد کوئی ایسا بیان پڑھیں جس نے آپ کے رونگٹے کھڑے

عہ اس کو پڑھکر ہندوستان میں بہت سی ہستیاں رشک کرینگی لیکن افسوس کے مردوں سے خیالی جنت شکست ہو جائیگی
مدیران

کردئے ہوں تو آپ اس خیال پر سے سرسری طور پر نہ گزر جائیے کہ یہہ ادبی لفاظی ہے اور یہہ کہ اس مقولہ کو اس کے لفظی معنوں میں نہیں لینا چاہیئے بلکہ یہہ پیش نظر رکھئے کہ اب یہہ حقیقت بے نقاب ہو گئی ہے کہ اچانک اور سخت دہشت کے زیر اثر واقعی طور پر سب جسم کے بال کھڑے ہو جاتے ہیں۔

ہر بال ایک باریک لیکن مکمل نس کے سہارے پر قائم ہے۔ نرمی کی حالت میں یہہ نس بال کو ڈھیلا چھوڑ دیتی ہے لیکن جب جوش کی حالت میں سخت ہو جاتی ہے (جو ہر قسم کا جوش نسوں پر اثر ڈالتا ہے) تو وہ بال کو کھینچتی ہے اور اس امر کا انحصار بال کے طول اور عوت کی مقدار پر ہے کہ بال صرف خفیف طور پر جنبش میں آئیگا یا سخت ہو جائیگا یہہ صورت اسی طرح عمل میں آتی ہے جسطرح کہ کُتے کی دم کے بال لڑنے سے پہلے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ زوردار جذبہ نسوں کو حرکت میں لے آتا ہے۔ بال کی نس کی حرکت ہمارے قبضہ قدرت سے باہر ہے اسکا عمل خود بخود ہوتا ہے۔

حال ہی میں مسٹر جسٹس ایو نے اپنی تقریر میں پیانو بجانے والے بچوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اگر ان کے بس میں ہوتا تو وہ انہیں غرقاب کر دیتے۔ یہہ کوئی نئی بات نہیں ہے واقعہ ہے کہ انقلاب فرانس کے دوران میں دو حسین نوجوان لڑکیاں پیانو بجا رہی تھیں۔ لی بان اتفاقاً ان کی کھڑکی کے پاس سے گذرا اور اسکی آواز سُن لی۔ لی بان نے ان دونوں لڑکیوں کو ان کی جمیل اور معصوم صورتوں اور کمسنی کے باوجود سولی پر صرف اس خطا پر چڑھا دیا تھا کہ اُنھوں نے جمہوری شکست کے زمانہ میں ایسا راگ بجایا جس سے مسرت اور انبساط کی لہریں نکل رہی تھیں۔

تاش جو آجکل کھیلا جاتا ہے ۔اسے ایک فرانسیسی مصور جاکوئیس گرنگونیور نے چودہویں صدی میں مخبوط الحواس چارلس ششم شاہ فرانس کی تفریح طبع کے لئے ایجاد کیا تھا۔ تاش کے بادشاہ افسانۂ کہن کے داؤد اسکندر، سیزر اور چارلس تھے اور رانیاں ارگسٹین ایسٹھر جوڈتھ اور پلاس تھیں۔

تاش بنانیوالوں کی کمپنی ۱۶۲۹ء میں قائم ہوئی اور جیمس اول کے عہد میں ان پر ٹیکس لگایا گیا۔ غالباً انگلستان میں تاش کا جو پہلا کھیل کھیلا گیا وہ "ٹرمپ تھا۔ تقریباً کل اہم ترین تاریخی واقعات تاش کی سطح پر منتقل کئے گئے ہیں اور بعض کارڈ تو بہت نادر اور بیش بہا ہیں۔

مسٹر ود ریڈنبرگ نے لچکدار شیشہ ایجاد کرکے انگلستان کے لئے ایک زبردست امتیاز حاصل کیا ہے اس شیشہ کی سلاخ کے ایک سرے کو پاؤں کے نیچے دباکر دوسرے سرے کو ہاتھ سے پکڑ کر خم کیا جاسکتا ہے۔ اس شیشہ کے ریزے نہیں ہو سکتے' یہہ لچکتا ہے اور آسانی سے خمیدہ ہو سکتا ہے بایں ہمہ معمولی گلاس سے دس گنا زیادہ شفاف ہے ٹینس کھیلنے کی گیندیں بھی اسی شیشے کی بنائی گئیں ہیں۔

ماہرین زراعت کی اُمیدوں کے خلاف وہ تخم جو ایک سال قبل اُڈاہ کے قدیم غاروں میں پائے گئے تھے اور بیان کیا جاتا ہے کہ ۹۰۰ اور ۱۲۰۰ سال کے درمیان کی عمر رکھتے تھے بار آور ہونے لگے ہیں۔ اڈاہ میں ایک کسان نے ان بیجوں سے کئی کھیت لگائے ہیں۔

اس اناج کے تخم اس حالت میں پائے گئے تھے کہ ان پر اٹھارہ انچ ریت جمی ہوئی تھی اور ایسے غاروں میں تھے جو اب سے صدیوں قبل آباد تھے۔

سولہ ماہ قبل ایک ایسے واقعہ کے لئے تیاری کرنا جو صرف چوتھائی منٹ برقرار رہے نہایت مضحکہ انگیز معلوم ہوتا ہے لیکن ہیئت دان ایک سورج گرہن پر اپنی توجہ منعطف کر رہے ہیں جو ۲۹ر جون ۱۹۲۷ء کو وقوع پذیر ہوگا اس قسم کے مکمل گرہن کا واقعہ دو سو سال کے عرصہ کے بعد پہلی مرتبہ پیش آنیوالا ہے۔

اس موقع پر یہ اُمید کیجا رہی ہے کہ پروفیسر اینسٹین (جرمن موجد) کے اس نظریہ کی صحت کی آزمائش کیجائے گی کہ روشنی کی لہریں بجائے خط مستقیم میں راستہ طے کرنے کے (جیسا کہ عموماً خیال کیا جاتا ہے) خمیدہ ہو کر سفر کر سکتی ہیں۔

ایک جدید طرز کے ہوائی جہاز کی تیاری نے انجنیروں اور ہوابازوں کے لئے دلچسپی کا سامان پیدا کر دیا ہے اسکو اس وضع سے بنایا گیا ہے کہ اگر اتفاقاً انجن خراب ہو جائے اور نیچے گر جانے کا اندیشہ ہو تو اسکے شہپر فوراً نیچے جھک کر ایسی شکل اختیار کر لیتے ہیں کہ زمین پر پہونچنے کے بعد جہاز محفوظ رہتا ہے۔

ایک فرانسیسی روشنی کے مینار میں حال میں ایک خود بخود بجنے والی کُرے کی گھنٹی قائم کی گئی ہے جو کہا جاتا ہے کہ دور حاضرہ کی تازہ ترین زبردست جدتوں میں سے ایک ہے اس کا عمل ہوا کی تری سے واقع ہوتا ہے۔

لیکن اس سے بھی کہیں زیادہ عبرتناک کرشمہ ساحل ڈیلین میں زیر تعمیر ہے

یہاں کہرے کے باعث روشنی کے کم ہونے کی حالت ایک گھنٹی کے بجنے کا باعث ہوتی ہے۔ یہ ایک آئرلینڈ کے باشندہ کی زبردست ایجاد ہے اور تمام دنیا میں اپنی طرز کی واحد مشین ہے

میجر ہے نیسی شاہ انگلستان کے محل کے وائس چیرمین مقرر ہوئے ہیں۔ شاہی خانہ داری کی خدمات کے علاوہ ان کا ایک فرض یہ قرار پایا ہے کہ ہز مجسٹی کے لئے پارلیمنٹ کی رپورٹ لکھیں۔ ہز مجسٹی مجلس عوام کی کارروائی کا بہت دلچسپی سے مطالعہ کیا کرتے ہیں۔ یہ رپورٹ ہر رات آٹھ بجے کے قریب تیار کیجاتی ہے اور لابی پوسٹ آفس کے سپرد کردی جاتی ہے۔ یہاں سے کل خبریں بکنگھم پیلس یا سینڈرنگھم کو ٹیلیگراف کے ذریعہ سے روانہ کیجاتی ہیں۔ یہ رپورٹ تقریباً ۲۰۰ الفاظ پر مشتمل ہوتی ہے اور ڈنر سے پہلے ہز مجسٹی کو وصول ہوجاتی ہے اور اسکا مضمون اکثر میہمانوں کے بھی گوش گزار کیا جاتا ہے۔

جوہانسبرگ میں ایک "گڈ مارننگ کلب" قائم ہوا ہے۔ اسکے اراکین اس امر کا حلفیہ عہد کرتے ہیں کہ وہ جس کسی سے ملینگے فوراً گڈ مارننگ کی صدا لگائینگے۔

سیوا میں جو شت لیمان کی گم شدہ دنیا کا متروک پایۂ تخت ہے بیویوں کی قیمت فی کس ۲۴ شلنگ ہے۔

ہوا بازوں کی رہنمائی کرنے کیلئے یہہ انتظام کیا جارہا کہ بڑے بڑے کارخانوں اور عمارتوں کی چھتوں پر شہروں کے نام نہایت جلی الفاظ میں جنکی گہرائی ۱۲ فیٹ ہوگی لکھے جائیں۔

تمباکو کی صنعت میں مصنوعی آنکھ کا استعمال کیا جارہا ہے جو ایک ہی رنگ کی تیس ۳۰ مختلف جھلکوں کو معلوم کرسکتی ہے۔ اس طرح رنگکار کے مدارج ان رنگ کی جھلک سے قرار پارہے ہیں۔

امریکہ اس اعتبار سے دیگر ممالک کے مقابلہ میں ممتاز حیثیت رکھتا ہے کہ وہاں کے ہر کام کے متعلق ترتیب دیجاتی ہے حال ہی میں امریکہ کے باشندوں نے یہہ محسوس کرکے کہ دن بدن طلاقوں کی تعداد برسر ترقی ہے اور اس نتیجہ پر پہونچکر کہ اسکی وجہ بیویوں کے نا اہلیت ہے بوسٹن یونیورسٹی میں بیوی بننے کی تعلیم کے لئے ایک شعبہ کھولا ہے جو اپنی طرز کی دنیا میں تنہا مثال ہے۔ اس شعبہ کے صدر ڈاکٹر ڈیوس ہیں اور مسز ایلزبیتھ میکڈانلڈ بیاہ کے معاملات کی معلم ہیں حسب ذیل موضوعات پر تعلیم دیجاتی ہے۔ انتخاب شوہر۔ آمدنی کی تقسیم اور تعلقات زن وشوہر کی ناکامیابی وغیرہ وغیرہ زندگی کے اہم مسائل پر مشتمل ہوتے ہیں اور ان کا بیشتر حصہ نفسیاتی مطالعہ پر مبنی ہوتا ہے مثلاً امتحان میں اس قسم کے سوالات پوچھے جاتے ہیں کہ اگر بیوی کو یہہ خبر ملے کہ آج شام اس کے شوہر نے اپنی خوبصورت معتمد کے ساتھ ڈنر کھایا ہے تو اسے اس کے ساتھ کس طرح پیش آنا چاہیئے۔ بایں ہمہ طلاق کا اصلی مسئلہ حل نہیں ہوسکا۔ اور طلاق لینے والیوں کی تعداد جن میں گریجوئیٹ عورتیں زیادہ ہیں بڑھ رہی ہے ۱۹۲۲ء میں

... ۱۶۷۵ طلاق دئے گئے اور یہہ یقین کیا جاتا ہے کہ ۱۹۲۴ء کی تعداد اس سے زیادہ ہوگی۔

یونیورسٹی کے ارباب حل وعقد کے پیش نظر یہہ مسائل ہیں کہ شوہر کو کس طرح حاصل کیا جائے اور اس کی محبت کو کس طرح برقرار رکھا جائے اور کسی پیشہ ور کی طرح شادی کی زندگی کس طرح کامیاب بنائی جائے۔

لندن مڈلینڈ اینڈ اسکاٹش ریلوے کا مشہور "کتا رائے" ایک طویل عمر کے بعد فوت ہوا ہے۔ یہہ کتا اس لحاظ سے ممتاز حیثیت رکھتا تھا کہ وہ سونگھنے سے مالدار لوگوں کو پہچان لیا کرتا تھا اور اسٹیشن پر ہر گاڑی کے مسافروں میں ہر مالدار مسافر کے پاس پہونچکر کچہہ نہ کچہہ ضرور وصول کرلیتا تھا۔ اس نے بوسٹن کے اسٹیشن پر سات سال کے عرصہ میں بعض فنڈوں کے لئے ۳۱۰۰ پونڈ جمع کئے۔

اپریل ۱۹۲۵ء سے ستمبر تک ان چھ مہینوں میں شہر لندن کی سڑکوں کے حادثات کی تعداد یہہ ہے کہ ۴۳۳ آدمی مارے گئے اور ۲۸٫۸۲۲ آدمی زخمی ہوئے۔ ان حادثات کا بیشتر حصہ موٹروں کی وجہ سے معرض ظہور میں آیا۔ اسی مسئلہ پر گفتگو کرتے ہوئے مسٹر فرانسس ٹی گریگ ایم اے نے بتلایا کہ ایک ماہر چشم نے تحقیق کی ہے کہ بعض دفعہ ایک آنکھ اپنا فرض انجام دینے سے "اسٹرائک" کر دیتی ہے اور دوسری آنکھ پر بینائی کا پورا زور پڑتا ہے اسوجہ سے موٹر ڈرائیوروں سے سہو ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے وجوہ ناقص بینائی یا ضعف بصارت ہے جسکی وجہ سے آنکھ اپنا پورا فعل انجام نہیں دیتی ہے اور اس قسم کے حادثات پیش آتے رہتے ہیں۔

مسٹر مارکس وڈورڈ نے اپنی تازہ کتاب میں دیہات کی زندگی کے عنوان سے بعض جانوروں اور پھولوں کا ذکر کیا ہے جن میں خرگوش نرگس ہنس گھونگھا اور گانیوالے پرند شامل ہیں۔ اُنھوں نے انکشاف کیا ہے کہ ہنس مدت العمر کے لئے شادی کرتے ہیں اور لومڑی بعض دفعہ دو شادیاں کر کے دو گھر رکھتی ہے اور یہ کہ پانی کا گھونگھا اپنی پوری زندگی میں پندرہ سَو ۱۵۰۰ انڈے دیتا ہے حالانکہ کھیتوں کا گھونگھا ماہ مئی سے نومبر تک پانچسو انڈے دیتا ہے

ڈاکٹر ڈبلیو ایچ ہیٹ فیلڈ" پرنسپل برون فرتھ رسرچ لیبارٹریز" شیفیلڈ نے بے زنگ کے فولاد کے متعلق ایک اہم ترقی کا اعلان کیا ہے۔ ایک مقام پر تقریر کرتے ہوئے اُنھوں نے بیان کیا کہ بے زنگ کے فولاد کو اس حالت پر لایا گیا ہے کہ وہ بالکل بے داغ اور صاف ہونے کے اعتبار سے برتنوں کی تیاری میں کام آنے لگا ہے۔ اسے ایک خاص ڈگری تک گرم کرنے کے بعد سرد ہونے پر یا پانی میں بھانے پر بھی ہر شکل میں آسانی کے ساتھ ڈھالا جا سکتا ہے اور چادر، سلاخ، تار اور نلوے کی صورت میں بغیر کسی قسم کا دھبہ پڑے منتقل کیا جا سکتا ہے۔


EXERCITVS
IMPERATORIS
CONSTANT

جلد ۳	فہرست مضامین رسالہ "شمع" بابت ماہ اپریل ۱۹۳۳ء	نمبر ۴

تصویر:- سلطان محمد ثانی فاتح قسطنطنیہ

اعلان

ہم کو دلی افسوس ہے کہ مارچ اور اپریل کے پرچے دیر سے شائع ہو رہے ہیں۔ تاخیر کا باعث پلیگ ہے جس نے تمام شہر میں کھلبلی ڈال رکھی ہے۔ عام طور پر لوگ شہر چھوڑ چھوڑ کر چلے گئے۔ اور بہت سے کاروبار بند ہو گئے۔ حتیٰ کہ آگرہ کی کچہریاں بھی مجبوراً ہائیکورٹ نے ایک ماہ کے لئے بند کر دیں۔ مارچ اور اپریل کے پرچے عرصہ سے تیار تھے مگر پلیگ کی وجہ سے چھپ نہ سکے۔

مئی کا پرچہ پریس میں ہے اور جون نمبر بھی تیار ہے۔ ہم یقین دلاتے ہیں کہ اگر ہمارے اختیار میں ہوتا تو ہم رسالہ کی اشاعت میں ایک دن کی بھی تاخیر نہ کرتے۔

بہرکیف ہم معذرت خواہ ہیں کہ قارئین کرام کو انتظار کی زحمت اٹھانی پڑی۔ یقین ہے کہ مئی اور جون کے پرچے اوقات معینہ تک خدمت میں پہونچ جائینگے۔

خادم

منیجر "شمع"

رسالہ

شمع

بابتہ ماہ اپریل سنہ ۱۹۲۶ء

سلطان محمد ثانی فاتح قسطنطنیہ

(از جناب محمد عبد الجلیل خاں صاحب علی گڑھ)

مغلوں کی یورش کے زمانہ میں ایک شخص سلیمان شاہ صوبہ گیلان یا بہ روایت دیگر بحر خضر کے کنارے سے مغرب کی طرف آیا اور ایشیا رکوچک کے ایک حصہ پر قابض ہو کر بادشاہ بن بیٹھا۔ مگر چونکہ وطن کا دلدادہ تھا فتنہ منگول کے فرو ہو جانے پر اپنے وطن مالوف کو واپس ہوا لیکن دریائے فرات کو عبور کرتے وقت غرق ہو گیا۔ اس کا بیٹا ارطغرل بھی اس کے ساتھ تھا۔ اس نے اس امر کو بدشگونی پر محمول کرکے وطن جانے کا ارادہ فسخ کر دیا۔ اور اپنے باپ کے جدید فتح کیے ہوئے ملک کی جانب واپس ہوا۔ اس

زمانہ میں سلاطین قونیہ کا آخری تاجدار سلطان علاءالدین ثالث سریر آرائے سلطنت تھا۔ اس نے ارطغرل کا والیس آنا غنیمت سمجھا اور وہ علاقہ جو سلیمان شاہ نے فتح کرلیا تھا بطور جاگیر ارطغرل کو دے کر اپنی کل سپاہ کا سپہ سالار بنا دیا۔ ارطغرل کی وفات کے بعد اس کا بیٹا عثمان مالک ہوا اور چونکہ سلطان علاءالدین کی وفات کے بعد اس کا خاندان ختم ہوگیا اسلئے عثمان اس ملک کا جو اس نے فتح کرلیا تھا سلطان تسلیم کرلیا گیا اور عثمان نے اس طرح دولت عثمانیہ کی مستقل بنا ڈالدی اور خان نے اس کو وسعت دی اور مراد اوّل نے اس کو ایک مستحکم سلطنت کی حیثیت بخشی اور جنوبی و مشرقی یورپ کے ایک حصہ کو فتح کرکے ادرنہ کو دارالسلطنت قرار دیا۔ بایزید یلدرم کے زمانے میں امیر تیمور صاحب قران نے ترکوں کو سنہ ۱۴۰۲ء میں انگورہ کے مقام پر شکست دی اور بایزید کو قید کرلیا۔ چنانچہ وہ اسی عالم میں دنیا سے گذر گیا۔ دس برس تک سلطنت عثمانیہ بے تاج رہی۔ سنہ ۱۴۱۲ء میں سلطان محمد اول نے از سر نو سلطنت کو مرتب کیا اور اسکے بعد مراد ثانی نے گذشتہ شان و شوکت کو دوبارہ زندہ کر دکھایا۔ سلطان محمد فاتح اسی مراد ثانی کا بیٹا تھا۔ تاریخ آل عثمان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان سلاطین میں دو باتیں ایسی تھیں کہ اگر تمام تاریخ عالم کی ورق گردانی کی جائے تب بھی ان کی نظیر دستیاب ہونا ناممکن ہے۔

اوّل یہ کہ ساڑھے چھ سو سال تک صرف ایک ہی خاندان برسر حکومت رہا۔

دوم یہ کہ اس خاندان کے پہلے دس بادشاہ بہترین دل و دماغ رکھتے تھے اور شجاعت و مردانگی، علم و فضل، تدبر و دانائی میں آپ اپنی نظیر تھے۔ ایسے زبردست سلاطین کا سلسلہ کسی دوسری جگہ نہیں ملتا۔ یہ ایک جملہ معترضہ تھا۔ مجھ کو صرف محمد ثانی کا حال تحریر کرنا ہے۔

یہ سلطان سنہ ۱۴۳۰ء میں پیدا ہوا اور اپنے والد مراد ثانی کی حیات میں جب کہ وہ لذات

دُنیا سے سیر ہو کر گوشہ نشین ہو چکا تھا دو مرتبہ تخت نشین ہوا مگر چودہ برس کی عمر میں اسقدر بارِ گراں کے اٹھانے کے قابل نہ سمجھا گیا اور مراد ثانی کو دونوں مرتبہ اس کی استعانت میں خود تخت سنبھالنا پڑا۔ مراد ثانی نے ۱۴۵۱ء میں رحلت کی اور قدرت نے محمد فاتح کو اکیس برس سال میں اس قابل بنا دیا کہ اس نے نہ صرف سلطنت کا بوجھ اُٹھا لیا بلکہ اپنی حکومت تیس سالہ میں اپنے آباؤ اجداد کے نام کو چار چاند لگا دیئے۔ اس نے اپنے تیس سالہ عہدِ حکومت میں دو سلطنتیں زیر و زبر کیں اور دو سو شہر فتح کئے صرف فتح قسطنطنیہ ہی ایک ایسا معرکہ آرا کارنامہ ہے جو محمد ثانی کو جائز طور پر "فاتح اعظم" کے لقب کا مستحق بنا سکتا ہے۔ تخت نشینی کے بعد اس کا پہلا کام ظالمانہ تھا یعنی اس نے اپنے سوتیلے شیر خوار بھائی کو قتل کرا دیا اس کا مقولہ تھا کہ "قتل غداری سے بہتر ہے" اور معاملات خسروی میں آئین رشتہ داری برتنا عقل سے دور ہے۔" دراصل اس طرزِ عمل کی بنا بایزید یلدرم نے ڈالی تھی اور اپنی تخت نشینی کے دن اپنے شجاع اور بہادر بھائی یعقوب کو تہ تیغ کیا تھا۔

چونکہ تخت نشینی کے وقت محمد فاتح کی عمر صرف اکیس سال کی تھی مخالفین دولت عثمانیہ کو خیال ہوا کہ جس طرح وہ سات سال قبل بادشاہت کے ناقابل ثابت ہوا تھا اب بھی ناکام رہے گا۔ چنانچہ انہوں نے اس کی کمزوری سے فائدہ اٹھانا چاہا اور شاہنشاہ قسطنطنیہ نے اس معاملہ میں سبقت کی۔

فتح قسطنطنیہ

قسطنطنیہ کے تخت پر ۱۴۴۸ء قسطنطین یازدہم حکمران تھا۔ اور مشرقی خاندان کا آخری

تاجدار تھا۔ محمد اول کے زمانے سے اس کے پاس سلیمان ابن بایزید یلدرم کا بیٹا اورخان مقید تھے اور ترکی سلاطین ایک رقم مقررہ اس کی خورونوش کے لئے دیا کرتے تھے۔ اس وقت قسطنطین نے اس قسم کے اضافہ کے لئے محمد ثانی سے تقاضا کیا۔ چونکہ سلطان ایشیا ئے کوچک میں بغاوت فرو کر رہا تھا اس نے اس تقاضے کو بہ لطائف الحیل ٹال دیا۔ مگر خلیل پاشا وزیر اعظم نے جو کہ خیر خواہ تخت قسطنطنیہ سمجھا جاتا تھا شاہنشاہ کو تنبیہ کی گو اس وقت شاہنشاہ کے پاس سوائے شہر قسطنطنیہ کے اور کچھ نہ تھا مگر تنہا قسطنطنیہ ہی باعتبار اپنی خوبصورتی مضبوطی اور دولت کے کئی سلطنتوں کا ہموزن تھا۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانہ سے اب تک بادشاہ اسلام نے اس کے فتح کرنے کی کوشش کی مگر کسی نہ کسی وجہ سے برابر ناکامیابی ہوتی رہی تھی۔

یہ ناموزوں نہ ہوگا اگر یہاں ہم مختصراً سلطان عثمان خاں بانی خاندان کا وہ خواب تحریر کریں جس کی بنا پر کل گذشتہ سلاطین نے حتی الامکان قسطنطنیہ کے فتح کرنے کی کوشش کی۔

دوران حیات ارطغرل پدر عثمان میں ایک مشہور ومعروف شیخ مسمی ادیبلی[۱] موضع اتبورونی[۲] متصل عسکی[۳] شہر میں آکر بسا۔ اس وقت عثمان کم سن تھا اور شیخ موصوف کی خدمت میں اکثر عقیدتمندانہ حاضر ہو کر ان کی صحبت سے فیضیاب ہوتا تھا۔ شیخ کے ایک لڑکی ملی خاتون نامی تھی نہایت حسین وجمیل۔ ایک دن اتفاق سے عثمان کی نظر

---

[۱] Edebali.
[۲] Itburunu.
[۳] Eskishehr.

مال خاتون پر پڑ گئی دیکھ کر بیقرار ہو گیا اور شیخ مذکور کو شادی کا پیغام دیا مگر چونکہ شیخ موصوف عثمان کے اصلی جوہر سے ناواقف تھا اس نے اس رشتہ کو قبول نہ کیا۔ عثمان دل برداشتہ ہو کر وہاں سے چلا آیا اور اپنے دوستوں سے کل واقعہ بیان کیا ان میں سے ایک دوست کو والی عسکی شہر تھا۔ اس لڑکی پر نادیدہ عاشق ہو گیا اور شیخ کے پاس جا کر اپنی شادی کا پیغام دیا مگر شیخ نے اس کو بھی منظور نہ کیا۔ چونکہ والی عسکی شہر ایک زبردست حکمران تھا اس سے خوف کھا کر شیخ نے ترک سکونت کی اور ارطغرل کی ولایت کے قریب ایک گاؤں میں جا بسا۔ والی عسکی شہر عثمان کو اپنا رقیب خیال کر کے اس سے نفرت کرنے لگا۔ قضا کار عثمان مع اپنے چھوٹے بھائی کے اپنے ہمسایہ والی اینینی[51] کے قلعہ میں بطور مہمان گیا ہوا تھا۔ والی عسکی شہر نے اس موقع کو غنیمت سمجھ کر بہ امداد مائکل والی خرنکیا[52] اینینی کے قلعہ پر چڑھائی کر دی اور والی اینینی کو مجبور کیا کہ وہ عثمان کو حوالہ کر دے۔ والی اینینی اسکو خلاف شان مہمان نوازی سمجھ کر انکار کر دیا دشمن قلعہ کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ اسی دوران میں عثمان نے فوج غنیم کی ایک طرف کی کمزوری کو محسوس کر کے شدید حملہ کیا دشمن نے شکست کھائی والی عسکی شہر فرار ہو گیا مگر مائکل گرفتار کر لیا گیا۔ اس کے بعد قیدی اور گرفتار کنندہ دونوں پکے دوست ہو گئے۔ جب ارطغرل کی وفات کے بعد عثمان تخت پر بیٹھا مائکل برضا و رغبت مشرف باسلام ہوا۔

کامل دو سال تک عثمان کوشاں رہا مگر اِدیبلی برابر انکار کرتا رہا آخرکار ایک خواب نے اس کے انکار کو اقرار میں تبدیل کر دیا ایک مرتبہ رات کے وقت عثمان اسی شیخ

---

۵۱ Inaani

۵۲. Michael of Kenia

کے مکان پر مقیم تھا اور اس کے دل پر غم و الم کی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ اسی پریشانی میں اس کی آنکھ لگ گئی کیا دیکھتا ہے کہ وہ اور اس کا میزبان آدبیلی ایک جگہ آرام کر رہے ہیں اور اسی اثنا میں آدبیلی کے سینہ سے ایک ماہ کامل طلوع ہوا اور عثمان کے سینہ کی طرف جھکتا ہوا نظر سے غائب ہو گیا۔ اس کے بعد اس کے سینہ سے ایک نہایت خوبصورت اور شاندار درخت نمایاں ہوا اور اس کی شاخیں اتنی بڑھیں کہ تین حصہ دنیا پر سایہ فگن ہو گئیں اس درخت کے نیچے چار پہاڑ تھے جو ستونوں کا کام انجام دے رہے تھے اور اس درخت کو ایک چھتر کی شکل میں نمایاں کر رہے تھے۔ عثمان نے ان پہاڑوں کو پہچانا ایک کوہ قاف۔ دوسرا کوہ اطلس۔ تیسرا کوہ طارس اور چوتھا کوہ ہمس تھا۔ درخت کی جڑوں سے چار دریا جاری تھے۔ ایک دریائے نیل دوسرا دریائے دجلہ تیسرا دریائے فرات اور چوتھا دریائے ڈینوب ان میں بڑے بڑے جہاز اور کشتیاں رواں تھیں پہاڑوں کی وادیوں میں اچھے اچھے شہر آباد تھے جن میں زبردست عمارتیں اور عالیشان مینار نظر آرہے تھے۔ میناروں کی چوٹیوں پر ہلال نمایاں تھا اور یمین و یسار سے اللہ اکبر کی صدا بلند ہو رہی تھی۔ یکایک رخ بدل کر اس نے دیکھا کہ ترک مبارز شہروں کو فتح کرتے ہوئے جا رہے ہیں جس شہر کی طرف خاص توجہ تھی وہ قسطنطنیہ تھا جو دو سمندروں اور دو براعظم کے اتصال پر مثل ہیرے کے ایک انگوٹھی میں جڑا ہوا ہے۔ جونہی عثمان نے اس انگوٹھی کے پہننے کی کوشش کی آنکھ کھل گئی وہ نہایت پریشان ہوا اور اس خواب کو شیخ سے بیان کیا۔ اس نے اس کو زبردست فتوحات کا پیش خیمہ سمجھ کر نہایت خوشی سے اپنی لڑکی مال خاتون کی شادی عثمان کے ساتھ کر دی۔

یہ خواب تھا جس کو اصلیت کا جامہ پہنانے کی سلطان نے کوشش کی۔ محمد فاتح

نے قسطنطنیہ فتح کر کے خواب کے ایک حصہ کو سچا کر دکھایا اور سلیمان صاحبقران نے باقی حصہ کو پورا کیا۔ ترکی دار السلطنت کو آج تک بابِ عالی[۵۱] کے نام سے پکارتے ہیں۔ اس کا تعلق خواب کے اُس حصہ سے ہے جہاں کہ چاروں پہاڑ ستون بناتے ہوئے درخت کو چتر کی شکل دیتے ہیں اور ان سے عالی شان دروازے نمایاں ہوتے ہیں۔

سلطان مراد اول نے جنوبی اور مشرقی یورپ کے بڑے حصہ کو فتح کر لیا تھا اور خوف تھا کہ قسطنطنیہ پر اغیار کا قبضہ رہا تو ترکوں کے یوروپین مقبوضات کی کما حقہ حفاظت ممکن نہ ہوگی۔ سلطان محمد ثانی کو شروع ہی سے اس کی فتح کا خیال تھا مگر قسطنطین کی دھمکی پر اس سے صلح کر لی؛ در چاروں طرف سے فوجیں جمع کرنی شروع کر دیں ہنیادی[۵۲] سے تین سال کے واسطے صلح ہوئی اور ایشیا میں بھی والی قرامان[۵۳] کو مراعات عطا کر کے خاموش کر دیا۔ حدود ایشیار کوچک میں قسطنطنیہ کے عین مقابل ایک زبردست قلعہ کی بنا ڈالی اور تین ماہ کے عرصہ میں ایک ہزار معمار اور تین ہزار مزدور لگا کر مکمل کرا دیا۔ ان تیاریوں سے گھبرا کر قسطنطین نے سلطان کے پاس سفارت بھیجی اور ان تیاریوں کا مقصد دریافت کیا جس کے جواب میں محمد فاتح نے جنگ کا اعلان کر دیا۔

۱۴۵۲ء فریقین کی تیاریوں میں گزرا۔ اس زمانے میں توپوں کا استعمال شروع ہو گیا تھا چنانچہ اس موقع پر ترکوں نے ایسا توپ خانہ مہیا کیا کہ جس کا جواب دنیا میں نہ تھا۔ ایک مشہور ہنگری کا انجنیر مسمی اربن[۵۴] جو یونانیوں کا ملازم تھا کمی تنخواہ اور اُن کے احسان

---

۵۱ La Sublime Porte.

۵۲ Hunyade. هنیادی

۵۳ Carmanich. ۵۴ Urban.

فراموش رویہ سے تنگ آکر ترکوں کی طرف آگیا۔ ترکوں کے پاس صرف توپیں اور سامان جنگ ہی اسقدر نہ تھا کہ یونانیوں کو مرعوب کرتا بلکہ محمد فاتح قابلیت جنگ اور نیز ان خوبیوں سے متصف تھا جو نپولین[۱] اور جولیس سیزر[۲] میں پائی جاتی تھیں اور جن کی تعریف میں مغرب آج تک رطب اللسان ہے مگر محمد فاتح صرف مسلمان ہونے کی وجہ سے اب تک مغربی دنیا میں مورد عتاب بنا ہوا ہے۔

یونانیوں کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ مراد ثانی کے زمانہ میں قسطنطین نے جملہ نصاریٰ کی ہمدردی حاصل کرنے کی غرض سے کلیسہ ہائے روم و یونان کو متحد کر دیا لیکن پاپائے روم کا اثر اس زمانہ میں مسیحی دنیا پر کم رہگیا تھا اسلئے اصل مطلب حاصل نہ ہو سکا۔ مزید براں متقدران کلیسائے یونان نے شہنشاہ کی اس مصلحت کو نظر استحسان سے نہ دیکھا بلکہ اسکو بدعتی قرار دیکر اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ غرض کہ اس وقت قسطنطنیہ میں دو پارٹیاں تھیں ایک شہنشاہ کی جانبدار تھی اور دوسری گرینڈ ڈیوک نوٹرس[۳] کی حامی جو اتحاد کلیسائے روم و یونان و شہنشاہ کے خلاف تھا اس نے یہانتک علان کر دیا تھا کہ وہ پاپا کی مقدس ٹوپی کے بجائے ترکوں کی پگڑی قسطنطنیہ میں دیکھنا زیادہ پسند کرتا ہے۔ شہر کے ایک لاکھ باشندوں میں سے صرف چھ ہزار ۶۰۰۰ نے شہنشاہ کا ساتھ دیا علاوہ ازیں پاپا نے بھی کچھ نقد روپیہ اور ایک چھوٹی جماعت کارڈینل اسیڈور[۴] کی ماتحتی میں بھیجی اور چونکہ اسپین اور

---

[۱] Napolian.

[۲] Julius Caesar.

[۳] Grand Duke Notaras.

[۴] Cardinal Isidore.

اٹلی کے شہر قسطنطنیہ کے ساتھ تاجرانہ تعلقات رکھتے تھے انھوں نے بھی کچھ آدمیوں سے امداد کی۔ کچھ باشندگان ارگون[51] کیٹیلین[52] و وینس[53] کے بھی شریک ہوئے۔ اور سب سے زبردست مدد جو قسطنطنیہ کو پہونچی وہ جنوا[54] کے جان گسٹینیانی[55] کی تھی جو دو جہاز اور تین سو آدمیوں کے ساتھ محاصرہ سے ذرا پہلے شہنشاہ کی امداد کو پہونچا۔ ان سب آدمیوں کو ملاکر شہنشاہ کے پاس نو ہزار آدمی تھے اور ان سے اس کو چودہ میل کے دور کے شہر کی محافظت کرنی تھی مگر شہر کی مضبوطی کو خیال کرتے ہوئے یہ فوج قطعی کافی سمجھی گئی۔

وان ہیمر[56] مشہور مورخ نے لکھا ہے کہ جب سے شہر قسطنطنیہ کی بنیاد پڑی اس کا محاصرہ انتیس مرتبہ کیا گیا اور صرف آٹھ مرتبہ فتح ہوا۔

میں صرف مسلمان محاصرین کے نام مع تاریخ درج کرونگا۔ اول اول امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے ۶۵۴ء میں محاصرہ کیا۔ یزید ابن ابوسفیان نے ۶۶۷ء میں۔ سفیان بن عوف نے ۶۷۲ء میں۔ مسلمہ بن عبدالملک و عمر بن عبدالعزیز نے ۷۱۵ء میں۔ سلیمان بن عبدالملک نے ۷۳۹ء میں۔ خلیفہ ہارون الرشید نے ۷۸۱ء میں اس کے جنرل عبدالملک نے ۷۹۸ء میں۔ بایزید یلدرم نے اول مرتبہ ۱۳۵۶ء میں اور دوسری مرتبہ

---

[51] Arragan
[52] Catalan.
[53] Venice.
[54] Genoa.
[55] John Gustiniani.
[56] Von Hammer.

سنہ ۱۴۰۲ء میں - موسیٰ بن بایزید نے سنہ ۱۴۱۲ء میں - مراد ثانی نے سنہ ۱۴۲۲ء میں اور محمد فاتح نے سنہ ۱۴۵۳ء میں صرف محمد ثانی کے سر فتح کا سہرا رہا -

شروع سنہ ۱۴۵۳ء میں ترک شہر کے سامنے پہنچ گئے اور سمندر سے بندرگاہ تک اپنی فوج قائم کرکے توپوں کی قطارات انہوں نے اس کو مستحکم کر دیا اور جو مقام کمزور ترین معلوم ہوا وہاں چودہ توپخانے لگا دیئے خاص توجہ سینٹ[لے] رومینس کے دروازہ کی طرف کی جو مقابل دیوار کے وسط میں تھا اسی مقام پر بڑے بڑے پتھر پھینکنے والی توپیں لگا کر ترک تیر انداز کھڑے کر دیئے تاکہ گرد دیوار پر محصورین نظر آئیں تو تیروں کی بارش کریں شہر کے گرداگرد دو دیواریں تھیں - سرویا[سے] سے محمد ثانی جو سرنگ لگانے والے ساتھ لایا تھا وہ پہلی دیوار میں چند جگہ سرنگ لگانے میں کامیاب ہوئے -

ترکی فوج کی تعداد کے متعلق دو روایتیں ہیں -

ایک بیان ہے کہ محمد ثانی کے پاس محاصرہ کے وقت ستر ہزار فوج تھی -

دوسری روایت ہے کہ اس کے پاس دو لاکھ پچاس ہزار فوج تھی -

اول الذکر بیان قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کیونکہ ستر ہزار فوج محاصرہ کے لئے قطعی کافی تھی - دوم یہ کہ سلطان ایسے نازک موقع پر اس قدر فضول خرچ کرکے رسد رسانی کے جھگڑے میں اپنے آپ کو کیوں ڈالتا - بری فوج کے علاوہ سلطان نے مختلف قسم کی تین سو کشتیاں بھی جمع کی تھیں - مگر یونان اور متحدین کے بڑے

لے St. Romanus.

سے Servia.

جہازوں کے مقابلہ میں کوئی مناسبت نہ رکھتی تھیں۔ مسیحی جہاز تعداد میں چودہ تھے جو بندرگاہ
شاخ زریں[۵۱] میں چکر لگاتے تھے ایک بڑی زنجیر کے ذریعہ سے اس بندرگاہ میں اُن کی
آمد و رفت تھی۔ محاصرہ ۶ اپریل ۱۴۵۳ء کو شروع ہوا اور قسطنطین۔ گسٹینانی و
دیگر لاطینی مددگاروں کے ہنر و بہادری کی بدولت ۲۹ مئی تک شہر پر سلطان کا قبضہ
نہ ہوسکا۔ نفطہ[۵۲] کا استعمال اس وقت تک صحیح معنوں میں صرف یونانیوں ہی میں ہوتا تھا۔
اور اس کے ذریعہ سے گسٹینانی نے بڑے بڑے کام لئے۔ ترکوں نے اپنے آپ کو
خطرہ میں ڈال کر ایک عام حملہ کیا مگر سخت نقصان کے ساتھ پسپا ہونا پڑا۔ اور اُنکے
متحرک بُرج اور انجن تباہ ہو گئے۔ اس وقت اہل جینوا جہاز رانی میں کمال رکھتے تھے
اسی دوران میں جینوا کے چار جہاز۔ اور ایک یونانی جہاز رسد لے کر محصورین کی مدد کو
پہنچ گئے۔ ترکوں کی ایک سو پچاس کشتیوں نے ان کو نرغہ میں لے لیا مگر وہ اندر داخل
ہونے میں کامیاب ہوگئے اور اس موقع پر بہت سی ترکی کشتیاں محصورین کی
نفطہ اندازی سے جل کر تباہ ہوگئیں۔ اس بحری شکست کے بعد ترکوں کا عام خیال
تھا کہ خدا نے محض بری سلطنت اُن کو عطا کی ہے مگر بحری حکومت خدا نے کفار کے
واسطے محفوظ رکھی ہے۔ تقریباً ستر برس کے بعد سلطان سلیمان کے زمانے میں
باربروسہ[۵۳]۔ درگت[۵۴] پیالی[۵۵] وغیرہ نے اپنی شاندار بحری فتوحات سے اس خیال کی

---

۵۱ Golden Horn.

۵۲ Napelti.

۵۳ Barbarossa.

۵۴ Dorgut & Pali.

بہت کچھ ترمیم کر دی مگر یونانیوں کی یہ بحری فتح کچھ دیر پا نہ تھی صرف تین بیار میں آخری سالین کی برابر تھی۔ محمد فاتح خسرو شہنشاہ ایران نہ تھا جو [illegible]ء میں سلمیس[۱] کی شکست سے بد دل ہوجاتا۔ جب اس نے دیکھا کہ اس کی کشتیاں گہرے پانی میں مفید ثابت نہیں ہوئیں تو اس نے لکڑی کے تختوں کی سڑک بنائی اور چربی سے اُن کو چکنا کر کے اپنی چھوٹی کشتیوں کو خشکی کے راستہ سے گولڈن ہارن کے دوسرے جانب کم پانی میں لے آیا۔ یہ سڑک پانچ میل لمبی تھی۔ اس طریقہ سے سلطان نے کشتیوں کا پل بنا کر اپنا زبردست توپ خانہ لگا دیا۔ کستیانی نے جنوا کے آدمیوں کی مدد سے لاکھ کوشش کی کہ اس پل کو جلا دے مگر کامیاب نہ ہوا۔ اسی طرح اہالیان وینس کی جان توڑ کوشش بھی رائگاں گئی۔ گو کہ اس توپخانہ کے لگانے سے کچھ زیادہ فائدہ نہ ہوا لیکن کم از کم محصورین کی ایک بڑی تعداد اس طرف محافظت میں مصروف ہوگئی۔

گولوں کی بوچھار کامل سات ہفتہ تک جاری رہی اور ترک شہر کی دیواروں کو ایک حد تک نقصان پہونچانے میں کامیاب ہوئے۔ دروازہ سینٹ رومینس کی دیوار میں گولوں کی ضرب سے ایک بڑا سوراخ ہوگیا۔ شہر کی خندق منہدم شدہ حصہ سے پُر ہوگئی اور بالآخر قسطنطنیہ میں داخلہ کا راستہ نکل آیا۔ سلطان نے آخری کوشش کی کہ شہر سپرد کر دیا جاوے مگر شہنشاہ نے جواب دیا کہ وہ برضا و رغبت شہر حوالہ نہیں کر سکتا کیونکہ اس نے آخری دم تک حفاظت کرنے کی قسم کھائی ہے اگر شہر کو بجنسہ اس کے قبضہ میں چھوڑ دیا جاوے تو وہ خراج دینے کے لئے تیار ہے۔ یہ واقعہ ۲۴ مئی کا ہے۔ اس جواب کو سن کر سلطان نے اعلان کر دیا کہ ۲۹ مئی کو شہر

[۱] Salamis.

پر عام حملہ کیا جائیگا۔ اور اس بات کی بھی منادی کرا دی کہ لوٹ میں جو کچھ حاصل ہوگا وہ فوج کا حصہ ہوگا صرف عمارات اور زمین سلطان کی ملکیت ہونگی۔ اس خبر کو سنکر کل فوج نے چراغان کیا۔ خوشیاں منائیں اور قسطنطنیہ کے فتح کی دلوں میں ٹھان لی۔ محصورین نے یہ روشنی اپنی آنکھ سے دیکھی اور مقصد معلوم کرکے نہایت سراسیمہ اور پریشان ہوئے مگر یہ اُمید کرتے رہے کہ مسیحی اولیا ایسے نازک موقع پر اُن کی ضرور مدد کریں گے۔ لاطینیوں نے وینز گسٹینیانی نے جان توڑ کوشش کی منجملہ بارہ محافظت کے مقاموں کے دس پر لاطینی تعینات تھے گسٹینیانی نے سینٹ رومینس کے منہدم شدہ حصہ کی از سر نو مرمت شروع کردی۔ سلطان اس شخص کی یہ جرأت اور دلاوری دیکھ کر حیران رہ گیا اور پکار کر کہنے لگا کہ میں ایسے شخص کی خدمات حاصل کرنے کے لئے سب کچھ دینے کے لئے تیار ہوں مگر سب سے زیادہ تعریف کے قابل خود قسطنطین کی شجاعت تھی اس کو کامل یقین تھا کہ اس کا آخری وقت آچکا ہے مگر اس نے اپنے فرائض کی انجام دہی کا تہیہ آخری سانس تک کرلیا تھا اور وہ پورا کر دکھایا۔ ۲۸ مئی کی شب کو کلیسائے سینٹ صوفیہ میں قسطنطین نے مع اپنے ہوا خواہوں کے آخری عبادت کی۔ سب نے نہایت خلوص کے ساتھ دُعائے نصرت مانگی مگر اُن کے اعمال کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا ایک پیش نہ گئی دوسری جانب تمام شب تیاری میں گذری علی الصباح فوجی باجے نے عام حملہ کا اعلان کردیا باجے کی آواز اور ہتیاروں کی جھنکار سے میدان کارزار گونج اوٹھا۔ سلطان نے سب سے آگے کم درجہ کے سپاہی متعین کئے اور ان کے پیچھے اچھے سپاہی رکھے لیکن بہترین یعنی ینگچری جماعت خود سلطان کے زیر کمان تھی اور اس سے وہ اس بڑے سوراخ پر جو سینٹ رومینس کی دیوار میں ہو گیا تھا حملہ کرنے والا تھا۔ اسی جماعت کے

دوسرے دلاور دیگر کمزور مقامات پر حملہ کرنے والے تھے ایک ہی وقت بحری و بری حملے
شروع ہوئے، کامل دو گھنٹہ تک یونانیوں نے کمال پامردی سے ان حملوں کو رد کا اس
دوران میں کوئی ترک سپاہی شہر کے نزدیک نہ پہنچ سکا آخر الامر کسٹینانی جو شہنشاہ کے
پہلو بہ پہلو داد شجاعت دے رہا تھا گولی کھا کر زخمی ہوا اٹھنے کی تاب نہ لاکر اپنے بیڑے
پر جو ابھی تک گولڈن ہارن میں لنگر انداز تھا مرنے کے لئے چلا گیا مگر اس کا غبش کرنا غضب
ہوا یونانیوں کے حوصلے پست ہو گئے اور ترکوں کے دل بڑھ گئے۔ انہیں سے ایک شخص مسمی
حسن جو اپنے قد و قامت میں یکتا تھا۔ تیس سپاہیوں کو لیکر اس مقام پر جا پہونچا جہاں خود
قسطنطین داد شجاعت دے رہا تھا حالانکہ خود حسن مع دیگر اٹھارہ ینگچریوں کے کام آ گیا
مگر پیش قدمی کا سلسلہ جاری رہا اور یونانیوں کو مورچے چھوڑنا پڑے تقریباً اسی وقت
عثمانی فوج نے دوسری جانب راستہ بنا لیا اور ادہر کے حصہ پر قابض ہو گئی۔ اب
قسطنطین کو کامل یقین تھا کہ نہ صرف شہر ہاتھ سے نکل جائیگا بلکہ جان بھی جائے گی۔ تلوار
پکڑ کر عثمانیوں پر جا پڑا اور دو ایک کو مار کر خود بھی مر گیا۔ یونانی تو پہلے ہی دل ہار چکے تھے
لیکن شاہنشاہ کی موت نے اور بھی رہے سہے شیرازہ کو پریشان کر دیا اول تو ترکوں
نے قتل عام شروع کیا مگر جب دیکھا کہ ان میں تاب مقاومت باقی نہیں رہی تو تلواروں
کو میان میں رکھا اور لوٹ کی طرف متوجہ ہوئے سلطان محمدؒ ثانی دوپہر کے وقت اپنے
وزرا اور پاشاؤں کے جھرمٹ میں سینٹ رومینس کے دروازہ سے مفتوح شہر میں داخل
ہوا اور کلیسائے سینٹ صوفیہ کے دروازے پر گھوڑے پر اترا۔ موذن سے اذان کہنے
کی فہمایش کی اور خود بہ نفس نفیس ظہر کی نماز پڑھائی اور امن عامہ کا اعلان کیا۔ مفتوحہ
حصہ شہر کا وہی حشر ہوا جو ایسے موقعوں پر ہوا کرتا ہے۔ البتہ وہ حصہ جو یونانیوں نے خود

حوالہ کر دیا تھا قتل وغارتگری سے بالکل محفوظ رہا۔

دوسرے دن سلطان نے شاہی محل پر بھی قبضہ کر لیا۔ مسیحی مورخوں نے فتح قسطنطنیہ کے عتاب میں اہتمام لگانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا ہے۔ لیکن سلطان نے اپنی شرافت کا ثبوت یہ دیا کہ جو یونانی و دیگر مسیحی باشندے اس موقع پر شہر چھوڑ کر چلے گئے تھے اون کو واپس بلانے کی ہر ممکن کوشش عمل میں لایا اور اعلان عام کر دیا کہ کلیسائے یونان رومیوں کی دست بردسے اسی طرح محفوظ ہے جس طرح کہ چار سال قبل تھا اور چونکہ اسقف اعظم گرینڈ ڈیوک نوٹرس مر چکا تھا اس نے جدید اسقف اعظم مقرر کیا اور اسکو اور اس کے دیگر ماتحتوں کو جملہ محاصل سے آزاد کر دیا اس طرح اس نے کل ایسے مسیحیوں کی جو کلیسائے یونان کے معتقد تھے ہمدردی حاصل کر لی اور مسیحیوں کو کامل مذہبی آزادی عطا کر دی اور سوائے سینٹ صوفیہ کے کل گرجے ان کے حوالہ کر دیئے دوران محاصرہ میں اکثر باشندے گھروں کو چھوڑ کر بھاگ گئے تھے اور شہر ویران معلوم ہوتا تھا مگر سلطان کے اعلان سے قسطنطنیہ دوبارہ ایک بارونق شہر بن گیا اور بجائے آدرنہ کے عثمانی دارالسلطنت یہیں قرار پایا۔

چونکہ فتح قسطنطنیہ کے حالات عام طور پر معلوم نہ تھے اس لئے میں نے اون کو کسیقدر تفصیل کے ساتھ تحریر کیا ہے۔ یونانیوں کے قدیم اور بیش قیمت علمی خزانے ابھی تک ایک کونے میں مخفی تھے اور ...... یورپ تاریکی اور ضلالت میں پڑا ہوا تھا محمد فاتح نے قسطنطنیہ فتح کر کے اہل یورپ پر احسان کیا کہ اس نے ان کو ان علوم سے مستفید ہونے کا موقع دیا مگر کہاں یورپ اور کہاں احساس شکر گزاری۔

دیگر فتوحات میں محمد ثانی کو زیادہ دقتیں حائل نہیں ہوئیں ایشیا میں ۱۴۵۶ء

میں اس نے طرابزون[1] فتح کیا اس کے ساتھ ہی ساتھ سینوپ[2] پر بھی جو کہ بحر اسود پر ایک زبردست بندرگاہ ہے، قبضہ کر لیا۔ اسی سال صوبہ قرامان[3] کا الحاق کیا۔ امیر قرامان سلاطین قونیہ کی آخری نشانی تھا اور ہمیشہ ترکوں کے درپئے آزار رہتا تھا۔ جہاں اس کو موقعہ ملتا تھا اس نے فتنہ و فساد برپا کیا اس لئے محمد فاتح نے ہمیشہ کے لئے اس فتنہ کو ختم کر دیا یورپ میں بعد فتح قسطنطنیہ ۸۵۷ھ میں پیلوپونیسس[4] فتح ہوا۔ اس کے بعد سلطان نے بلغراد[5] کا رخ کیا فوجی نکتہ خیال سے یہ ایک زبردست مقام تھا۔ اور اس کی فتح گویا ہنگری[6] و آسٹریا[7] کی فتح کا پیش خیمہ تھی۔ تمام یورپ میں تہلکہ مچ گیا اور ایک مسیحی ٹڈی دل بلغراد کے بچانے کو امنڈ آیا محمد فاتح اس کے لئے تیار ہو کر نہیں گیا تھا مجبوراً اوسکو محاصرہ اٹھانا پڑا اگرچہ یہ مقام فتح نہیں ہوا لیکن ولیشیا[8] اور رومیلیا[9] کے ایک بڑے حصہ پر قبضہ ہو گیا۔ یورپ میں دوسرا اہم مقام البانیہ تھا اس پر سکندر بیگ عرف جان کیسٹریوٹ[10] قابض تھا۔ مراد ثانی کے آغاز دور حکومت میں یہ صوبہ فتح ہوا اور سکندر بیگ کم عمری میں مع اپنے چار بھائیوں کے سلطانی دربار میں بطور ضامن اپنے باپ کی طرف سے پیش ہوا۔ ۱۴۴۳ء میں جبکہ سلطانی فوجیں ہنیاڈی[11] سے برسرپیکار تھیں موقع پا کر فرار ہو گیا

---

[1] Trebizond.
[2] Sinope.
[3] Caramania.
[4] Peloponnesus.
[5] Belgrade.
[6] Hungary.
[7] Austria.
[8] Wallachia.
[9] Rumelia.
[10] John Castriota.
[11] Hunyade.

اور دہوکہ سے البانیہ پر قابض ہوگیا سنہ ۱۴۶۶ء میں سلطان محمد فاتح سے مقابل ہوا لیکن
تاب مقاومت نہ لاسکا اور اپنا ملک چھوڑکر وینس بھاگ گیا وہیں دل شکستہ ہوکر فوت ہوا
سکندر بیگ کی فراری کے بعد البانیہ بوسنیہ[۵۱] اور ہرزیگوینہ[۵۲] سلطنت عثمانیہ میں شامل
ہوگئے مگر قسطنطنیہ کے بعد جو اہم ترین فتح سلطان کو حاصل ہوئی وہ تسخیر کریمیا تھی۔ کریمیا کے
ایک زبردست بندرگاہ کافہ[۵۳] پر اہل جنوا کا قبضہ تھا اگرچہ اصل حکمران کرم تاتاری[۵۴] مسلمان تھے
اس وقت آپس میں خانہ جنگی تہی کیونکہ خان کریمیا کو اس کے دو چھوٹے بھائیوں نے تخت
سے اُتار دیا تھا۔ سلطان کو یہ امر قطعی گوارا نہ تھا کہ اہالیان جینوا جو جہازرانی میں مشہور تھے
قسطنطنیہ کے قرب میں رہیں ادہر معزول خان نے اپنے بھائیوں کے خلاف امداد
چاہی۔

سلطان فوراً تیار ہوگیا اور اُسنے اپنے وزیر اعظم احمد کو زبردست بحری بیڑہ اور
چالیس ہزار سپاہ کے ساتھہ روانہ کردیا۔ وزیر اعظم نے چار یوم کے اندر کافہ پر قبضہ کرلیا
اور کرم تاتاریوں نے اطاعت قبول کرلی یہ صوبہ ترکوں کے قبضہ میں تین سو برس تک
رہا۔ اس جنگ میں ترکوں کو بہت زیادہ مال غنیمت ملا چالیس ہزار باشندگان کریمیا شہر قسطنطنیہ
کو منتقل کردیے گئے اور پندرہ سو نوجوان اہالیان جنوا ینگچری فوج میں داخل کئے گئے۔
اس وقت جنوبی اور شرقی یورپ میں وینس اور جنوا کی طاقت بڑھی ہوئی تھی سلطان نے

---

۵۱ Bosnia.
۵۲ Herzegovina
۵۳ Kaffa
۵۴ Crim Tatars

برابر برسر پیکار رہا مگر یہ لوگ مجمع الجزائر یونان و نیز ساحل یونان پر قابض رہے۔ پیہم لڑائیوں کے بعد ترکوں کا قبضہ یوبیہ[1] ۔ لیبوس[2] ۔ لیمنوس[3] ۔ سیفالونیا[4] اور دیگر جزائر پر بھی ہوگیا ۔ اس طرح ترکوں کی سرحد بحر اڈریاٹک[5] سے جا ملی اور خاص شہر وینس معرض خطر ہوگیا اہل وینس نے زبردست تیاریاں کیں اور گریڈینا[6] و ٹوگلیامینا[7] پر موریچہ بندی کر کے دریائے اسونزو[8] کے دہانے سے گیرز[9] تک خندقیں کھودیں مگر اکتوبر سنہ ۱۴۷۷ء میں جنرل عمر پاشا نے ان کو شکست فاش دی ۔ وینس کو اپنے خاتمہ کا یقین تھا ۔ لیکن ترکوں نے شرائط صلح قبول کرلئے اور نومبر میں بے انتہا مال غنیمت لیکر واپس ہوئے اہالیان وینس نے خراج دینا بھی منظور کرلیا تھا۔

سنہ ۱۴۰۲ء میں امیر تیمور صاحبقران نے نائٹ ٹمپلرس[10] کو سمرنا سے نکالدیا انہوں نے جزیرہ روڈس[11] پر قبضہ کرلیا ۔ نائٹ ٹمپلرس عیسائیوں کا ایک مذہبی فرقہ تھا اور مذہبی مجاہد کی حیثیت رکھتا تھا اس کی ابتدا جنگ صلیبی کے سلسلہ میں ہوئی تھی مگر یہ فرقہ بہت ظالم تھا اور عام طور پر لوگ نالاں تھے۔

---

[1] Eubaea. [2] Lesbos
[3] Lemnos. [4] Cephalonia
[5] Adriatic [6] Gradina
[7] Tagliamea [8] Isonzo.
[9] Giarz.
[10] Knight - Templars
[11] Rhodes

۱۴۸۰ء میں محمد فاتح نے ایک لشکر جنرل مسیح پاشا کی سرکردگی میں انکی سرکوبی کے لئے بھیجا مگر کامیابی نہ ہوئی۔ مسیح پاشا نے نہایت آسانی سے نصف جزیرہ پر قبضہ کر لیا مگر اسی وقت اس سے ایک غلطی یہ ہو گئی کہ اس نے اعلان کر دیا کہ کل مال غنیمت سلطان کا حق ہے۔ اس خبر سے ترکی سپاہ کے ولولے پست ہو گئے اور مجبوراً مسیح پاشا کو محاصرہ اٹھانا پڑا۔

محمد ثانی کے فاتحانہ انداز کو دیکھ کر پاپائے روم گرویدہ ہو گیا اور اس کے پاس پیام بھیجا کہ وہ عیسائی ہو جائے اور یہ کہ صرف پانی کے چند قطرات (تپسمہ) اوس کو بغیر کسی فوج کے مشرق و مغرب کا شہنشاہ بنا دیں گے۔ محمد نے اس کا جواب سخت لہجہ میں دیا اور اپنی فوج اٹلی کی جانب بڑھا دی، ٹھیک اسی دن جب ترکوں نے روڈس کا محاصرہ اٹھایا وزیر احمد فاتح کریمیا نے اٹلی کے جنوبی و شرقی اوٹرنٹو[1] پر جو کہ برنڈزی[2] کے قریب ہے قبضہ کر لیا محمد فاتح کو موت نے فرصت نہ دی ورنہ وہ کل اٹلی پر قبضہ کر لیتا۔ ۱۴۸۱ء میں اس نے ایک زبردست بحری بیڑہ طیار کیا غالباً اس کا ارادہ روڈس پر خود حملہ کرنے کا تھا۔ مگر موت نے یہ منصوبہ بھی پورا نہ ہونے دیا۔

محمد فاتح کی فتوحات کا مختصر حال بیان کرنے کے لئے ضرورت ہے کہ اس عہد کے آئین و قوانین پر بھی ایک نظر ڈالی جائے۔ خاندان عثمانیہ میں خاص طور سے پانچ سلطانوں نے اس طرف توجہ کی جن میں محمد ثانی و سلیمان خاص طور پر

---

[1] Otranto [2] Brindisi

قابل ذکر ہیں۔ سلاطین ترکی ہمیشہ آزاد رہے۔ ان پر اگر کچھ اثر تھا تو مفتیوں کا مگر خود ترکے سلاطین ان کی بھی پرواہ نہ کرتے تھے۔ عموماً صرف تین باتیں ایسی ہیں جن کی پابندی سلطان پر لازم تھی۔ اوّل پابندی احکام قرآن کریم۔ دوم پابندی احادیث۔ سوم فتاوائے علمائے دین و شیخ الاسلام۔ لیکن ترکوں کی قومی مارشل اسپرٹ ہمیشہ سلطان کو سیدھا راستہ چلنے پر مجبور کرتی تھی اور اس اسپرٹ کا جب ناجائز استعمال کیا گیا تو یہی دولت عثمانیہ کے زوال کا باعث ہو گئی۔

ترکی حکومت کے چار رکن تھے اوّل وزارت۔ دوم قضات۔ سوم محکمہ جات چہارم معتمدین و نائب معتمدین۔

محمد فاتح کے زمانہ میں چار وزرا رہتے تھے۔ جن میں ایک وزیر اعظم ہوتا تھا۔ ایشیا اور یورپ کے لئے علیحدہ علیحدہ دو قاضی تھے۔ قضات کے سلسلہ میں ایک گروہ خواجوں کا بھی تھا جو سلطان اور دیگر ممبران خاندان شاہی کی تربیت میں مصروف رہتا تھا شہر قسطنطنیہ کے لئے قاضی علیحدہ تھا محکمہ جات کے سپرد حساب کتاب اور خزانہ تھا۔ معتمدین وغیرہ معاون و مددگار تھے۔ سلطنت دو حصوں میں منقسم تھی ایک کے کا انتظام براہ راست گورنمنٹ ترکی سے متعلق تھا اور دوسرے حصہ پر خود اسی جگہ کے لوگ حکمران تھے اور خراج ادا کرتے تھے یہ حصہ صوبوں میں منقسم تھا۔ ان صوبوں کا انتظام پاشاؤں کے سپرد تھا اور ان کے ماتحت بے[۱] اور بیگلربیگ[۲] تھے۔ وقت ضرورت سلطان کی امداد ان پر لازم تھی۔ محمد ثانی کے زمانہ میں تنخواہ دار فوج ایک لاکھ تھی اس وقت یورپ میں کہیں تنخواہ دار فوج کا رواج نہ تھا۔ محمد ثانی کے حالات کا

---

۱ Bey   ۲ Beylerbey

مطالعہ کرنے سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اُس کی خاص توجہ توپخانہ اور رسد رسانی کی طرف رہتی تھی۔ سولہویں اور سترہویں صدی عیسوی میں سلطنت عثمانیہ میں جو عزت سپاہی کی تھی وہ کہیں نہ تھی یہی وجہ تھی کہ ترک عام طور پر مسیحی افواج پر غالب آتے تھے۔

محمدؐ فاتح نے مفتوح مقامات کی تقسیم تین طریقہ پر کی تھی۔

(۱) اوقاف بنا بر اخراجات امور مذہبی۔

(۲) موروثی زمینداری جن سے لگان وصول ہوتا تھا مسلمان پیداوار کا دسواں حصّہ اور غیر مسلم حسب معاہدہ آٹھویں حصّہ سے نصف تک ادا کرتے تھے۔

(۳) وہ زمین جو مختلف حصوں میں منقسم تھی۔

(۱) زمین جس سے مالگذاری وصول ہوتی تھی۔

(۲) سلطان کی ذاتی جاگیر۔

(۳) والدۂ سلطان ونیز دیگر ممبرانِ شاہی کی جاگیر۔

(۴) وزراء سلطنت کی جاگیر۔

(۵) دوم درجہ کے پاشاؤں کی جاگیر۔

(۶) دیگر ملازمین کی جاگیر۔

(۷) خلاف معاہدہ افعال کی سزا میں ضبط شدہ جاگیر۔

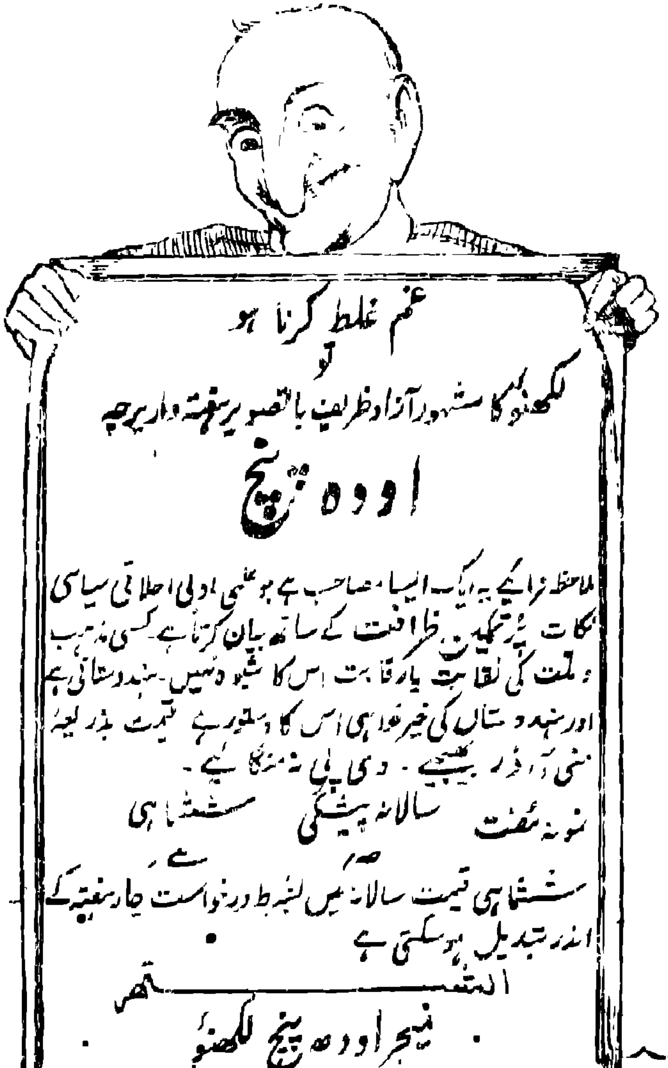
(۸) رعایا کی جاگیریں جو فوجی خدمات کے وعدہ پر عطا کیجاتی تھیں۔

(۹) غیر مزروعہ زمین۔

ترکوں کو شروع زمانہ سے مدرسے قائم کرنے کا شوق تھا مگر محمدؐ فاتح کے زمانہ

میں اُن کی تعداد بہت بڑھ گئی تھی اُس نے نہ صرف نئے مدرسے قایم کئے بلکہ پُرانی درس گاہوں کی بھی دیکھ بھال رکھی۔ مدارس میں جو مدرس مقرر کئے جاتے تھے اُنکے لئے ضروری تھا کہ وہ اپنے مضمون میں ماہر ہوں اور اُن کو اس قدر تنخواہ دی جاتی تھی کہ اپنی پوری توجہ درس وتدریس کی طرف دے سکیں۔ ہر مدرسے میں دس جماعتیں تھیں کامیاب طالبعلم کو دانشمند کی سند ملتی تھی ہر مدرسے کے پرنسپل کو دانشمند کی سند حاصل کرنی پڑتی تھی۔ جو طلبا حصول سند کے بعد علما کے سلسلہ میں داخل ہونا چاہتے تھے اُن کو چند سال مزید تعلیم حاصل کرکے تحقیق وتدقیق کا کام کرنا پڑتا تھا۔ کالج کے پرنسپل کا انتخاب علما میں سے ہوتا تھا علما کے لئے یہ ضروری تھا کہ وہ صرف مذہبی اشاعت وتبلیغ کا کام انجام دیں وہ درس وتدریس کا کام بھی کرتے تھے اُن پر کسی قسم کی روک تھام نہ تھی۔ مضمون بہت طویل ہو گیا مگر محمد فاتح کے کیرکٹر کی بابت بغیر کچھ تحریر کئے مضمون ادھورا رہجائیگا۔ محمد صرف اکیس سال کا تھا جب وہ بعد وفات مرادِ ثانی تخت نشین ہوا اور تیس سال تک حکومت کی اس دوران میں صرف دو ایسے مواقع تھے جہاں اوسکو کامیابی نہیں ہوئی۔ بلغراد کے محاصرہ میں وہ خود شریک تھا اور محاصرہ روڈس میں اُس نے اپنے جنرل کو بھیجدیا تھا۔ علاوہ ان مقاموں کے جس طرف اُس نے توجہ کی فتح ونصرت نے ہمرکابی کی۔ اس کی تیس سالہ کامیاب جنگی مصروفیت پر نظر ڈالتے ہوئے اُس کو وہی درجہ دینا پڑتا ہے جو مدبرین یورپ سکندر وجولیس سیزر کو دیتے ہیں فرق یہ ہے کہ سکندر وسیزر کی فتوحات کو قرار نہ تھا اون کی وفات کے بعد سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا مگر محمد ثانی کی فتوحات ایسی نہ تھیں جو ایک دفعہ ہاتھ میں آکر نکل جائیں۔ مورخینِ یورپ کسی مشرقی فاتح کی فتوحات کو ٹھنڈے دل

سے نہیں دیکھ سکتے اسی لیے محمد فاتح بھی اُن کے قلم سے نہ بچ سکا۔ محمد ثانی نے اپنی فتوحات کا مدار ہمیشہ رازداری پر رکھا کہا جاتا ہے کہ اُس نے ایک مرتبہ زبردست تیاریاں کیں وزیر نے اُس کا ارادہ معلوم کرنا چاہا تو اُس نے جواب دیا کہ اگر میرے ارادوں کا علم میری ڈاڑھی کے بالوں کو ہو جاوے تو میں اُنکو بھی اُکھاڑ کر جلا دوں۔ فقط



منطق شہادت

(گذشتہ سے پیوستہ)

(جناب پروفیسر مولوی مقصود ولی الرحمٰن صاحب - ایم - اے)

منطقیوں نے مشاہدہ میں غلطی کے دو ممکن ذرایع بیان کئے ہیں - پہلی صورت کو اصطلاحاً مغالطہ عدم مشاہدہ کہتے ہیں، اور دوسری کو مغالطہ سوء مشاہدہ - عدم مشاہدہ کی پھر دو صورتیں ہو جاتی ہیں - مثالوں سے ان کی توضیح ہو گی - بعض اوقات ایسا ہوتا ہے، کہ ہم جس شخص کا ذکر کرتے ہوتے ہیں، وہ شخص موجود ہو جاتا ہے، اور جس شے کو ہم خواب میں دیکھتے ہیں، وہ شے دوسرے روز وقوع میں آجاتی ہے - اس ہی نوع کی بہت سی مثالوں کی بنا، پر بعض لوگ خوابوں کو سچا سمجھنے لگتے ہیں - اسی طرح اکثر اشخاص کو نجومیوں اور رمالوں سے آیندہ حالات دریافت کرنے کا خبط ہوتا ہے یہ لوگ صرف ان مثالوں کو لے کر جن میں ان کی پیشین گوئی صحیح ثابت ہوئی تھی، نجوم ورمل پر ایمان لے آتے ہیں - اسی قسم کی اور صورتوں میں ہوتا ہے، کہ وہ بات محض اتفاق سے درست ہوتی ہے ...... یہ لوگ ان مثالوں کو نظر انداز کر جاتے ہیں، جن میں وہ بات صحیح ثابت نہیں ہوئی - امثال موجبہ پر غور کرنے، اور امثال سالبہ ومخالفہ کو نظر انداز کرنے سے یہ نتیجہ نکال لیا جاتا ہے -

امثال سالبہ کو نظر انداز کرنے کا یہ فطری میلان اس وقت اور بھی قوی ہوتا ہے جب امثال موجبہ ایسے مسئلہ کی مثالیں ہوں، جس کو پہلے ہی سے تسلیم کر رکھا ہو، یا جو شہادت

ان مثالوں سے حاصل ہوتی ہے، اس کی تائیدہ تعصب، عقیدت، تنفر، محبت وغیرہ جذبات شامل ہوں۔ مثلاً عوام الناس نے سحر اور عملیات کے اثر اور چڑیلوں اور بھوتوں کے وجود کو تسلیم کر رکھا ہے، تو تمام ایسی روایات، جن سے ان اشیاء کے اثر، یا وجود کی تصدیق ہوتی ہے۔ نہایت شوق اور اعتبار سے سُنی جاتی ہیں۔ برخلاف اس کے بعض ایسی مثالیں جہاں سحر کا کچھ اثر نہیں ہوتا، یا بھوت اور چڑیلوں کے متعلق روایات غلط ثابت ہوتی ہیں، اکثر تو نظر انداز کر دی جاتی ہیں، اور اگر ان پر غور کیا جاتا ہے، تو دل کو اس طرح سمجھا لیا جاتا ہے، کہ شاید ان موقعوں پر کسی اور اعلیٰ اور قوی تر علت نے سحر کے اثر کو زائل کر دیا ہو۔

اس کے علاوہ تعصب، عقیدت، تنفر، یا محبت وغیرہ کے جذبات اکثر اپنے معارض مثالوں کا مشاہدہ کرنے ہی نہیں دیتے۔ ہر عاشق اپنے معشوق میں، اور تمام والدین اپنے بچوں میں، سوائے حُسن و خوبی کے اور کچھ نہیں دیکھتے۔ اسی طرح ایک متعصب شخص کو اپنے مذہب میں سوائے خوبیوں کے، اور دوسروں کے مذہب میں سوائے بُرائیوں کے اور کچھ نہیں دکھائی دیتا۔ ان تمام صورتوں میں مشاہدہ بالکل غلط ہو جاتا ہے۔ تعصب وغیرہ کی وجہ سے اصلیت بالکل مسخ ہو جاتی ہے۔ ہر ایک چیز من مانی صورت میں دکھائی دیتی ہے۔

پھر تعصب وغیرہ جذبات کا صرف یہی اثر نہیں ہوتا، کہ امثال مخالفہ نظر انداز کر دی جاتی ہیں، بلکہ ان کی وجہ سے لوگ ایسے اقوال تسلیم کر لیتے ہیں، کہ اگر ان کا تجربہ کیا جائے، تو وہ بالکل بے بنیاد ثابت ہوتے ہیں۔ گیلی لیو کے زمانے تک ہر شخص یہ مانتا چلا آرہا تھا۔ کہ گرنے والے اجسام اور زمین تک پہونچنے کی مدت میں نسبت معکوس

ہوتی ہے۔ یعنی پانچ سیر کا وزن ایک سیر وزن کی نسبت ایک خمس مدت میں زمین پر پہنچے گا اس قول کی صحت کی جانچ کے لئے ایک سادہ تجربہ کرنا کچھ مشکل نہ تھا۔ لیکن کسی نے یہ زحمت گوارا نہ کی، اور ان مسائل کو بغیر چون و چرا مانتے چلے گئے۔

فطرت انسانی کا ایک میلان یہ بھی ہے کہ وہ اکثر کسی واقعہ کے چند نمایاں اور اول ہی اول ظاہر ہونے والے امثال کو دیکھ لیتا ہے، اور ان ہی کی بناء پر ایک کلیہ قائم کر لیتا ہے۔ جب ہم کسی قوم، یا پیشہ، یا جماعت کے چند اشخاص میں چند مخصوص خصائل دیکھ لیتے ہیں تو اکثر ایسا ہوتا ہے، کہ ہم یہ ایمان لے آتے ہیں، کہ تمام قوم، پیشہ یا جماعت میں یہ خصائل پائے جائیں گے۔ اسی طرح جب کوئی شخص غیر ملک میں سفر کرتا ہے، تو اکثر اس کو پہلے پہل گاڑی بانوں، قلیوں اور بھٹیاریوں سے کام پڑتا ہے، اور وہ سیاح ان لوگوں کے خصائل پر استدلال کر کے تمام قوم کو متمدن، یا غیر متمدن، خوش خلق یا بد خلق قرار دے لیتا ہے۔

یہ تمام مذکورہ بالا صورتیں مغالطہ عدم مشاہدہ کی اس صورت سے تعلق رکھتی ہیں، جس میں بعض مثالوں پر غور، اور بعض کو نظر انداز کر کے ایک خاص نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور صورت یہ ہوتی ہے، کہ ہم کسی ایک ایسی مثال کو بھی نظر انداز نہیں کرتے لیکن ہر ایک مثال میں ہمارا مشاہدہ غلط ہوتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہاں نقص مثالوں کی تعداد میں نہیں، بلکہ ان کی کیفیت میں ہوتا ہے۔ ایسی حالتوں میں ہوتا یہ ہے، کہ چند ایسے ضروری عوارض کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے، جو واقعہ زیر مشاہدہ سے متعلق ہوتے ہیں، اور ان ضروری عوارض کو نظر انداز کر کے استدلال کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر ڈگبی نے زخموں کے علاج کا ایک نیا طریقہ نکالا تھا، کہ جب ہتھیار سے زخم پہونچتا تھا، اس پر ایک سفوف

چھڑک کر، اور مرہم لگا کر دن میں دو تین مرتبہ صاف کیا جاتا تھا۔ اس کے بعد زخم کو روئی وغیرہ رکھ کر مضبوط باندھ دیا جاتا تھا، اور سات دن کے بعد کھولا جاتا تھا تو زخم بالکل مندمل ملتا تھا اس قسم کی بہت سی مثالوں کے مشاہدے کے بعد عام خیال یہ قائم ہوا تھا، کہ وہ اندمال زخم پہنچانے والے ہتیار پر مرہم لگانے کا نتیجہ تھا۔ لیکن حقیقت میں زخم کے اچھا ہونے کا سبب یہ تھا، کہ سات دن تک زخم مضبوط بندھا رہتا تھا، اور اس وجہ سے باہر کی ہوا نہ لگتی تھی۔

پھر مشاہدہ میں غلطی کی ایک وجہ یہ ہوتی ہے، کہ جس چیز کو ہم مشاہدہ کہتے ہیں، وہ اصل میں مشاہدہ نہیں ہوتا، بلکہ استدلال کا نتیجہ ہوتا ہے۔ ہم شام کے وقت باہر نکلتے ہیں اور دیکھتے ہیں، کہ سڑکوں پر دو رویہ پولیس کے سنتری کھڑے ہیں، تمام بازار سجے ہوئے ہیں، تمام دکانیں اور مکان آئینہ بند ہیں، لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے ہوئے ہیں، فوج کے گورے نہایت اہتمام سے ادھر اُدھر پھر رہے ہیں۔ ان تمام حالات کو دیکھکر جب ہم گھر واپس آتے ہیں، تو بیان کرتے ہیں کہ گورنر کی سواری نکلنے والی ہے۔ ہمارا یہ مشاہدہ سواری کا نہ تھا، بلکہ اس انتظام و اہتمام کا تھا جو اس سواری کے لئے ہو رہا تھا۔ چونکہ ہم نے ہمیشہ اس قسم کے انتظام کو سواری کے لئے ہوتا دیکھا ہے، اس لئے شہادت ہمنے انتظام کی نہ دی، بلکہ سواری کی دی۔ ظاہر ہے، کہ یہ شہادت مشاہدہ پر مبنی نہ تھی بلکہ اس نتیجہ پر موقوف تھی، جو ہم نے انتظام کو دیکھ کر اخذ کیا تھا۔ ان حالات میں شہادت کا غلط ثابت ہونا بعید از قیاس نہیں۔ ممکن ہے، کہ وہ انتظام گورنر کی سواری کے لئے نہ ہو، بلکہ کسی اور مصلحت سے کیا گیا ہو۔

یہ صحیح ہے کہ مشاہدے کے ان نقایص کو شہادت میں معلوم کرنا صرف دشوار ہی

نہیں بلکہ ناممکن بھی ۔ لیکن اگر شاہد نے گذشتہ موقعوں پر اپنے آپ کو ہر یا ایک خاص، قسم کے واقعات کے مشاہدہ کرنے کا اہل ثابت کیا ہے تو ہم کو اطمینان ہو جانا چاہئے، کہ وہ اپنے آپ کو ان سے محفوظ رکھ سکے گا، اور اس طرح اس کے مشاہدہ میں نہ تو امثال مخالفہ وسالبہ کو نظر انداز کیا گیا ہوگا، نہ واقعہ زیر مشاہدہ کے بعض ضروری عوارض کو ترک کیا گیا ہوگا، اور نہ یہ اصلی واقعہ مشاہدے کا نتیجہ ہوگا۔

یہاں تک صرف مشاہدہ کرنے، اور اس مشاہدہ کے بیان کرنے سے بحث تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی، جیسا کہ اوپر دکھا چکے ہیں، یہ بھی ضروری ہے، کہ شاہد دیانتدار، راست گو اور خالص النیت ہو۔ لیکن مشکل یہ ہے، کہ ہم کو اس کی ان صفات کا پوری طرح یقین نہیں ہو سکتا، اگرچہ اس یقین کا بڑے سے بڑا علم ہو سکتا ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ اگرچہ ہم کو شاہد کے کیرکٹر اس کی عادات و خصلات سے اس قدر مکمل واقفیت ہے کہ ہم اس کی صداقت پر اعتماد کر سکتے ہیں، لیکن دل کا حال سوائے عالم الغیوب کے اور کون جانتا ہے۔ اس دنیا میں اکثر طاقتیں ایسی ہیں، جو بڑے سے بڑے متدین اور متقی شخص کو صراط مستقیم سے منحرف کر دیتی ہیں۔ عادات کا طبیعت ثانیہ ہونا مسلم ہے، لیکن جب ان طاقتوں کے زیر اثر طبیعت اُولیٰ ہی بدل جاتی ہے، تو طبیعت ثانیہ تو یقیناً خارج از بحث ہے، فطرت انسانی کی کمزوریوں کی فہرست بہت طویل ہے۔ ان ہی کمزوریوں میں سے کوئی ایک بروئے کار آ کر انسانی ارادوں کو کچھ کا کچھ کر دیتی ہے۔ لیکن اپنی ،، روزمرہ زندگی میں شہادت پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ ہم شاہد کی خلوص نیت پر اعتبار کرتے ہیں اگرچہ بعض شہادتوں کو ہم مسترد بھی کر دیتے ہیں۔ شاہد کی دیانتداری اور صداقت کا اندازہ کرنے کے لئے ایک طریقہ تو یہ اختیار کر سکتے ہیں، کہ اس کی گذشتہ زندگی کے حالات

پر غور کریں، اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں کہ صداقت و دیانتداری کو محبوب رکھتا ہے یا نہیں۔ اگر رکھتا ہے تو ہم کو اس خاص موقعہ پر بھی اس کی صداقت کا ایک حد تک یقین ہونا چاہئے۔ لیکن کیا فطرت انسانی کا یہ ایک عام اور معمولی منظر نہیں، کہ ایک شخص اپنا اعتبار بڑھانے کے لئے کچھ مدت تک تو نہایت دیانتدار رہتا ہے، اور جب اعتبار پوری طرح سے قائم اور مستحکم ہو جاتا ہے، تو ایک ایسا ہاتھ مارتا ہے، کہ گزشتہ دیانتداری کی محسوس کے تلافی ہو جاتی ہے۔ اس بنا پر کسی کی عادت صداقت پر بھروسہ نہ ہونا چاہئے، لیکن اس دنیا میں رہنا اور اپنے ہمجنسوں سے معاملہ نہ رکھنا، بقول ارسطو کے یا تو فرشتوں سے ممکن ہے، یا وحوش سے، انسان سے ممکن نہیں۔ اب اگر ابنا جنس سے تعلق رکھنا بھی ضروری ہے، تو یہ تعلق بغیر اعتماد و اعتبار کے قائم نہیں رہ سکتا۔ اس اعتماد و اعتبار کا یقین ہمیشہ عادات کی بنا پر ہوتا ہے کیونکہ یہ عام خیال ، صحیح ہے، کہ انسان اپنی عادات کا غلام ہوا کرتا ہے۔ بہر کیف باوجود ان تمام نقائص کے شاہد کی صداقت کو ہم صرف عادات کی بنا پر معلوم کر سکتے ہیں، لیکن اپنے مزید اطمینان کے لئے اس کے ساتھ یہ بھی کر سکتے ہیں کہ اس پر بھی غور کر لیں کہ شہادت دینے کے وقت کوئی ایسا محرک تو عمل نہیں کر رہا، جس کی وجہ سے اس نے اپنی عادت کو ترک کر دیا ہو۔ اگر اس قسم کا محرک ہے تو عادت یقیناً قابل اعتبار نہیں۔ اپنی جان کس کو پیاری نہیں ہوتی۔ بہت ممکن ہے کہ وہ شاہد جو راست گوئی کا عادی ہے، کسی مستبد اور ظالم بادشاہ کے سامنے شہادت دے رہا ہو۔ ایسی حالت میں یہ کیا بعید ہے، کہ وہ اپنی جان بچانے کے لئے جھوٹ بول جائے اور اس طرح غلط شہادت دے دے۔ "سرکاری گواہوں" کی شہادت اسی وجہ سے ناقص سمجھی جاتی ہے کہ وہ قید و بند کی مصیبت سے نجات پانے کی امید میں دروغ گوئی کا مرتکب ہو سکتا، اور ہوتا ہے۔ اطمینان مزید کیلئے اس

پر جرح کے سوالات کئے جاتے ہیں۔ اگر ان سوالات کے دوران میں کہیں اس کی تناقض بیانی ثابت ہو جاتی ہے، تو محض اس تناقض بیانی کی وجہ سے اس کی شہادت پایۂ اعتبار سے گر جاتی ہے، کیونکہ اگر یہ شہادت سچی ہوتی، تو یہ تناقض ناممکن تھا۔

مختصر یہ کہ شاہد کی صداقت و دیانتداری کو معلوم کرنے کا پہلا ذریعہ تو یہ ہے کہ ہم اس کے کیرکٹر کی اچھی طرح جانچ کریں۔ دوم یہ کہ ایسے محرکات کی عدم موجودگی ثابت کریں جن کے زیر اثر وہ شخص دیدہ و دانستہ دروغ گوئی پر مجبور ہوتا ہے۔ سوئم یہ کہ جرح کے سوالات کر کے یہ دیکھیں کہ اس میں کسی قسم کا تناقض تو نہیں۔ لیکن اس کو نہ بھولنا چاہئے کہ ان تینوں ذرائع سے ہم کو شاہد کی صداقت و خلوص نیت کا پورا پورا یقین نہیں ہو سکتا البتہ یقین کا غلبہ ہو جاتا ہے۔

یہاں تک ذکر تھا اس شاہد کا جو دیدہ و دانستہ غلط بیانی کرتا ہے، یہ غلط بیانی جلب منفعت کے لئے ہو، یا دفع مضرت کے لئے یا کسی غرض سے۔ لیکن بعض شہادتیں ایسی بھی ہوتی ہیں، جن میں وہ دیدہ و دانستہ دروغ گوئی نہیں کرتا، لیکن باوجود اس کے اس کی شہادت بالکل، یا تقریباً، غلط ہوتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس کی دروغ گوئی شعوری نہیں بلکہ غیر شعوری ہوتی ہے۔ چنانچہ بعض طبائع مبالغہ پسند ہوتی ہیں۔ وہ اسی مبالغہ پسندی کی وجہ سے ذراسی بات کو افسانہ کر دیتی ہیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ اصلیت بالکل مسخ ہو جاتی ہے۔ بعض اپنے تجربے یا مشاہدے کی تفریط کی تلافی استدلال و تخیل کے افراط سے کرتے ہیں۔ بچوں کے بیانات میں تخیل کی رنگ آمیزی بکثرت ہوتی ہے۔ بعض اشخاص محض اپنی اہمیت، شہرت اور عظمت بڑھانے کے خیال سے من گھڑت قصے اصلی واقعہ کے ساتھ شامل کرتے جاتے ہیں۔ ایسا

بھی ہوا کرتا ہے، کہ واقعہ کی دلکشی و دلچسپی بڑھانے کے لئے اس میں اپنی طرف سے بہت سی باتیں داخل کردی جاتی ہیں۔ یہ تمام وہ اسباب ہیں جن سے شہادت نادانستہ طور پر غلط ہو جاتی ہے۔ شاید بزعم خود تمام واقعات صحیح صحیح بیان کرتا ہے، لیکن یہ اثرات برابر کام کئے جاتے ہیں۔

ان کے ساتھ اس کو بھی شامل کرلینا چاہئے، کہ ہمارا حافظہ بہت غدار ہوتا ہے۔ اکثر اوقات تو ایک واقعہ کی بہت سی باتیں ہم کو یاد نہیں رہتیں۔ بعض اوقات اس واقعہ کو بیان کرنے میں ایسی باتیں شامل کردی جاتی ہیں، جن کو اس واقعہ سے کسی قسم کا تعلق نہیں ہوتا۔ بسا اوقات یہ بھی ہوتا ہے، کہ واقعات کی ترتیب بدل جاتی ہے۔ جس ترتیب میں انکا مشاہدہ ہوا، وہ یاد نہیں رہتی۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے، کہ اس کے بیان کرنے میں ترتیب مختلف ہو جاتی ہے۔ اس میں شک نہیں، کہ عام طور پر اس اختلاف ترتیب سے شہادت میں کچھ فرق نہیں آتا، لیکن بعض واقعات اس قسم کے بھی ہوتے ہیں، جن میں ترتیب بہت ضروری ہوتی ہے۔ گویا حافظہ کی کمزوری سے تین مختلف قسموں کے نقائص پیدا ہو سکتے ہیں، یعنی متعلق باتوں کو ترک کردینا، غیر متعلق باتوں کو شامل کردینا، اور ترتیب کا بدل جانا پھر جس طرح وقت گزرتا جاتا ہے، اسی طرح ان نقائص کا احتمال قوی ہوتا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے، کہ کیمیا، طبیعیات وغیرہ اختیاری علوم میں تاکید کیجاتی ہے، کہ جو کچھ مشاہدہ کیا جائے، اس کو فوراً تحریر میں ضبط کرلیا جائے، تاکہ ذہول کی وجہ سے کوئی بات چھوٹ نہ جائے۔ لیکن ہر شہادت میں یہ بات حاصل نہیں ہوتی۔ وہ لوگ جن کی تحریرات آجکل تاریخ کی بنیاد ہیں، ہر وقت کاغذ پنسل نہ لئے پھرتے تھے۔ تحریری کاغذات اور دستاویزات ہمیشہ حافظہ کی مدد سے مرتب کی جاتی ہیں۔ لہٰذا ظاہر ہے، کہ واقعہ کا جسقدر حصہ فراموشی

کے نذر ہو جاتا ہے، اس کو وہ اپنی طرف سے پورا کیا جاتا ہے، اور استدلال و تخیل سے مدد لی جاتی ہے۔ ناموافق اور ناہموار باتیں نکال دی جاتی ہیں، اور ایک مسلسل قصہ گڑھ لیا جاتا ہے جو بظاہر حالی تجربہ کی ہو بہو نقل نظر آتا ہے۔ جسقدر وقت گزرتا جاتا ہے، اسی قدر علیہ اس تعمیری کام کا ہوتا جاتا ہے۔ ضعیف العمر اشخاص کا حافظہ خاص کر بہت خطرناک ہوتا ہے۔

دہلی کے غدر اور حیدرآباد کی موسی ندی کی طغیانی کے چشم دید واقعات بیان کرنیوالوں کی شہادت کو اسی وجہ سے ذرا احتیاط سے صحیح تسلیم کرنا چاہیئے۔ اکثر واقعات جن کو وہ بیان کرتے ہیں "ایجادات بندہ" ہوتے ہیں اور ان کو اصلیت سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ قلیل عرصہ گذرنے کے بعد بھی گو حافظہ میں خلل واقع ہوتا ہے، لیکن اس حالت میں غلطی کا احتمال کم ہوتا ہے۔ لہٰذا شاہد کی شہادت کی جانچ کرتے وقت ہم کو یہ دریافت کرنا چاہیئے کہ وہ بلحاظ زماں اس واقعہ کے کس قدر قریب تھا، اور یہ کہ اس نے کتنے عرصے کے بعد اس کو تحریر میں ضبط کیا ہے۔ تیسرے یہ کہ اس کا حافظہ کہاں تک قابل اعتبار رہے۔ پھر خود شہادت کے نقد و نظر سے ہم تخمینی حد تک کہہ سکتے ہیں، کہ فلاں حصہ نسیان کے نذر ہو چکا ہے، فلاں حصہ استدلال کا نتیجہ ہے، اور فلاں تخیل کا۔ وغیرہ۔

تعصب، بغض، عداوت وغیرہ جذبات کے زیر اثر شہادت میں جو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں، ان کی طرف ہم پیچھے کہیں اشارہ کر چکے ہیں۔ صرف اسی شاہد کی شہادت پر اعتبار کیا جا سکتا ہے جو ان تمام باتوں سے پاک ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ایک غیر جانبدار اور بے غرض شخص کی شہادت پر من حیث الشہادت فائق ہوتی ہے۔

اگر یہ شہادت تحریری ہے، تو اس پر مصنف کی انشا پردازی کی بھی گنجائش رکھنی ضروری ہے۔ بعض لوگ انشا پردازی کے زور میں آکر نادانستہ طور پر غلط بیانی کے مرتکب ہو جاتے

ہیں تشابیہ و استعارے، پرشکوہ الفاظ، چست بندشیں، نئی نئی ترکیبیں، اور اسی قسم کی اور چیزیں انشاپردازی کی جان ہوتی ہیں، اور یہی شہادت کی صحت کو برباد کرنے والی ہیں۔ تاریخی ناولوں یا نظموں کا رتبہ بطور سند کے تاریخی کتب کے برابر نہیں ہوتا۔ وجہ یہی ہے، کہ مقدم الذکر میں محض زیب داستان کے لئے بہت سی بے کار اور غیر متعلق باتیں شامل کر دی جاتی ہیں۔ آزاد مرحوم کی دربار اکبری اور آب حیات اور شرر کے تمام تاریخی ناول اس قسم کی شہادت کی زندہ اور عمدہ مثالیں ہیں۔ بہ لحاظ انشاپردازی اور ادب ان کا رتبہ خواہ کچھ ہی ہو لیکن بحیثیت تاریخی شہادت کے یہ بالکل بے کار ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے، کہ زبان، جس کے ذریعہ سے اس واقعہ کو بیان کیا جاتا ہے، غلطی کا ایک اور ذریعہ ہے۔ ہو سکتا ہے، کہ مشاہدہ صحیح ہو، لیکن اس کے بیان کرنے میں اصلیت کا بدل جانا ناممکن نہیں۔

جب شاہد کی ان دونوں صفات، یعنی صداقت و اہلیت، کی طرف سے ہمارا اطمینان ہو جائے تو شہادت بھی قابل اعتبار ہو جاتی ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے، کہ ان دونوں صفات کے باوجود اگر وہ واقعہ جس کے متعلق شہادت دی جا رہی ہے، عام اور روزمرہ تجربے کے خلاف ہو، تو شہادت بے کار ہو جائے گی۔ اسی خیال کی بنا پر ہیوم نے معجزات کو ناقابل ثبوت قرار دیا ہے۔ اس کا خیال ہے، کہ یہ سب معمولی اور عام قوانین فطرت کے خلاف ہوتے ہیں اور ہم کو ان کے مشابہ واقعات کا کبھی تجربہ نہیں ہوا۔ اسی وجہ سے ان کے متعلق ہر شہادت ناقابل اعتبار ہے، اگرچہ اس کے ساتھ اس کو ان واقعات کے شاہدوں پر اعتماد کلی ہے۔ یہ خیال باطل ہے۔ اس کے برعکس ہم یہ کہہ سکتے ہیں، کہ جہاں شاہد کا اعتبار مسلم اور ناقابل انکار ہے، وہاں صرف اس سبب سے کہ وہ واقعہ خود غیر معمولی اور عجیب ہے، شہادت اور پرزور ہو جاتی ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے، کہ ان کے محض ایسا ہونے ہی سے صادق القول اور ذی عقل انسان

ان کی طرف اور توجہ کرتے ہیں، اور اس طرح اپنے مشاہدات کو اور زیادہ صحت اور تفصیل کیساتھ بیان کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔

اب عام شہادت کی قابلیت اعتبار کی اس تمام بحث کو مختصراً اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ ایک شہادت اس وقت قابل وثوق ہوتی ہے۔ جب اس کے مشہود و شاہد میں خاص خاص صفات پائی جائیں۔ مشہود کے لئے ضروری ہے، کہ وہ تجربے کی اعلیٰ قوت، یعنی فہم اسکے معروض کی حیثیت سے اطلاقاً، اور ادنیٰ قوا، یعنی حواس اور شعور ذات اسکے معروض کی حیثیت سے اضافاً، ممکن الوقوع ہو۔ جب یہ ثابت ہو جائے، تو شہادت، من حیث الشہادت درست ہوتی ہے۔ شاہد کے لئے صداقت اور اہلیت لازمی ہے۔ اس کی صداقت اس وقت تک مشتبہ نہیں ہوتی، جب تک کہ ہمارے پاس اس پر شبہ کی کوئی وجہ نہ ہو، یا جب خود فریبی کا عام امکان اس شبہ کی بنا ہو۔ شاہد کی اہلیت اس وقت مسلم ہوتی ہے، جب مشاہدہ کرنے، اور اس مشاہدہ کی اطلاع دہی کے خلاف کچھ شکایت نہ ہو۔ عام شہادت کی قابلیت اعتبار پر اس بحث کے بعد اب ہم اس کی مخصوص قسموں، یعنی بلاواسطہ اور بالواسطہ، کی قابلیت اعتبار کی طرف توجہ کرتے ہیں۔

ہم نے پیچھے کہیں اس شہادت کو بلاواسطہ کہا ہے، جس میں وہ واقعہ جس کے متعلق شہادت دی جارہی ہے، خود راوی یا ناقل کا مشاہدہ ہو۔ اسی موقعہ پر ہم نے یہ بھی کہا تھا، کہ بلاواسطہ شہادت بالواسطہ شہادت کے مقابلے میں زیادہ مرجح اور زیادہ معتبر ہوتی ہے۔ اب گزشتہ تمام بحث سے ظاہر ہے کہ بلاواسطہ شہادت کی قابلیت اعتبار میں اس وقت اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے، جب شاہد و مشہود میں تمام وہ صفات و شرائط پائی جائیں جن کا اوراق ماقبل میں ذکر ہوا ہے۔ اب ہم کہہ سکتے ہیں، کہ بلاواسطہ شہادت اس وقت معتبر کہی جا سکتی ہے، جب شاہد میں شاہد

کرنے کی قابلیت زیادہ ہو۔ اس شہادت کی قابلیت اعتبار ہمیشہ مشاہدہ کرنے کی قابلیت کی نسبت سے ہوتی ہے۔ جسقدر زیادہ قابلیت مشاہدہ کی ہوتی ہے اسی قدر زیادہ معتبر وہ شہادت ہوجاتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے، کہ قابل وکمل مشاہدہ کرنے کے راستہ میں رُکاوٹیں کم ہوں۔ یہاں قابلیت اعتبار اور مشاہدہ کے راستہ میں رُکاوٹوں میں نسبت معکوس ہوا کرتی ہے یعنی یہ کہ جس قدر کم یہ رُکاوٹیں ہوتی ہیں اسی قدر زیادہ معتبر وہ شہادت ہوجاتی ہے۔ یہ شاذ ہی ہوتا ہے، کہ شہادت صرف ایک حادثے، یا ایک فرد کی حدود مشاہدہ کے اندر حادثات کے ایک سرے تک محدود ہو۔ اکثر ہوتا یہ ہے، کہ جن واقعات کے متعلق شہادت دی جاتی ہے، ان کو بہ سبب ترکیب، یا بوجہ وسعت، ایک شخص تن تنہا پوری طرح مشاہدہ کرہی نہیں سکتا۔ ایک مورخ کسی محاصرہ کے چشم دید واقعات بیان کرتا ہے۔ اب اگر ہم صرف اسی ایک شہادت پر بھروسہ کریں، تو ظاہر ہے، کہ یہ تمام بیان بالکل غیر مسلسل اور جزئی ہوگا، کیونکہ اس مورخ کے لئے یہ ناممکن محض ہے، کہ وہ ایک ہی وقت میں ایک حملہ کی جملہ تفاصیل کا مشاہدہ کرے ہوسکتا ہے، کہ اس کے فرائض کی ادائیگی نے اس کو اتنی مہلت ہی نہ دی ہو، کہ وہ ہر جگہ پہرے، اور آنکھوں دیکھی بات بیان کرے۔ اس کے علاوہ بعض باتیں ایسی ہوجاتی ہیں جو اس وقت نظر نہیں آتیں، مثلاً قائدین کی روزانہ مشاورت۔ پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ ہر ایک شخص کسی واقعہ کی اہم باتوں کو معلوم نہیں کرسکتا۔ اسی وجہ سے عینی، یا بلاواسطہ شہادت کو خاص طور پر پرکھنے کی ضرورت ہوتی ہے، اور یہ تحقیق کرنا پڑتا ہے، کہ شاہد کہاں تک اپنے آپ کو ان نقائص سے پاک کہہ سکتا ہے۔

بلاواسطہ شہادت کے معتبر ہونے کی تیسری شرط یہ ہے، کہ جو کچھ مشاہدہ کیا گیا ہے اس کو پوری طرح اور صحت کے ساتھ یاد رکھا گیا ہو۔ غلطی کے اس ذریعے پر ہم اس سے قبل مفصل بحث کرچکے ہیں۔

یہ اس قسم کی دکان ہے، کہ جس سے مشکل ہی سے کوئی شخص بچ سکتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے، کوئی کمر تک، یا اس سے بھی زیادہ، اس میں پھنسا ہوتا ہے، اور کسی کے صرف پاؤں کے تلوے آلودہ ہوتے ہیں، لیکن اس دلدل کے نشانات و اثرات ہر شخص میں پائے جاتے ہیں۔ بفرض محال اگر کوئی شخص ایسا مل بھی جائے، تو اس کی شہادت اس وقت تک قابل یقین نہیں ہوتی، جبکہ وہ اپنے محفوظ مشاہدہ کو معقول اور غیر مبہم علامات کے ذریعے سے ظاہر کرنے پر قادر نہ ہو اور یہ چوتھی شرط ہے۔ ظاہر ہے کہ دوسرے اشخاص اس مشاہدے سے صرف اس صورت میں استفادہ کر سکتے ہیں، کہ ان کو اس کی اطلاع ہو جائے۔ اگر یہ اطلاع مبہم اور مہمل علامات کے ذریعہ سے دی گئی ہے تو اس کا ہونا اور نہ ہونا دونوں برابر ہیں۔ یعنی یہ کہ وہ شخص اس سے استفادہ نہیں کر سکتا، دوسرے الفاظ میں شہادت کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔

لیکن شہادت کے معتبر ہونے کی یہ شرائط پوری ہیں، یا نہیں؟ اس کا جواب ہم بالراست نہیں دے سکتے۔ پہلے کہیں ہم نے کہا ہے، کہ ہم ان کو صرف شاہد کی صفات کی بنا پر نتیجہ کر سکتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے، کہ شہادت کی صحت کا صحیح اندازہ شاہد کی ذاتی سیرت کے ناقابل علم سے ہو سکتا ہے اس کی عقل و اخلاقی صفات، اور اس کے سوانح حیات اس علم کے ماخذ ہوتے ہیں۔ لیکن اگر شاہد کی دیانتداری اور خلوص نیت جرمنی قطعی اور ناقابل شک ہے، تو بلا واسطہ شہادت ہمیشہ بالواسطہ شہادت پر مرجح ہوتی ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے، کہ یہ شہادت صرف اس غرض سے دی جاتی ہے، کہ اس واقعہ کی قطعیت ثابت ہو جائے برخلاف اس کے اگر شاہد کی صداقت و دیانتداری مشکوک فیہ ہو، یا اگر یہ مشتبہ ہو تو بالواسطہ شہادت بلا واسطہ شہادت پر فائق اور اس کے مقابلے میں زیادہ قاطع اور قوی ہوتی ہے اس لئے کہ واقعہ مشہودہ کو ثابت کرنا اس قسم کی شہادت کی غایت نہیں ہوتی، بلکہ اس کا مقصود کچھ

اور ہی ہوا کرتا ہے۔ اس وجہ سے اس واقعہ کی تکذیب کرنا شاہد کی نیت میں نہیں ہوتا۔ اس کے مقابلے میں اگر شاہد کی اہلیت وصداقت دونوں مسلم ہیں، تو ایک شاہد، یا بہت سے شاہدوں کا ہونا بالکل غیراہم ہے، کیونکہ اس حالت میں صرف ایک ہی شاہد کی شہادت کافی وقطعی ہوتی ہے۔ اور اگر یہ دونوں مشکوک ہوں تو جس قدر زیادہ شاہدوں کا اس واقعہ کی حقیقت پر اتفاق ہوگا، اسی قدر زیادہ قابل اعتبار وہ شہادت ہوگی۔

لیکن اس مضمون میں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ جب ایک ہی واقعہ کے متعلق بہت سی شہادتیں ہوں، تو سب کی سب ایک دوسری سے متفق ہوں گی، یا مختلف۔ اگر اس واقعہ پر تمام شاہدوں کا اتفاق ہے، اور شاہدوں میں سے ہر ایک کی صداقت واہلیت ناقابل شک ہے، تو وہ شہادت سب سے زیادہ معتبر ہوتی ہے۔ لیکن اگر تمام شاہد متفق نہ ہوں، بلکہ ان کے آپس میں اختلاف ہو، تو دو صورتیں ممکن ہیں۔ ان کا تخالف سلبی ہوگا، یا ایجابی۔ تخالف سلبی اسوقت ہوتا ہے جب ایک شاہد کسی ایسے واقعہ کے بیان کرنے سے صریحاً پہلوتہی کرے، جس کو اوروں نے صاف الفاظ میں بیان کیا ہے۔ ایک لڑائی کے متعلق بہت سی شہادتیں ہیں۔ ایک شاہد بیان کرتا ہے کہ لڑائی میں بادشاہ مقتول ہوا، لیکن دوسرا شاہد اس کا ذکر تک نہیں کرتا۔ ان دونوں کا یہ تخالف سلبی ہوگا۔ اس کے مقابلے میں ایجابی تخالف اس وقت ہوتا ہے، جب ایک شاہد دوسرے کے بیان کی صریحی تردید کرے مثلاً اوپر کی مثال میں دوسرا شاہد بدلائل وبراہین بادشاہ کے قتل کی تردید کرے۔ جب شہادتوں میں تخالف محض سلبی ہو، تو اس خاموشی کے بہت سے اسباب ہوسکتے ہیں۔ لہٰذا محض اس خاموشی کی بنا پر اس واقعہ کا انکار نہیں ہوسکتا، لیکن جب یہ ثابت ہوجائے، کہ جس شاہد نے اس واقعہ کو بیان نہیں کیا؟ وہ اس کے وقوع پذیر ہونے سے بے خبر نہ تھا، اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوجائے کہ اس کو

نظرانداز کرنے سے فعل انسانی کی ممکن صورتوں سے انکار نہیں کر رہا، تو اس کی شہادت اسی بنا پر بالکل غیر معتبر ہو جاتی ہے۔ اگر یہ تخالف ایجابی ہے، تو اس کی اہمیت بہت زیادہ ہو جاتی ہے۔ کیونکہ ظاہری اور بیّن تناقض محض خاموشی کی بنا پر عدم تصدیق کے مقابلے میں بالعموم اور بنفسہ زیادہ قوی ہوتا ہے۔ اب ایجابی تخالف کی یہ دو صورتیں ممکن ہیں۔ یا تو اس کو رفع کیا جا سکتا ہے، یا یہ بالکل ناقابل رفع ہوتا ہے۔ مقدم الذکر صورت میں شہادت کی قابلیت اعتبار میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ شاہدوں کے تخالف کی توجیہ ان حالات سے کی جا سکتی ہے، جو خود شہادت کو غلط ثابت کئے بغیر تشریح کر سکتے ہیں۔ لیکن مؤخر الذکر حالت میں ہر ایک شہادت دوسری شہادت کو مشتبہ اور غیر معتبر بناتی ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے، کہ اس قسم کی متناقض شہادتوں میں اگر باہمی تناقض ہے، تو یہ دونوں صحیح نہیں ہو سکتیں۔ ان میں سے ایک کا غلط ہونا ضروری ہے۔ اور اگر ان میں تضاد ہے تو ممکن ہے کہ دونوں غلط ہوں۔ جب صورت حالات ایسی ہے، تو سوال متخالف شاہدوں کی کم یا زیادہ قابلیت اعتبار کا رہ جاتا ہے۔ اگر دونوں شاہد مساوی طور پر معتبر ہیں تو دونوں متخالف شہادتوں کا رد کر دینا اولیٰ ہے۔ اگر دونوں کی قابلیت اعتبار مساوی نہ ہو، تو جو شاہد زیادہ قابل اعتبار ہے، اسی کی شہادت بھی زیادہ معتبر سمجھی جائے گی، اور لازماً دوسرے کی غلط۔ جب ایک شاہد معتبر ہو، اور دوسرا بالکل غیر معتبر، تو ظاہر ہے کہ غیر معتبر کی شہادت بالکل بے کار ہے۔

یہاں تک بلاواسطہ شہادت سے بحث تھی۔ یہ یاد ہوگا کہ ہم نے اس شہادت کو بالواسطہ کہا ہے، جس میں وہ واقعہ جس کے متعلق شہادت دی جا رہی ہے۔ خود شاہد کا تجربہ نہ ہو، بلکہ کسی اور شخص کا ہو۔ اس نوع کی شہادت کی قابلیت اعتبار مبنی ہوتی ہے اس بات پر،

کہ بلاواسطہ اور بالواسطہ، دونوں کی شہادت معتبر ہے۔ بلاواسطہ شاہد کے معتبر ہونے کو ہم اپنے آپ معلوم کرسکتے ہیں۔ اس کی دیانت داری اور اہلیت کی بنا پر اس کا پوری طرح اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ اگر ہم کو پوری طرح معلوم ہے، کہ وہ شخص راست باز بھی ہے، اور اس واقعہ کے مشاہدہ کرنے کا اہل بھی ہے تو اس کی شہادت بالکل معتبر کہی جاسکتی ہے لیکن یہ ظاہر ہے کہ یہ واقفیت ہر جگہ اور ہر شاہد کے متعلق میسر نہیں آسکتی۔ ایسی صورت میں ہم اس شہادت کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتے۔ ایسے موقعوں پر بالواسطہ شاہد بلاواسطہ شاہد کے معتبر ہونے کا ضامن ہوتا ہے، کیونکہ بالواسطہ شاہد میں بلاواسطہ شاہد کی قابلیت اعتبار کو جانچنے، اور اسکی اطلاع کو بلاکم وکاست ابلاغ کرنے میں دیانتداری کے معلوم کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے، کہ وہ خود کسی ایسی شہادت کا راوی و ناقل بننا پسند نہیں کرتا، اور نہ کریگا جس کا شاہد کسی حیثیت سے ناقص ہو۔ لیکن جب بالواسطہ اور بلاواسطہ دونوں شاہدوں کی ثقاہت کافی طور سے ثابت ہوچکی ہو، تو قابلیت اعتبار کے لحاظ سے دونوں نوع کی شہادتیں مساوی ہوتی ہیں۔ ہم یہاں تک کہہ سکتے ہیں کہ اگر خود بالواسطہ شاہد بلاواسطہ شاہد کی شہادت کے جانچنے کا اہل ہو، تو اس کی شہادت سے بلاواسطہ شہادت کی تصدیق ہوتی ہے۔ ایک اور صورت یہ ہوسکتی ہے، کہ بلاواسطہ شاہد کی قابلیت اعتبار تو ناقابل انکار ہے، لیکن اس شہادت کا دوسرا راوی یا ناقل معتبر نہیں۔ اس حالت میں بالواسطہ شہادت بلحاظ استناد کے، بلاواسطہ شہادت کے مقابلے میں کمتر ہوتی ہے۔ استناد کی یہ کمتری اسی نسبت سے ہوتی ہے، جو دونوں شاہدوں کی قابلیت اعتبار میں ہو۔

بالواسطہ شاہد بلحاظ زمان کے قریب ہوتے ہیں یا بعید۔ پھر ان میں سے ہر ایک صورت میں وہ یا تو اپنی شہادت کے لئے کسی اور پر موقوف ہوتے ہیں، یا غیر موقوف۔ بالعموم

زمانہ قریبہ کے شاہد زمانہ بعیدہ کے شاہدوں کے مقابلے میں، اور غیر موقوف شاہد موقوف شاہد کی نسبت، زیادہ معتبر ہوتے ہیں۔ زمانہ بعیدہ کے شاہد صرف اس صورت میں قابل اعتبار ہوتے ہیں، جب ان کے اور اصل شاہد کے درمیان میں شاہدوں یا راویوں کا سلسلہ معدوم یا ناقص ہو۔ موقوف شاہد اس وقت ملحاظ استنادکمتر ہوتے ہیں، جب وہ بات، جس پر ان کی شہادت موقوف ہے، غلط، یا وہ ابھی تک ثابت نہ ہوئی ہو۔ بلا واسطہ شاہدوں کی طرح بالواسطہ شہادتیں بھی کبھی مستقیم ہوتی ہیں، اور کبھی غیر مستقیم۔ اسی طرح جب بہت سے بالواسطہ شاہد ہوں تو ان کی شہادت یا تو متفق ہوتی ہے، یا متخالف دونوں صورتوں میں شاہدوں کی قابلیت اعتبار ان ہی اصول پر جانچی جاتی ہے، جبکا ذکر بلا واسطہ شہادت کے ضمن میں ہوا ہے۔

بہت سے بالواسطہ شاہد اگر معصر ہیں، تو ان کی شہادت کو افواہ کہا جاتا ہے، اور اگر یہ ہمعصر نہ ہوں، بلکہ ملحاظ زماں متعاقب ہوں، تو ان کی شہادت کو روایت کہتے ہیں۔ لیکن دونوں صورتوں کے لئے مشترکہ شرط یہ ہے، کہ ان کا کوئی مسلّم بلا واسطہ شاہد نہ ہو۔

اوراق گذشتہ میں شہادت پر مفصل بحث کی ہے۔ لیکن ژرف نگاہ قارئین نے نہایت آسانی سے معلوم کر لیا ہوگا کہ یہ تمام بحث اس شہادت سے متعلق ہے، جس کو زبانی بیان کیا گیا ہو۔ لیکن شہادت دینے کا صرف یہی ایک واحد طریقہ نہیں۔ یہی شہادت بذریعہ تحریر کے بھی ہو سکتی ہے۔ شہادتوں کو جانچنے کے لئے اکثر اصول تو تقریری اور تحریری دونوں قسموں کی شہادتوں میں مشترک ہیں، لیکن تحریری شہادت میں ایسے اصول کی بھی ضرورت پڑتی ہے، جن سے تحریر کا اصلی یا جعلی ہونا معلوم ہو سکے۔ ان پر ہم انشاءاللہ اگلی صحبت میں

افکارِ عالیہ

(جناب پروفیسر مولوی وحیدالدین صاحب سلیم)

پیغام کس کا لائی تھی یارب! نسیم صبح
جو گل چمن میں تھا ہمہ تن چشم و گوش تھا

پَرتو پڑا جو حسن کا چشم خیال پر
عالم تمام اک سبد گل فروش تھا

صبح ازل کی پہلی کرن کا یہ تھا اثر
ہستی کا ذرّہ ذرّہ تبسّم فروش تھا

تاروں کو اس کے تیرے اشاروں نے دی کمک
ورنہ یہ سازِ ہستیِ انساں خموش تھا

پہلو میں ہے ترے وہ جسے ڈھونڈتا ہے تو
منزل میں بیٹھ - پاؤں اگر لنگ ہے ترا

دَر اپنے دل کا کھول کے - دیکھ اُسکی وسعتیں
دُنیا کی اس فضا سے جو دل تنگ ہے ترا

از راہِ طنز کہتے ہیں اہلِ سخن سلیم
دہلی و لکھنؤ سے جدا رنگ ہے ترا

بکس ابھی ہیں چمن میں کلیاں لرز رہے ہیں فلک پہ تارے
کسی نے دیکھا نہ تھا ابھی تک یہیہ جلوہ بے نقاب تیرا
نہ میری کشتی کو چھو سکے گا یہ تیرے قہر و غضب کا طوفاں
کو سمندر کی موج سے تم عبث ہے یہ اضطراب تیرا
بہشتِ دیدار کا پتہ دے اگرچہ دوزخ سے ہو گزرنا
رہے مبارک یہ تجھ کو واعظ! عذاب تیرا ثواب تیرا

میری ہمت کے جو ذرے تھے بکھر کر سمٹے
کیوں نہ ممنون ہوں تری حوصلہ افزائی کا
تتلیاں اڑ گئیں انجام کو پریاں بنکر
شوق فطرت کو ہے ازبسکہ خود آرائی کا
جو خموشی میں مزا پایا ہے ۔ کیونکر ہو بیاں
ناطقہ بند ہے یارب! مری گویائی کا
ساقیٔ حسن سے جلوہ ذرا روک کے دے
کہ چھلکنے کو ہے ساغر مری بینائی کا
زندریزوں[۵] کا جو ہے خون کے قطروں میں ہجوم
اک نمونہ ہے تری انجمن آرائی کا

---

۵ وہ ننھے ننھے کیڑے جو خوردبین کی مدد سے دکھائی دیتے ہیں۔ آنکھ سے نظر نہیں آتے۔

کشتیاں قوم کی قسمت کی اُلٹتی ہیں وہیں
اک تلاطم ہے جہاں عیش کے سامانوں کا
موشگافی ہے نظر میں۔ تو ذرا غور سے دیکھ
ریشۂ نے میں ہے انبوہ نیستانوں کا
میری کشتی گئی گرداب سے بچ بچ کے نکل
دیکھنا ہے ابھی تیور مجھے طوفانوں کا
مل گیا رنگ جو غفلت نے ہے موںھ پر پھیرا
یہی دیباچہ ہے ادبار کے افسانوں کا
بزم گردوں میں ستاروں پہ نظر کر غافل!
کوئی ساقی بھی ہے ان نور کے پیمانوں کا؟
آنچ آئے گی ترے در کے گدا پر نہ کبھی
طنطنہ خاک میں مل جائیگا سلطانوں کا

عشق دل انساں میں ہے جو ربط۔ نہ مجھ سے پوچھو
مشت خس پر ہے یہ اک شعلہ کا لرزاں ہونا
حسن کامل ہو۔ تو ہے آج بھی ممکن غافل!
پارۂ سنگ کا ہے لعل بدخشاں ہونا
بعد مردن جو کھلی آنکھ تو معلوم ہوا
ساری بیداری کا اک خواب پریشاں ہونا

قابلیت ہو تو فطرت کو ذرا بخل نہیں
ایک ریشہ سے بھی ممکن ہے نیستاں ہونا

غفلت کی بے خودی یہ کب تک رہیگی اے دل
سو بار گر چکا ہے۔ اک بار تو سنبھل جا
چہرہ پہ مُردنی سی چھائی رہے گی کب تک
اُٹھ اور زندگی کے سانچے میں اُٹھ کے ڈھل جا
دیکھیں تو زندہ کیوں کر رہتا نہیں تو اے دل
میری سُنے تو ناداں! مرنے ہی پر مچل جا
ایسی حیاتِ شیریں سب کو نہیں میسّر
دُنیا کی تلخیوں کے گھونٹ ایک دم نگل جا

قومی تعصبات

(جناب محمد عزیز الحسن صاحب قریشی۔ حیدرآباد۔ دکن)

چونکہ میں فانی ہستیوں کے اُن گشت لگانے والے فرقوں کا ایک فرد ہوں جو اپنے وقت کا بیشتر حصہ قہوہ خانوں، میخانوں اور عوام کے مقاماتِ ملاقات میں صرف کرتے ہیں اس لئے مجھے مختلف الطبائع اشخاص کو دیکھنے کا موقع ملا ہے جو ایک متأمل مزاج والے انسان کے لئے بہ نسبت قدرتی یا مصنوعی عجائبات کے بہتر اور دلچسپ شغل ہے۔

حال میں اتفاقاً کوئی نصف درجن بھلے آدمیوں سے میری ملاقات ہوئی جو کسی سیاسی مسئلہ کے متعلق پرجوش مباحثہ میں مصروف تھے، جس کے فیصلہ کے لئے انھوں نے مجھ سے استصواب کرنا مناسب خیال کیا اور مجبوراً مجھ کو اُن کی گفتگو میں حصہ لینا پڑا۔ منجملہ دوسرے عنوانات کے ہم نے تذکرۃً یورپ کی متعدد اقوام کے مختلف کیرکٹر پر بھی گفتگو کی۔ ایک صاحب اپنی ٹوپی سیدھی کر کے اور علوِ شان کا ایسا انداز اختیار کر کے کہ گویا دولت برطانیہ کی تمام خوبیاں انھی کی ہستی میں موجود تھیں، فرمانے لگے کہ ڈچ طامع اور حریص ہیں۔ فرانسیسی خوشامدی اور ریاکار ہیں۔ جرمن شراب خوار اور بے غیرت پیٹو، اور ہسپانوی شیخی باز اور ظالم ہیں لیکن شجاعت، فیاضی، عدل و انصاف اور ہر عمدہ خصلت میں انگریز تمام دنیا پر سبقت لے گئے ہیں۔

اس عالمانہ اور قابلِ قدر قول کو تمام حاضرین نے تبسم کے ساتھ تسلیم کیا۔ تمام نے

مراد ہے اجملہ حاضرین سے، سوائے اس ادنیٰ خادم کے، جو حتی الامکان اپنی متانت کو قایم رکھنے کی کوشش کر رہا تھا اور سر کو ہاتھ کا سہارا دیکر مصنوعی تفکر و تامل کی حالت میں اسطرح بیٹھا ہوا تھا کہ گویا کسی دوسری چیز پر غور کر رہا ہے اور گفتگو کے مبحث کی طرف متوجہ نہیں ہے۔ اس حرکت سے امید تھی کہ میں اپنے خیالات کو ظاہر کرنے کی ناخوشگوار ضرورت سے بچ جاؤں گا اور ان کو ان کی خیالی مسرت سے محروم نہ کرسکونگا لیکن نقلی وطن پرست کا ارادہ نہ تھا کہ مجھے چھوڑ دیں۔ اور اس امر سے مطمئن نہ ہوکر کہ ان کی رائے بغیر مخالفت کے تسلیم کرلی جائے ان کا مصمم ارادہ تھا کہ ہر شخص اپنی رضامندی اور تصدیق سے ان کی رائے کو مستحکم کردے چنانچہ انہوں نے نہایت وثوق کے ساتھ مجکو مخاطب کرکے، دریافت کیا "کیوں صاحب! آپ بھی تو فرمائیں کیا میں غلط کہتا ہوں؟"

چونکہ میں اظہار رائے میں کبھی سبقت نہیں کرتا (خصوصاً جبکہ مجھے یقین ہوتا ہے کہ وہ خوش گوار نہیں ہوگی) اس لئے اگر مجھ کو مجبوراً اظہار رائے کی ضرورت ہوتی تو ہمیشہ یہ اصول پیش نظر رکھتا ہوں کہ ہمیشہ اپنے اصلی احساسات اور سچے جذبات کا انکشاف کروں۔ اسلئے میں نے ان سے عرض کیا کہ میں قطعی انداز میں گفتگو کرنے کی ہرگز جرأت نہ کرتا اگر میں نے تمام یورپ کا سفر اور بہت غور و احتیاط سے مختلف اقوام کے اخلاق و عادات کا امتحان نہ کیا ہوتا۔ اور غالباً ایک منصف مزاج بیج اس امر کو بیان کرنے میں پس و پیش نہیں کریگا کہ بہ نسبت انگریزوں کے۔ ڈچ کفایت شعار اور محنتی، فرانسیسی خلیق اور اعتدال پسند، جرمن جفاکش اور محنت و مشقت کے عادی اور ہسپانوی سنجیدہ اور متین ہیں۔ انگریز بلاشک و شبہ بہادر اور فیاض ہیں مگر جلد باز، سرکش اور تندمزاج بھی ہیں، وہ خوشحالی سے بہت جلد باغ باغ اور مصیبت کے وقت فوراً مایوس اور ناامید

ہو جاتے ہیں۔

اپنی گفتگو کے اختتام سے قبل میں نے بآسانی محسوس کر لیا کہ پوری جماعت مجھ کو مشتبہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ میں اپنا جواب ختم بھی نہ کرنے پایا تھا کہ محب وطن صاحب نے حقارت آمیز انداز سے فرمایا "تعجب ہے کہ لوگوں کا ضمیر ان کو کس طرح اجازت دیتا ہے کہ وہ اس سرزمین پر زندگی بسر کریں جس سے ان کو محبت نہیں اور اس گورنمنٹ کی حفاظت اور امن سے بہرہ اندوز ہوں جس کے باطن میں وہ دشمن ہیں" یہ دیکھ کر کہ اپنے جذبات اور خیالات کے اس سچے انکشاف سے میں نے اپنے ساتھیوں کی عمدہ رائے کو جو میرے متعلق تھی خلاف کر دیا تھا اور ان کو اپنے سیاسی اصولوں پر نکتہ چینی کرنے کا موقع دیا تھا اور اس امر کو بخوبی جان کر کہ ایسے شخصوں سے بحث کرنی لاحاصل ہے جو بر خود غلط ہوں میں رخصت ہو کر اپنے مکان واپس آ گیا اور قومی تعصب اور طرفداری کی لغو اور مضحکہ خیز حقیقت پر بہت دیر تک غور کرتا رہا۔ سلف کے مشہور بیانات میں اس فیلسوف کے بیان سے بہتر کوئی بیان نہیں ہے جس نے اپنے آپ کو دنیا کا رہنے والا بتایا تھا۔

یہ چھوٹا سا جملہ اس فیلسوف کی بلند نظری کو ظاہر کرتا ہے اور پڑھنے والے کو عزت بخشتا ہے۔ زمانۂ حال میں بہت کم لوگ ہیں جو اس مقولہ کو اپنا دستور العمل اور اپنی طرز زندگی کو اس کے مطابق بنائیں۔

اب ہم اسقدر ڈچ، ہسپانوی، فرانسیسی، انگریز یا جرمن بن گئے ہیں کہ ہم اب دنیا کے باشندے نہیں رہے۔ ہم کسی ایک ملک سے اس درجہ وابستہ ہو گئے ہیں یا ایک محدود سوسائٹی کا ایسا جزو بن گئے ہیں کہ اب خود کو اس دنیا کا باشندہ نہیں سمجھتے اور نہ اس عظیم الشان سوسائٹی کا ممبر سمجھتے ہیں جو تمام بنی نوع انسان پر مشتمل ہے۔

اگر یہ تعصبات ادنیٰ طبقہ کے لوگوں میں ہوتے تو شاید قابل معافی ہوتے کیونکہ ان کا مطالعہ یا سفر سے اصلاح خیالات اور اجنبیوں سے گفتگو کرنے کا بہت کم موقع ملتا ہے لیکن مصیبت تو یہ ہے کہ تعلیم یافتہ لوگوں کے قلوب بھی اس زہر سے آلودہ اور ان کے کیرکٹر بھی متاثر ہیں۔ ایک شخص خواہ پیدائشی طور سے کتنا ہی معزز ہو، اس کا رتبہ کتنا ہی بڑا ہو، اس کی دولت کتنی ہی وافر ہو تاہم اگر وہ قومی اور دوسرے تعصبات سے پاک نہ ہو تو میں اس سے بالمشافہ یہ کہنے کے لئے تیار ہوں کہ وہ اپنے پہلو میں ایک ادنیٰ اور نحیف دل رکھتا ہے، اور اس کا کیرکٹر ہرگز مستحق نہیں ہے کہ اسکو "بھلا آدمی" کہا جائے اور حقیقتاً آپ ہمیشہ اس بات کو دیکھیں گے کہ وہ لوگ جن میں خود کسی قسم کی قابلیت نہیں ہوتی ہر وقت اپنے قومی اوصاف پر فخر کرتے ہیں کیونکہ ان کے لئے سوائے اس کے اور کوئی چارہ کار نہیں ہوتا ہے۔

نحیف اور کمزور انگور کی بیل محض اس وجہ سے طاقتور بلوط کے درخت سے لپٹ جاتی ہے کہ زمین پر گرنے سے محفوظ رہے۔ کیونکہ اس میں خود اتنی قوت نہیں ہوتی کہ خود کو سنبھال سکے۔ اگر قومی طرفداری کی حمایت میں یہ بیان کیا جائے کہ وہ ہماری وطنی محبت کی فطرتی اور لازمی بالیدگی ہے اور اول الذکر بغیر آخر الذکر کو نقصان پہنچائے ہوئے نیست و نابود نہیں کی جا سکتی ہے تو میرا جواب یہ ہے کہ یہ محض لغو ڈھکوسلا اور مغالطہ ہے۔ میں یہ تسلیم کرلوں گا کہ قومی تعصب ہماری وطنی محبت کی نشوونما ہے لیکن یہ کہ اس کی نشوونما فطرتاً اور یقیناً ہونی چاہئے مجھے تسلیم نہیں ہے۔ جوش عقیدت اور انتہائی ذوق شوق مذہب کی ترقی کا باعث ہیں۔ لیکن کیا کبھی کسی کے دماغ میں اس امر کی تصدیق کا خیال آیا کہ جوش و سرگرمی اور انتہائی ذوق و شوق مذہب جیسے اعلیٰ جذبہ کا ماحصل

ہے؟ اگر آپ چاہیں تو ان کو اس بہشتی پودے کی قلمی کونپلیں کہہ سکتے ہیں لیکن یہ اس کی قدرتی اور اصلی شاخیں نہیں ہیں اور بغیر درخت کے تنے کو کسی قسم کا نقصان پہنچائے بآسانی تراش دی جا سکتی ہیں۔ نہیں۔ جب تک یہ نہ کاٹی جائیں گی سرسبز درخت کبھی بارآور اور مضبوط نہیں ہوگا۔

کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ میں بغیر دوسرے ملک کے باشندوں سے نفرت کئے ہوئے اپنے وطن سے محبت کر سکوں؟ اور کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ میں بقیہ دنیا کو بزدل اور ذلیل سمجھے ہوئے بغیر اپنے ملک کے قوانین اور آزادی کی حفاظت کرنے میں انتہائے شجاعت، جرأت اور استقلال کو عمل میں لاؤں۔

یقیناً یہ ممکن ہے! اگر ایسا نہ ہوتا تو یقین ہے کہ میں اُس قدیم فیلسوف کے مقولہ کو پسند کرتا۔ یعنی دنیا کے باشندہ کو انگریز، فرانسیسی، یورپین یا کسی اور خطاب پر ترجیح دیتا۔ (ترجمہ)

عہد مغل میں گجرات کی حالت

ڈچ مورخ کے قلم سے

(از حسن عابد صاحب جعفری۔ بیرسٹر ایٹ لا۔ ایڈیٹر شمع)

خوش قسمتی سے مجھے آگرہ کے متعلق پیلسرٹ[۵۱] کی رپورٹ مل گئی۔ میں نے اسکا ترجمہ کرکے حال میں شائع کیا ہے۔ گجرات کے متعلق جو رپورٹ ہے اس کے مطالعہ سے کچھ تو اس کی ضخامت کیوجہ سے اور کچھ مذہبی بحث و مباحثوں کے باعث بہت الجھن ہوتی ہے کیونکہ وہ ایسی زبان میں لکھے گئے ہیں کہ آج کل اس کا سمجھنا دشوار ہے۔ آگرہ کے حالات لکھنے میں اس نے گجرات کی رپورٹ سے ان مقامات پر مدد لی ہے جہاں گجرات کا ذکر ہے مؤلف نے ذاتی واقفیت کی بنا پر تمام حالات کو زور کیا تھا لکھا ہے اور زبان بھی صاف ہے۔

گجرات کی رپورٹ سنہ ۱۶۲۹ء میں مکمل ہوئی۔ الفاظ اور فقروں کی یگانگت سے واضح ہوتا ہے کہ جے ڈی لیٹ[۵۲] "مغل سلطنت کے حالات" کا مصنف بھی اپنی کتاب کو سنہ ۱۶۳۱ء میں شائع کرنے سے قبل اس سے مستفید ہو چکا تھا۔ اور جے وان ٹوئسٹ[۵۳] مصنف "ہندوستان کے عام حالات" بھی اس کا خوشہ چین ہے۔

ظاہر ہے کہ ہالینڈ میں یہ رپورٹ شائع نہیں ہوئی نہ ڈچ کمپنی کے سرکاری کاغذوں میں

---

۵۱ Pelsaert

۵۲ J. de Laet

۵۳ J. van Twist

اس کا حوالہ ہے اور نہ کوئی نقل موجود ہے۔ جو نسخہ ہمارے سامنے ہے اس پر جابجا حاشیوں کا اضافہ ہے یہ نسخہ والین براندبے جیلنیس[1] ڈوجونگھ کے پاس تھا۔ اس شخص نے بہت عرصہ تک مشرق میں قیام کرکے تجارتی دستاویزیں جمع کی تھیں اور الکمار میں سکونت پذیر ہو کر وہاں کے گرجہ میں اس نے اس نسخہ کو محفوظ کر دیا تھا۔ سنہ ۱۶۱۲ء تک وہیں رہکر ہیگ کے سرکاری کاغذات کے دفتر میں منتقل کر دیا گیا۔ اس کا نمبر ۲۸ ہے اور ذیل کا ترجمہ اصل رپورٹ کا عکس لیکر کیا گیا ہے۔ اصل نسخہ پر کسی کے دستخط نہیں ہیں اور براہ راست مصنف کے نام کا بھی پتہ نہیں چلتا ہے۔

ڈاکٹر ھلو نے فہرست کو مرتب کیا ہے ان کا خیال ہے کہ خود جیلنیس اس کا مصنف ہے یا کم از کم اس وقت تک اس کو مصنف تسلیم کر لینا چاہیئے جب تک کہ کوئی دوسرا مصنف مدمقابل ہو کر اپنے دعوی میں ثبوت پیش نکرے۔ یہ نسخہ قلمی ہے اور جیلنیس کے ہاتھ کی اصلاحوں سے مزین ہے۔ بعض اصلاحیں اس قدر خفیف اور معمولی ہیں کہ سوائے اس مصنف کے جس کو اپنی تصنیف پر ناز ہو کوئی دوسرا اس درجہ زحمت گوارا نہ کرتا۔ اس کے علاوہ جو تجربات درج ہیں وہ جیلنیس کے عہد ملازمت سے مطابق ہیں اور بہ ظاہر کوئی دوسرا ڈچ افسر ایسا نہ تھا جس کو یہ تجربات حاصل ہوتے۔

جیلنیس کے حالات زندگی ڈاکٹر ھلو کی فہرست کے دیباچہ سے اخذ کئے گئے ہیں اس کا سنہ پیدائش ۱۵۹۴ء ہے۔ لڑکپن میں وہ ڈچ کمپنی میں ملازم ہو گیا۔ اور سنہ ۱۶۱۵ء سے ۱۶۲۱ء تک انبائنس کے جزایر میں رہکر سنہ ۱۶۲۲ء میں وطن واپس آیا۔ دوسرے سال سورت میں وارد ہوا اور پہلے برھان پور اور پھر گجرات میں افسر اعلیٰ کی خدمات انجام دیتا رہا۔ سنہ ۱۶۳۲ء

[1] J. Van Daniel

میں دوبارہ وطن کو چلا گیا سنہ ۱۶۲۴ میں بٹیویا اور بورنیو میں۔

اور سنہ ۱۶۲۷ء سے سنہ ۱۶۳۰ء تک آگرہ میں مقیم رہا سنہ ۱۶۴۱ء سے سنہ ۱۶۴۳ء تک ساوہ ایران میں ڈچ ایجنسی کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے مقیم رہا۔

سنہ ۱۶۴۴ء میں گوا کے خلاف ڈچ بیڑے کا امیر البحر تھا۔ اور سنہ ۱۶۴۵ میں بٹیویا کی کونسل کے غیر معمولی رکن کے عہدے سے وہ سبکدوش ہو کر سنہ ۱۶۴۸ میں ہالینڈ پہونچا۔ کمپنی نے ملازمت کے صلہ میں اُس کو انعام دیا۔ اپنے آبائی قصبہ الکمار میں سکونت پذیر ہو کر اُس نے مختلف مقامی اور قومی خدمات انجام دیں۔ اور اپنی وفات سنہ ۱۶۷۴ء تک وہیں رہا۔

مشرق میں اُس کا دور ملازمت اگرچہ شاندار نہیں ہے لیکن قابل تعریف ضرور ہے یہ شخص انگریزی میں دی بران کے نام سے مشہور ہے۔

اس موقع پر مصنف سے بحث نہیں ہے۔ البتہ اس قدر ماننا پڑتا ہے کہ گجرات رپورٹ کا مصنف تربیت یافتہ۔ جفاکش اور ایماندار آدمی تھا۔ اور اُسے مذہب کا گہرا رنگ تھا۔ وہ واقعات اور تاریخوں کا حریص تھا البتہ ذہانت اور وسیع الخیالی اس میں نہ تھی۔

ترتیب رپورٹ کا یہ حال ہے کہ ابتدا میں تو وہ اُن باتوں کا ذکر کرتا ہے جن کا اُس کو ذاتی علم ہے اور جو باتیں اُس کے ذاتی علم کے دائرہ سے باہر ہیں اُن کی تصدیق تجارت پیشہ ساتھیوں یعنی جین۔ پارسی اور اہل ہنود سے کر لیتا ہے۔ بظاہر اس کے تعلقات ان لوگوں سے اچھے تھے۔

طرز عبارت آرائی بہت بُرا ہے۔ عبارت مُغلق ہے اور جملے باہم دگر اس طرح گتھے ہوئے ہیں کہ مبتدا اور خبر کے درمیان متعدد واقعات بیان کئے جاتے ہیں۔ جس کا ظاہر اثر یہ ہے کہ مطالعہ خوشگوار نہیں رہتا ہے۔

ذیل میں اقتباسات دیئے جاتے ہیں اور مصنف کا سلسلہ قایم رکھا جاتا ہے۔ چھ ابواب کی سُرخیاں بہت طولانی ہیں مگر مختصراً یہ ہیں :-

(۱) بروچ

(۲) بردوا

(۳) کیمبے

(۴) احمد آباد

(۵) طور و طریق اور رسومات

(۶) پارسی

پہلا باب

فی زمانہ بروچ مغل اعظم کے قبضہ میں ہے اور ایک بڑے امیر کو مع مالگزاری اُسکی وجہ مدد معاش ونیز ۱۵۰۰ سواروں کے اخراجات کی مدمیں دے دیا گیا ہے۔ اس کے معاوضہ میں اُس امیر جس کا نام ناہر خاں ہے فرض ہے کہ مقرر سواروں کے علاوہ اتنے ہی پیادہ اور ہاتھی وغیرہ رکھے کہ وقت ضرورت بادشاہ کے کام آسکیں۔

قصبات پر جو بروچ کی حدود سے ملحق ہیں اُس کے سوار اور پیادے بادشاہ کی طرف سے قابض ہیں اسی طرح دیگر مقامات بھی بادشاہ اپنی مرضی کے مطابق امرا و فوجی افسران کو عطا کرتا رہتا ہے ان میں سے بعض ہر سال اور بعض ہر ششماہی اور کبھی کبھی دو دو تین برس کے بعد بادشاہ اور اس کے امرا کی رائے سے تبدیل ہوتے

رہتے ہیں۔ اور کوئی اندر نہیں کہہ سکتا ہے کہ آیندہ اس کو کون سا مقام دیا جائے گا جو لوگ آج
بڑی جگہ کے مالک ہیں ممکن ہے کہ کل وہاں سے ہٹا دیئے جائیں اور وہ زمین بادشاہ
کو واپس کرنی پڑے۔ اور دوسری جگہ جا کر رہنا میسر ہو۔ اگر وہ بادشاہ کے حضور میں
خود حاضر نہیں ہو سکتے ہیں۔ تو ان کو اپنے احباب پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے کہ وہ ان کیطرف
سے بادشاہ کو خوش رکھیں ایسی صورت میں اس کے پاس بادشاہ کا خط پہنچتا ہے
اور جس جگہ کو بادشاہ چاہے وہاں کا اس کو گورنر مقرر کر دیا جاتا ہے اسی پر اسکو قناعت
کرنی پڑتی ہے اسی وجہ سے روپیہ اور مال دیکر اپنی جان بچالیں میں کہتا ہوں کہ مغل بادشاہوں
کے ملازموں کو کہیں رہنے کا اعتبار نہیں۔ اور اس سے بھی کم ان کو اپنی زندگی کا اعتبار ہے
کیونکہ ہر کوئی ان کے خلاف جھوٹا استغاثہ محض معمولی بات پر دائر کر سکتا ہے اور اگر انکے
پاس کافی روپیہ ہوا تو وہ بڑے خوش نصیب ہیں۔ کیونکہ واقعہ یہ ہے کہ خواہ ملزم سچا
ہو یا جھوٹا لیکن اگر اس کے پاس کافی روپیہ ہے تو عموماً بڑے بڑے
مسلمان بحث و مباحثہ کے روادار نہیں ہوتے ہیں۔ کیونکہ ان کا مقولہ ہے کہ
پہلے مارو اور بعد کو وجہ دریافت کرو۔ چنانچہ اگر کہیں ارتکاب جرم
یا فساد ہو جائے تو جو شخص زبردست ہے اور حاکم کے پاس پہلے فریاد
پہونچا سکتا ہے اسی کی پہلے شنوائی ہو گی حالانکہ وہ بھی سخت قابل الزام
کیوں نہ ہو۔ مغل اعظم کی سلطنت میں یہی رواج ہے اور یہی وہاں کا
دستور ہے جس کی پابندی ہر اصول سے زیادہ کی جاتی ہے۔
یعنی جو شخص پہلے شکایت لیجائے اسی کے حقوق زیادہ قابل لحاظ
مانے جاتے ہیں۔ چور اور بدمعاش جتھے بنا کر لوٹ مار اور ایذا رسانی کی وارداتیں

کرتے ہیں۔ اور بعض اوقات مسافروں کو شاہراہوں پر مار ڈالتے ہیں۔ ان کی روک تھام فوج کے سپرد ہے۔ چور اور بدمعاش بروتچ سے عموماً دس بیس کوس دو پہاڑیوں پر رہتے ہیں اور وہاں کے رہنے والے راجاؤں اور اُن کے سرداروں کی حمایت میں ہونے کے باعث آسانی سے ہاتھ نہیں آتے ہیں اور چونکہ پہاڑوں کے راستہ سے واقف ہوتے ہیں ایک جگہ سے بآسانی دوسری جگہ پوشیدہ ہو جاتے ہیں ان میں سے بعض راجاؤں اور سرداروں کے پاس تین تین اور چار چار ہزار سوار و پیدل ہوتے ہیں اور عام خیال ہے کہ وہ مغلوں سے بہتر سپاہی ہیں اُن میں رحم اور سمجھ نام کو نہیں ہے۔ جب کسی سے اتفاقیہ دوچار ہو جاتے ہیں تو برہنہ کر کے چھوڑتے ہیں اور اگر زر فدیہ کی توقع ہوتی ہے تو اُس کو قید کر لاتے ہیں۔ ان قزاقوں اور دیگر چوروں کی وجہ سے مُسافروں کو ہتیار لیکر سفر کرنا ضروری ہے ورنہ ہر قسم کے جھگڑوں میں ہتیار کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔

بھروتچ اور ہندوستان کے دیگر اضلاع میں معمولی جرائم کے مقدمات کا فیصلہ کوتوال کرتا ہے۔ سنگین مقدمات کو پُرانے پُرانے باشندے اور صوبہ دار اور قاضی مل کر فیصل کرتے ہیں۔ قاضی شہر کو بادشاہ مقرر کرتا ہے۔ صوبہ دار چاہے تو انفصال مقدمہ کی غرض سے عمائدین شہر کو بھی مشورہ میں شریک کرلے۔

صوبہ دار کے اختیارات سب سے زیادہ ہوتے ہیں۔ اور فیصلہ کا انحصار اُس کی رائے اور الفاظ پر ہوا کرتا ہے۔ دیگر اشخاص کی حیثیت صلاح کاروں کی ہوا کرتی ہے اور وہ اُس کی رائے میں دخل نہیں دے سکتے ہیں۔ یہاں اور دیگر مقامات میں بھی یہ قاعدہ ہے کہ سنگین جرایم کی پاداش میں بہت کم سزائے موت دیجاتی ہے عموماً مجرم جرمانہ ادا کرکے رہائی پاجاتے ہیں۔ جرمانہ کی وجہ یہ ہے کہ اسی ذیل میں جو روپیہ

وصول ہوتا ہے وہ صوبہ دار کا حق ہوتا ہے اور اس طرح اس کی سالانہ آمدنی میں اضافہ ہو کر اس کے ضیافتوں اور مہمان نوازیوں کے کام میں آتا ہے۔ سخت سزاؤں کے بجائے جرمانہ کی بدعت نے قانون شکنی میں ترقی کر دی ہے اور مسافروں کو سفر میں سخت صدمات پہونچتے ہیں۔

بادشاہ نے ایک اپنے امیر ناہر خاں کو مدد معاش کے سلسلہ میں بڑودہ تفویض کر رکھا ہے۔ خان مذکور بادشاہ کی جانب سے قابض ہے اور اس کے تحفظ کے لئے اس کو پندرہ سو سوار اور ایک ہزار پیادہ رکھنے پڑتے ہیں اور جس وقت بادشاہ طلب کرے اُن کو حاضر ہونا پڑتا ہے۔ اسی امیر کو بادشاہ نے بھروتح بھی دے رکھا ہے۔ وہی یہاں کی مالگذاری وصول کرتا ہے۔ اس شہر کو قزاقوں کے حملہ سے محفوظ رکھتا ہے اور دیہاتوں کے میوہ جات اور وہاں کے محاصل کو خود اپنے استعمال میں لاتا ہے۔ یہ افسر گجرات کا رہنے والا ہے۔ پہلے ہندو یا راجپوت تھا اب مسلمان ہو گیا ہے۔ اس کی جانب سے ایک افسر مسمی پیر خاں کے سپرد بڑودہ کا انتظام ہے۔ شہر میں ایک قلعہ ہے جس میں کم و بیش چھ سو سوار اور چھ سو پیادہ رہتے ہیں۔ اس شہر میں چھوٹے بڑے دیہاتوں کی تعداد ۲۱۰ ہے اور بیس پچیس کوس کے اندر واقع ہیں۔ پیر خاں ۱۸۵ دیہاتوں کا انتظام کرتا ہے۔ بقیہ ۲۵ دیہات دیگر افسروں و امراء کو بطور مدد معاش دئیے گئے ہیں۔ اس طرح پر ناہر خاں صرف شہر اور ۱۸۵ دیہاتوں پر قابض ہے بقیہ دیہات علیحدہ ہیں۔

احمد آباد کے باشندے جبریہ روپیہ دینے اور ٹیکس ادا کرنے کی مصیبت سے بچے ہوئے ہیں۔ مال کی برآمد و درآمد پر صوبہ دار یا کوتوال کو برائے نام اس وقت

کچھ دیا جاتا ہے جب کہ گاڑیاں بھری جاتی ہیں۔ یہاں پر ترک۔ عرب۔ ایرانی۔ پرتگالی اور دیگر ممالک کے سوداگر آباد ہیں۔ ڈچ اور انگریز سوداگر بھی سال بھر میں اچھی خاصی تجارت کر لیتے ہیں۔ غرض کہ مال خوب بکتا ہے۔ اور ہر شخص کاریگر اور سوداگر اس شہر میں قیام کرنا چاہتا ہے کیونکہ ٹیکس چنگی اور جبریہ روپیہ یہاں بہت کم لیا جاتا ہے۔ ہر سوداگر اور کاریگر کو اجازت ہے کہ وہ یہاں آباد ہو اور اپنے ہنر اور پیشہ کو جاری کرے۔ صرف سوداگروں کے خلاف یہ قید ہے کہ وہ شورہ اور باروت کی تجارت بغیر حاکم کی اجازت کے نہیں کر سکتے ہیں اور اجازت نامہ کی مقررہ مقدار سے زائد اپنے پاس نہیں رکھ سکتے ہیں۔

ضلع کا انتظام حاکم (گورنر) قاضی (جس کو بادشاہ خود مقرر کرتا ہے تاکہ وہ ضروری معاملات کو فیصل کرے اور شریعت کے مطابق فیصلے دے) اور کوتوال کے سپرد ہے۔ ان کے علاوہ اور بھی چھوٹے چھوٹے عملے ہیں جو ان تینوں کے علم میں روزمرہ کی وارداتوں کے معمولی مقدمات فیصل کرتے رہتے ہیں۔ دو تین فوجدار اور ان کے نائب بھی ہیں جو ضلع کے باشندگان میں سے مقرر کئے جاتے ہیں ان کا تقرر بادشاہ کی جانب سے ہے۔ اور ان کا کام یہ ہے کہ کل گجرات کے ہر حصہ میں سپاہیوں کو فوجی تعلیم دیں۔ انتظامی معاملات سے ان کو کچھ سروکار نہیں۔ پرتگالی۔ ڈچ اور انگریز سوداگروں کے لئے ضروری ہے کہ وہ فوجداروں کے سفارشی خطوط لیکر سفر کریں ورنہ راستہ میں جو افواج تعینات ہوتی ہیں ان سے تکلیف پہنچنے کا اندیشہ رہتا ہے۔ ان کے حاکم کے خطوط کے بغیر محافظوں کا ٹیکس یا چوکی کا ٹیکس ادا کرنا لازمی ہو جاتا ہے۔ ان خطوط کے ذریعہ سے سوداگر بغیر کچھ ادا کئے ہوئے باسانی گذر جاتے ہیں۔ یہ خطوط پروانہ راہداری کہلاتے ہیں۔ مگر پھر بھی ضلع کے افسر اعلیٰ کو کچھ نذر کئے اور بہت سی خوشامد کئے بغیر چارہ کار نہیں اور نہی

یہاں کا رواج ہے۔

فوجداری کے مقدمات کو مندرجہ بالا تین اشخاص مع دو تین یا چار مقامی دیہوں کے جن کو مقدم کہتے ہیں فیصل کرتے ہیں مگر یہ اعضا معطل ہوتے ہیں۔ کارروائی مقدمہ میں ان کو کوئی دخل نہیں ہوتا ہے اور نہ کوئی ان کی بات پوچھتا ہے۔ زیادہ تر یہ لوگ مترجم کا کام دیتے ہیں۔ فیصلہ حاکم کی رائے پر منحصر ہوتا ہے اور ان کو اس کی ہاں میں ہاں ملانی پڑتی ہے بالفاظ دیگر یہ لوگ محض نمائش کے لئے ہیں کسی کام کے لئے نہیں ہیں۔

اصلی طاقت حاکم ہے۔ اور اگر کوئی شخص اس سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے یا سزا سے بچنا چاہتا ہے تو اس کو چاہیے کہ تحفہ جات کے ذریعہ سے اس کو اور قاضی و کوتوال کو راضی کرے۔

اس کے بعد دو تین دوستوں کی ضرورت ہوتی ہے کل معاملہ حسب خواہش طے ہو جاتا ہے۔ اور خواہ تم نے اپنے مخالف کو کیسا ہی نقصان کیوں نہ پہونچایا ہو تمہارا بال بیکا نہیں ہو سکتا ہے۔ کیونکہ ہندوستانی مثل ہے کہ پہلے مارے پیچھے سن۔ کہا جاتا ہے کہ جو شخص پہلے شکایت کرتا ہے وہ یقینی سچا ہے۔ کیونکہ وہی ہمارے پاس پہلے آیا ہے۔ اگر فریق مخالف سچا ہوتا تو وہ ہمارے پاس پہلے آتا۔

کل ہندوستان اور گجرات میں یہی طریق انصاف ہے۔ مالدار کی حمایت کی جاتی ہے اور غریب کو دبایا جاتا ہے۔

قتل۔ غارتگری اور چوری کی علت میں یہاں اور دیگر مقامات پر جسمانی سزائیں مقرر ہیں۔ فریب۔ زنا اور اسی قسم کے دیگر جرائم کی سزا جرمانہ ہے۔ لیکن قتل۔ غارت گری اور چوری کے

جرایم میں عموماً مالی سزائیں دی جاتی ہیں اور اس طرح پر مجرم جسمانی سزاؤں سے بچ جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو روپیہ وصول ہوتا ہے وہ حاکم خود لے لیتا ہے اور اُس میں کسی دوسرے کو شریک نہیں کرتا ہے۔ اگر مجرموں کو جسمانی سزائیں دی جائیں تو حاکم کے خزانہ میں روپیہ کہاں سے آئے؟ سزاؤں کے معاملہ میں حاکموں کو قطعی اور کلّی اختیارات ہیں۔ زمانہ حکومت۔ ایک۔ دو یا تین سال ہوتا ہے چنانچہ وہ کوشش کرتے ہیں کہ جس طرح ممکن ہو اس عرصہ میں روپیہ خوب پیدا کریں۔

احمد آباد اور مضافات کا حاکم ناہر خاں ہے جو بادشاہ کا مشہور سالار ہے اُس کے پاس ۱۵۰۰۰ سوار ہیں جو بادشاہ کی امداد کے لئے احمد آباد اور مضافات کی آمدنی سے ہر وقت تیار رکھنے پڑتے ہیں۔

احمد آباد کی سالانہ آمدنی ۲۲ ٹن سونا ہوتی ہے (یعنی تقریباً ۲۰½ کروڑ دام) پہلے سالانہ آمدنی اس سے بھی زیادہ تھی لیکن سختیوں اور مظالم سے تنگ آکر بہت لوگ بھاگ گئے جس کی وجہ سے بہت زمین افتادہ پڑی ہوئی ہے اور آمدنی میں بھی تخفیف ہو گئی ہے۔

احمد آباد کے علاقہ میں ۲۵ قصبے اور ۲۰۸۰ گاؤں ہیں یہ گاؤں اپنی مالگذاری ۲۵ قصبوں کو ادا کرتے ہیں۔ اور اپنی زراعت کا حساب ان کو دیتے ہیں۔ اور یہ ۲۵ قصبے اپنی کل کاشت کا حساب حاکم کو دیتے ہیں۔ ¾ یافت جاگیردار کا حصہ ہے اور بقیہ ¼ کاشتکار کے پاس رہ جاتی ہے۔ جس پر اُس کی زندگی کا دارومدار ہے۔ ظاہر ہے کہ غریب کاشتکار کا بہ مشکل پیٹ بھرتا ہے۔

کاشتکاروں کو اراضی دینے کا طریقہ حسب ذیل ہے۔

کاشتکار گاؤں کے "مقدم" کے پاس جا کر زمین لینے کی خواہش کا اظہار کرتا ہے اور بتا دیتا ہے کہ اُس کو کسقدر اور کس موقع کی زمین کی ضرورت ہے۔ یہ درخواست عام طور پر قبول

کرلی جاتی ہے اور انکار کا کبھی موقع نہیں آتا کیونکہ ۱/۱۰ حصہ سے بھی کم زمین مزروعہ ہے۔ اسی سبب سے ہر شخص کو اپنی خواہش اور ضرورت کے مطابق زمین مل جاتی ہے۔ اور اس شرط پر کہ اپنے زمیندار کو لگان ادا کرتا رہے۔ وہ اچھی طرح کاشتکاری کرسکتا ہے۔ اگر خود مقدم یا اُسکے متعینہ آدمیوں نے کاشت کی ہے تو فصل تیار ہونے پر اس کی پیمایش کی جاتی ہے اور جب فصل کٹ چکتی ہے تو ۳/۴ حصہ فصل کا زمیندار کو اور ۱/۴ حصہ کسان یا کاشتکار کو ملتا ہے جو اسکی ضروریات سے کچھ ہی زیادہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کاشتکاروں میں بہت کم لوگ فارغ البال نظر آتے ہیں۔ اور قبل اس کے کہ وہ پس انداز کریں ان کے حصہ کا غلہ خرچ ہو جاتا ہے۔

روپیہ کا تبادلہ سوداگر اور اُن کے منیب کرتے ہیں کیونکہ راہیں خطرناک ہیں اور سوداگروں کو مختلف مقامات پر روپیہ کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ راستوں کے عدم تحفظ کی خاص وجہ یہ ہے کہ بنیے اور دیگر اہل ہنود سامان تجارت کے ہمراہ مسلح آدمیوں کو نہیں بھیجتے ہیں قزاق اُن کو بآسانی لوٹ لیتے ہیں ان سوداگروں کا یہ حال ہے کہ کسی کی جان لینے کی بجائے اپنے مال کو کھو بیٹھنا انہیں منظور ہے۔ یہاں تک کہ اپنے دشمن کی بھی جان نہیں لیتے ہیں۔ اور قزاق اس راز سے بخوبی واقف ہیں۔ اگر مسلمان اور عیسائی تجارت کرتے اور ان راستوں کو استعمال کیا کرتے تو واردا توں میں اسقدر زیادتی نہ ہوتی۔ کیونکہ مسلمان یا مغل عیسائیوں کی طرح مرنا قبول کرلیں گے لیکن اپنا مال قزاقوں کے ہاتھوں لُٹنے نہ دیں گے۔

یہاں (احمد آباد) کا صوبہ دار بڑی شخصیت کا آدمی ہے اور چونکہ احمد آباد کُل صوبہ کا پایۂ تخت ہے اس لئے اُس کا صوبہ دار اس صوبہ کے کُل اضلاع میں عزت اور احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ سمندر کی راہ سے تجارت کرنے والے سوداگر اور بالخصوص انگریز اور ڈچ سوداگروں کو اس کے ساتھ دوستی قائم رکھنی پڑتی ہے لیکن دوستی بغیر تحفہ جات کے

دبے ہوئے ممکن نہیں ہے۔ دنیا میں عام دستور ہے اور یہی قاعدہ ہندوستان کا ہے کہ بڑے آدمی تحفہ جات لینے کے بہت شایق ہوتے ہیں اولاً اس باعث کہ تحفہ جات کا حاصل کرنا امارت کی دلیل ہے اور بڑے لوگوں کو اپنی عزت کا بہت خیال رہتا ہے۔ دوئم یہ کہ بڑے لوگ عموماً لالچی اور حریص ہوتے ہیں اس لئے بھی وہ تحفہ جات کی زیادہ قدر کرتے ہیں۔ صوبہ دار سے دوستی رکھنے کی اس لئے ضرورت ہے کہ مندرجہ بالا ہر دو اقوام سورت۔ بروچ۔ بردوہ۔ کیمبے۔ نوساری اور دیوہی کے قصبات یا مضافات میں آباد ہیں۔ کل اُصلاع سے معاملات آکر احمد آباد میں طے ہوتے ہیں اور یہاں سے بادشاہ کی عدالت میں پہونچتے ہیں چنانچہ اگر راہ میں مال کو یا خود سوداگر کو نقصان پہونچ جائے تو احمد آباد کا صوبہ دار ہی تدارک داقعی کرسکتا ہے۔ وہی نقصانات کا پُورا پُورا یا کم وبیش معاوضہ دلوتا ہے کیونکہ زرمعاوضہ میں اسُ کا بھی حصہ ہوتا ہے۔ مگر اس طریقہ پر فیصلہ حاصل کرنے کے لئے احباب کی امداد کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ لیکن اگر نقصان کی مقدار زیادہ نہیں ہے تو کُل زرنقصان اُنہیں کی نذر ہوجاتا ہے اس وجہ سے بجائے احمد آباد جانے کے یہ بہتر ہے کہ جھگڑے کو باہمی طور پر طے کرلیا جائے۔ یا معاملہ کو چھیڑا ہی نہ جائے۔ غرض کہ ہر حال میں یہ ہی مناسب ہے کہ صوبہ دار کو دوست بناکر رکھا جائے اور اسُ کی رضاجوئی کی جائے۔

اگر تم صوبہ دار کو پسند کرتے ہو تو اکثر اسُ سے ملنے جایا کرو۔ اور اگر وہ شراب کا شایق ہو تو سخت اقسام کی شرابیں اسُ کو تحفہ میں دیا کرو۔ اگر وہ شکار کا شایق ہے تو کبھی کبھی اُس کے ساتھ شکار میں بھی چلے جایا کرو اگر وہ عام مسلمانوں کی طرح حریص ہے تو غیر ممالک کی بنی ہوئی کم قیمت چیزیں اسُ کو بطور تحفہ دو۔ قیمتی اشیاء کے مقابلہ میں وہ بعض اوقات زیادہ قدر سے دیکھی جاتی ہیں۔ غرضکہ اسی قسم کی باتوں سے تالیف قلوب کی ضرورت ہے۔ اور

اسی ذریعہ سے تجارت کو فروغ حاصل ہو سکتا ہے۔ کیونکہ ہماری قوموں کو یہاں کچھ اقتدار حاصل نہیں ہے اور نہ ہماری دھمکیاں یہاں کچھ وقعت رکھتی ہیں انکا تو مقولہ ہے اور بالکل سچ ہے کہ ہماری قومیں جہازوں میں توپیں بھر کر نہیں لاسکتی ہیں۔

یہاں پر قریب قریب ہر جرم کی سزا جرمانہ ہے۔ اگر سنگین جرائم ہوئے تو صوبہ دار کوتوال۔ قاضی اور شہر کے تین چار نمایندے جن کو صوبہ دار طلب کر لیتا ہے ملکر۔ اور معمولی جرم ہوا تو صرف اس طرح پر فیصلہ دیتے ہیں کہ صوبہ دار کو فائدہ پہنچے!

دیوانی اور فوجداری کے احکام کی تعمیل کوتوال اور اس کے ماتحت کرتے ہیں بدعمالیوں کی سزا شاذو نادر ہی جسمانی طور پر دیجاتی ہے بالخصوص مالدار آدمیوں کے معاملات میں تو صرف جرمانہ کر کے تقصیر معاف کر دیجاتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ جس قدر روپیہ ضبطی جبراً وصول یابی اور جرمانہ کے ذریعہ سے وصول ہوتا ہے سیدھا صوبہ دار کو پہونچ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سوداگران کے لئے سڑکیں اور شاہراہیں اس قدر خطرناک ہیں اگر ایران کی طرح یہاں بھی قزاقوں اور راہگیروں کے لوٹنے والوں کو جسمانی سزائیں دی جائیں تو جرائم میں بہت تخفیف ہو جائے۔

یہاں بھی اس قسم کی سزائیں دیجاتی ہیں لیکن صرف غربا کو۔ مالدار جرائم پیشہ رشوت ادا کر کے آزاد ہو جاتے ہیں اور اپنا سر بچا لیجاتے ہیں حالانکہ بادشاہ کا حکم ہے ان کا سر نیزہ پر بلند کر کے شاہراہ پر گاڑ دیا جائے اور جسم کو ٹکٹی سے باندھ کر راستوں پر رکھدیا جائے تاکہ دوسروں کو نصیحت ہو۔

یہاں تشدد کے طریقے مختلف ہیں۔ گتھے ہوئے رسے سے جس کو یہاں کوڑیا کہتے ہیں اقبال جرم کی غرض سے یا معمولی جرم میں بطور سزا کے مجرم کو مارتے ہیں

بعض اوقات وہ پٹتے پٹتے بیہوش ہوجاتے ہیں گھسیٹ کر جیل خانہ میں ڈال دیئے جاتے ہیں۔ چار، پانچ یوم کے بعد کوتوال یا صوبہ دار کے روبرو پیش ہوتے ہیں۔ اگر اب بھی اقبال جرم نہیں کرتے ہیں تو پھر بھی سزا دی جاتی ہے اس سزا کی مقدار مجرم کے اقبال کرنے یا اس کی سخت جانی پر منحصر ہے۔ قرض کی علت میں بھی یہی سزا دے کر قرض دار چار پانچ دن کے بعد صوبہ دار کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں۔ اگر انہوں نے قرضہ خود یا کسی ذریعہ سے صوبہ دار کو یا اپنے مخالف کو روانہ کر دیا تو پھر سزا نہیں دی جاتی ہے سزائے تازیانہ کی تاب نہ لاکر اکثر آدمی مرجاتے ہیں۔

سزا کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ پیر کے تلوؤں پر لٹھے مارتے ہیں۔ جس سے سخت تکلیف ہوتی ہے اور بعض بدقسمت لنگڑے ہوکر چلنے پھرنے سے بھی معذور ہوجاتے ہیں۔ بعض لوگ اس قدر تنگ کوٹھریوں میں بند کر دیئے جاتے ہیں کہ وہ لیٹ سکتے ہیں نہ بیٹھ سکتے ہیں اور نہ بدن سیدھا کر سکتے ہیں۔ بعض آدمی ٹکٹی سے اس طرح باندھ دیئے جاتے ہیں کہ ہل نہیں سکتے ہیں ان کے علاوہ اور بھی سزائیں ہیں جو عام طور پر رائج ہیں صوبہ دار اس قسم کی سزاؤں کا حکم دینے میں بالکل نہیں جھجکتے کیونکہ خود ان کے لئے کوئی سزا مقرر نہیں ہے۔ اور جو چاہتے ہیں کر سکتے ہیں۔

بدنصیبوں کی مصیبت آجاتی ہے جبکہ کوئی ظالم خونخوار اور جاہل گورنر مقرر ہوجاتا ہے۔ سوداگر اپنے متعلقین کو لیکر کسی دوسرے مقام پر چلے جاتے ہیں اور اپنے مکان اور باغ کو کسی دوسرے شخص کے سپرد کر جاتے ہیں یا گورنر کے لئے ویران کر جاتے ہیں بعض اوقات اس خوف سے کہ مبادا گورنر ان کو روک لے وہ لوگ اس سے اجازت لے کر جاتے ہیں یا اپنے رشتہ داروں کو مکان پر چھوڑ دیتے ہیں اور خود

تہا نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ اگر موقع مل گیا تو اپنی زمین اور مکان بھی فروخت کر جاتے ہیں۔ گورنر کے موجودگی تک ان کو تارک الوطنی اختیار کرنی پڑتی ہے اور اُس کے چلے جانے کے بعد یہ خانہ بدوش واپس آکر اپنے گھروں کو آباد کرتے ہیں۔

بیان کیا جاتا ہے کہ یعقوب بیگ نے جو ۱۶۲۲ء میں بہروتچ کا گورنر تھا اور اعتماد خاں کا ملازم تھا صرف جرمانہ کی رقوم ادا نہ کر سکنے کے جرم میں کئی آدمیوں کی کھال کھنچوالی اور کئی آدمیوں کی گردنیں کٹوا دیں۔

بادشاہ کو جب خبر ہوئی تو اُس نے دوسرا صوبہ دار مقرر کر دیا جس نے ضلع کا انتظام زیادہ ہوشیاری اور نرمی کے ساتھ کیا لیکن وہ بھی سخت تھا۔

یہ ایک عام بات ہے کہ صوبہ داروں کو جب بادشاہ تبدیل کرتا ہے تو وہ روانگی سے بیس پچیس روز قبل نہایت بیرحمی اور سختی کے ساتھ رعایا سے ٹیکس وصول کرتے ہیں اور اُس کو غارت اور برباد کرتے ہیں۔ الزام یہ لگاتے ہیں کہ فلاں شخص نے ٹیکس ادا نہیں کیا ہے یا اسی قسم کا کوئی اور قصور کیا ہے غرض کہ اُس کی مالی حالت کا اندازہ کر کے اُس سے جرمانہ کی رقم وصول کر لیتے ہیں عہدہ سے سبکدوش ہوتے وقت بھی صوبہ دار اسی طرح حتی الوسع رعایا کو برباد اور تباہ کر کے اپنی دولت بڑھاتے ہیں۔ لیکن جس طریقہ سے وہ روپیہ کماتے ہیں اسی طریقہ سے اُس کو صرف بھی کرنا پڑتا ہے مثلاً جیسا کہ آئے دن ہوتا رہتا ہے بادشاہ کسی صوبہ دار سے خفا ہو گیا اور اس پر رشوت ستانی کا شبہہ ہے تو ایسی صورت میں اُس کو اپنی کل دولت سے خواہ وہ حلال کی کمائی ہو یا حرام کی دست بردار ہو جانا پڑتا ہے۔ اس کے بعد گر وہ جیل خانہ نہیں گیا ہے۔ اور بادشاہ اُس کی صورت سے قطعی بیزار بھی نہیں ہے تو اُسکو

کسی دوسرے منصب کے لئے بادشاہ اور اُس کے درباریوں کی سخت خوشامدیں کرنا پڑتی ہیں۔

مصنف مذکور پارسیوں کے بارے میں لکھتا ہے کہ یہ لوگ آپس میں مل جل کر رہتے ہیں نہایت ہوشیار اور صلح کل ہیں ان میں بھی جھگڑے ہوتے ہیں لیکن اُن کی تعداد مسلمانوں اور اہل ہنود کے جھگڑوں کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں ہے اپنے تضیوں کو پنچ کے طور پر طے کر لیتے ہیں اور مسلمان یا ہندو حاکم کے پاس اپنے معاملات کو لے جاتے ہوئے ڈرتے ہیں کہ مبادا کوتوال رخنہ اندازی نہ کردے۔ ان کی تعداد بھی کم ہے اور عموماً بندرگاہوں میں آباد ہیں۔ یہ لوگ بھی ہندوؤں اور مسلمانوں کی طرح بالکل آزاد ہیں اور اُسی قانون کے پابند ہیں جو ملک میں رائج ہے۔

مختار
از
مورلینڈ

حسن عابد جعفری

اسی دل کی خاک اڑائینگے کسی در کی خاک اڑا میں کیا

(از جناب حضرت نوح ناروی صاحب)

جو ہو وصل ہی سے انہیں حذر تو ہمارے سامنے آئیں کیا
وہ جلے ہوئے کو جلائیں کیوں وہ لگی ہوئی میں لگائیں کیا

کبھی دل یہ کہتا ہے کچھ کہو کبھی ہم یہ کہتے ہیں کیوں کہیں
جو گذر گئی وہ گذر گئی اب اُسے کسی کو سنائیں کیا

اُسے سو طرح کا خیال ہے ہمیں سو طرح کا لحاظ ہے
کہیں آئے کیوں کہیں جائے کیوں کہیں آئیں کیا کہیں جائیں کیا

جنہیں ناتوانی و ضعف ہو انہیں تاب ظلم و ستم ہو کیوں
جو نہ بیٹھ کر کبھی اُٹھ سکیں وہ کسی کے ناز اٹھائیں کیا

جو یہی ہیں ظلم و ستم ترے تو ہماری زیست محال ہے
یہی رنج و غم ہیں جو روز و شب تو ہم اپنی خیر منائیں کیا

وہی عشق کی ہیں مصیبتیں وہی ہجر کی ہیں شکایتیں
جو کہیں ہم ان سے تو کیا کہیں جو سنائیں ہم تو سنائیں کیا

انھیں حسن پر ہے غرور بھی انہیں شرم بھی ہے لحاظ بھی
وہ نظر کسی سے لڑائیں کیوں وہ نظر کسی سے ملائیں کیا

ہیں مئے جو ہے تو اسی سے ہے ہیں کہ جو ہے تو اسی سے ہے
اسی دل کی خاک اڑائیں گے کسی در کی خاک اڑائیں کیا
کبھی پوچھتے ہیں وہ حالِ دل کبھی سرگذشتِ غم و الم
یہ بتا دے کاش کوئی ہمیں کہ بتائیں کیا نہ بتائیں کیا
نہ وہ دل رہا نہ وہ جی رہا نہ اُمنگ ہے نہ ترنگ ہے
نہ وہ نوحے ہیں نہ وہ شاعری کوئی شعر نوحے سنائیں کیا

یکنظر راجع بنشریات درباب پیشرفت بازنہائے ملی اسلامیان در ہند

(از جناب ہادی صاحب مچھلی شہری - بی اے - ال ال - بی)

مدتے است کہ بندہ یک مقالۂ مختصرے راجع بہ بازیہائے ملی خودمان تعلیم دادہ بودم - مقصودم ازاں نگارش ایں ہرگز نبود کہ مسلمانانِ ہند ازیں جہت کہ بستگی خودشان را با بازیہائے مزبور ترک گفتہ اند ایرادے وارد آورم -

از دو مقالہا کہ در یکے از نمرہ ہائے مجلۂ شریفہ شمع نشر یافتہ است بندہ گمان میبرم کہ نگارندگان مقالہائے مزبور بہ پیشنہاد بندہ درست ملتفت نشدہ اند - مقصودم ہرگز ہرگز ایں نبود کہ از حیث تعلقات و روابط پالیتگی و اقتصادی کہ فیما بین اسلامیان ہند و خارجہ رخ دادہ حرف بزنم - یکے از آقایان مسبوق الذکر خودش را بدیں جہت کہ مسلمانانِ ہند با مسلمانانِ خارجہ در اوقات زحمت و بیچارگی آنہا با تظاہرات ہمدردی و نوع برادری کمک ہومی نمودہ اند خیلے متغیر و عصیانی نشان میدہد - بخیال بندہ نمی رسد کہ اگر بہ فرض مسلمانانِ ہند ہیچ اقداماتے را راہ انداختہ چرا طرف عتاب و خوردہ گیریہائے آقائے مزبور قرار میگیرند و چرا بدبختی اسلامیانِ ہند بچنیں تظاہرات نوعپرورانہ تحمیل میشود ؟ محض ہمدردی و ہمراہی با اسلامیان خارجہ جہت ایں ہمہ بدبختیہا کہ مسلمانان دچارش ہستند ہرگز ہرگز

نمی توانند بشود ۔ هیچیک از ما ها ازین وقوعه که خیلے علنی در پروا ضح است انکار نمی توانند نماید که باوجود اختلاف سکونت و مقتضیات معیشت مسلمانان عالم مسئول معاونت همدگر میباشند ۔ اگر وقتیکه هسپانیه از دست ایالت اسلامیان خارج میشد مسلمانان هند و ترکستان برائے آزادگی و استخلاصش دست و پا رانزدند چرا مو ظف بدین عمل در آینده هم نمی توانند بشوند ؟ چرا مسلمانان هند بحیات ملی خود شان که از روئے مذهب عمده دارش هستند پشت پا زده از بیچارگان ملت صرف نظر داشته باشند ؟ و این هم بخاطرم نمی رسد که بنا بایں اقدامات ملت پرور انه که با مطالب پالیتکی ابداً هیچ سروکارے ندارند چگونه از قدر و قیمت وفاداری آنها در چشم دولت هند میتوانند بکاهد ؟ اگر چند نفر ها برائے پیشرفت کارے با همدگر مسئول هستند و یکے از آنها وظیفه لازمه خودش را ادا می نماید ضرور نیست که دیگران هم از و پیروی کرده در صدد افکار خود شان بنا شند ۔ اگر بر فرض اسلامیان از خارجه با اسلامیان هند همراهی و کمک نمودند چرا این بیچارگان مورد عتاب میتوانند بشوند و درین موقع لزوم دارد که ما آنها میسرا که در صدد افکار ملی نیستند تشویق بچنیں پیش رفتها مینمائیم و نه که خود اسلامیان هند را مجبور سازیم که با اسلامیان خارج نقاط ترک مودت گفته قطع مرابطه نمایند ۔

در باب قضیهٔ دیگرے که بنشریات ادبی تعلق دارد آقائے مزبور فقط بر دو سطر ها اکتفا نموده شرح و بیانش را برائے آینده فروگذار مینماید ۔ بنده هرگز هرگز نمی گویم که مسلمانان هند در تحصیل ادبیات ملی که عبارت از عربی و پارسی میباشد جاهد و کوشان نبوده اند ولے این جدیت هم برائے تحصیل زبان ترکی هرگز بخرج نرفته دبنده حتماً می توانم بگویم که تا کنون یک کتابے هم از قبیل ترکی بمطابع هندی چاپ نشده و پیش از

یک یا دو نفر دیده می شوند که با این زبان سروکارے را داشته باشند۔

شکے ندارد که در اقوام اردو از مسلمانان هند برائے تحصیل زبانهائے عربی و پارسی جدیت را بکار برده اند ولے این یک حقیقه پاریه می باشد که سالها است از میان رفته و اکنون هیچ یک از ما با گرمی شایانے در جانب آن ملتفت نیست۔

درین روزها که تجدد در هر چیزے رخ داده زبانها هم مورد یک نوع انقلاب ادبی گردیده اند۔ عربی و پارسی بطوریکه قرنها گذشته می بود در عصر حاضر هرگز نمی باشد، و سبب این نظریات ما در ادبیت هم باید نسبتاً تجدد بیابد درین دوره که هر زبان کوشان است که ادبیات خودش را از تخیلات نوی بهره یاب سازد عربی و پارسی هم عقب نیفتاده و از بیشتر افکار حالیه که روز بازارے تازه پیدا کرده است نشان میدهد۔ ازین رو لزوم دارد که اگر مسلمانان هند در صدد تحصیل این زبانها هستند از تجددات نوئینه بیخبر نباشند والا همه جدیت آنها درین زمینه بهدر رفته اوقات عزیز شان را ابجیت بباد خواهد داد۔

در هند با وجود نشر زبان انگلیسی هنوز عدهٔ باقی مانده که از السنهٔ مغربی ابداً لاعلم و بیخبر است و خوشبختانه و یا بدبختانه همین جنبه از معارف خواهان ملت بشمار میرود۔ لهذا برائے چنین آقایان خیلے لزوم دارد که از "کلاسیک" صرف نظر داشته ادب فارسی و عربی را بصورت موجود تحصیل نمایند تا اقل از ان حیات اهالی مغرب بهره ها برداشته باشند که کم و یا زیاد در ادبیات کنونی و غلغلے پیدا کرده است۔ بنده شخصاً تجربه دارم که برائے محصلان ادبیات قدیمه زبانهائے امروزی از یک معمه لاینحل نشان میدهد و بیشتر خوانندها با وجود ادعائے دارائی علمیت از فهم و درک نمودن

مطلب مقالہائے کہ در مجلہای خارجہ امروزی نشر می یابد ابداً قاصر می مانند بلکہ اکثر در نقاط ہند موجود ہستند کہ یک ذرہ ہم از لغات و مصطلحات کنونی بگوش آنہا نخوردہ گمان میبرند کہ بزبانیکہ از کتابہائے قدیم پارینہ برداشتہ اند ہیچ لطمہ یا انقلابے وارد نیامدہ۔ در مدارس و مکاتب خانگی و شخصی محصل شروع ہمان "کریما" و "مامقیماں" می نماید کہ بزرگان خودش بدان رفتار کردہ بودند۔ بیشتر از کتابہای درسی ابتدائی بنظر می آید کہ ارزش یک حذف راہم ندارد و آموزندہائے مزبور شاگرداں را از ہماں کتابہا درس شان را یاد دادہ اوقات خود و نوباوگان را بے جہت و بے لزوم ضائع می نمایند و ہمہ زحمات و جدیت بیچارہ محصل بباد و بے حاصلی میرود۔

ادبیت ہر ملت باید ہمدوش تجدداتش راہ برود و اگرچہ آقایان پنجابی تا درجہ بدیں پیشنہاد ملتفت شدہ در صدد ہیچو افکار آمدہ اند و لے اقدامات شان تا بحدے نیست کہ بمقتضیات عصری کفایت تواند بکند۔

بندہ در مقالہ مسبوق خودم متذکر شدہ ام کہ برائے مسلمانان ہند خیلے لزوم دارد کہ زبانہائے امروزی را توسط مقالہا و نشریات در مجلہ ہا توسعہ بدہند و کتابہائے را کہ دارائے لغات و مصطلحات امروزی باشد تحت چاپ و انتشار بیاورند۔ بندہ ہرگز ہرگز برآں نیستم کہ فقط ایں پیش نہاد عیناً برائے یک انقلاب مہمی کفایت تواند بکند۔ شکے نیست کہ ہم چو پیش نہادے میتواند تا درجہ عمدہ در تشویق نمودن محصلان بشود و لے برائے احراز اعلی مقاصد ادبی خیلے لزوم دارد کہ ما ترتیبات دروس را براساس ہائے نوی برپا سازیم ما اقل نشریات مسبوق الذکر آموزندہا را بیدار کردہ مصادف تجددات امروزی در ادبیت خواہد نمود و کم کم بخواندن چنیں مقالہا عادت گرفتہ چیزے از آنہا برائے خود ہم خواہند برداشت۔

متاسفانہ متذکر می شوم کہ بندہ از دو مقالہا کہ از قلم آقایان شیر و شروانی نشر یافتہ چیزے نخواندہ ام ولے ہر چہ اخذ می نمایم ازیں قبیل است کہ آقائے شروانی خواہشمند است کہ در ہند یک زبان عمومی بین المللی را از الفاظ و لغات دیگر السنہ مرتب ساختہ در موقع اجرا بگذارد ولے بندہ با چنیں پیش نہادے ہرگز متفق نیستم زیرا کہ عملی کردنش در نظر بندہ خیلے دشوار و متعذر است ۔ تا وقتیکہ اختلاف ملیت از میں بر داشتہ نشود وحدت ادبی ولسانی ہم ناممکن است ۔ بہ علاوہ عذوبت زبان اردو متحمل الفاظ سنسکرت و ہند ی نمی تواند شود ۔ عملی نمودن ہمچو پیش نہادے بغیر آنکہ زبان را یک نغمۂ بے آہنگ نشان دہد ولطف و سلاست و عذوبت ان وارد آوردہ گوشہائے ادب خواہان را انخراش ثمرہ دیگرے نخواہد بخشید ۔

البتہ اگر از طمعہائے اجنب قطع نظر داشتہ اسلامیان جملہ الفاظ ہندی را ادا نمایم کہ از دوراں در فامیلی خودشان رواج دادہ در ہمان زبان حرف زدن را عادت بگیرند یقیناً برائے قیام و دوام اردو خدمتے بزرگ و شایانے کردہ ایم ۔ از حیث آبادی تعداد اسلامیان کم نباشد اگر ہمہ آنہا تصمیم گرفتہ در نشر زبان اردو بکوشند می توانند زبان ما تا اعلیٰ درجہ ادبیت برسانند ۔

عربوں کی تصانیف فن موسیقی پر

(نوشتہ مسٹر شہنشاہ حسین رضوی ایم ۔ اے (علیگ) ایم ۔ آر۔ اے ۔ ایس)

مسٹر ہنری جارج فارمر نے اپنے ایک مضمون میں جو رائل ایشیاٹک سوسائٹی جرنل کی اشاعت اکتوبر ۱۹۲۵ء کی زیب و زینت ہے فن موسیقی پر عربوں کی ان بیش بہا تصانیف کی فہرست مرتب کی ہے جنکے نادرالوجود نسخے خوش قسمتی سے بوڈلین لائبریری میں موجود ہیں، ان تصانیف کا تین ثلث کا تذکرہ کتب خانہ مذکور کی فہرست مطبوعہ ۱۸۳۵ء میں ہے لیکن ایک ثلث حصہ ایسا ہے جو ابھی تک انظار ارباب ذوق سے پوشیدہ ہے ۔ مسٹر فارمر نے ایک مکمل فہرست مرتب کرنے میں بڑی کاوش و دردسری سے کام لیا ہے اور اس میں شک نہیں کہ صرف فہرست ترتیب دیدینا ہی اپنی جگہ پر ایک مستقل خدمت ہے ہندوستان میں اس وقت بھی مختلف مقامات پر قابل قدر تصانیف کے ذخایر موجود ہیں لیکن جو لوگ ان کتب خانوں کی بخوبی سیر کر چکے ہیں وہ بھی آسانی کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ ان میں کیا کیا جواہر گرانقدر موجود ہیں جہاں تک میں اپنے معلومات کی بنا پر کہہ سکتا ہوں میرے خیال میں خدا بخش کا جیسا عظیم الشان کتب خانہ ابھی تک اپنی مکمل فہرست نہیں پیش کر سکا ہے معمولی سے معمولی اور چھوٹے سے چھوٹے کتب خانے کو مفید تر بنانے کے لئے ضرورت ہے کہ سب سے پہلے اس کی فہرست کتب ترتیب دی جائے ۔ اور پھر اگر ہندوستان کے تمام کتب خانوں کی فہرستوں کا ایک مجموعہ شایع کردیا جاوے تو وہ متلاشی نظروں کے لئے ایک بہت زیادہ قیمتی چیز ہوگا ۔ بہرکیف ،

آمدم بر سر مطلب

مسٹر فارمر مذکورہ بالا تصنیف پر سلسلہ وار ایک مختصر نوٹ لکھتے ہیں جس سے اس کا نام مصنف کا نام، ادوار جس میں وہ تصنیف ہوئی حجم، اس کی موجودہ حالت، اور بالخصوص خلاصہ مضمون پر کافی روشنی پڑتی ہے، ان تصانیف میں سے موصوف کی رائے میں سب سے زیادہ اہم بالشان حسب ذیل ہیں :-

۱ - ایک مختصر رسالہ از رسائل اخوان الصفا تصنیف دسویں صدی عیسوی۔

۲ - مقالہ موسیقی کتاب الشفاء از ابوسینا گیارہویں صدی عیسوی

۳ - باب موسیقی کتاب النجات، از حکیم ابوعلی سینا گیارہویں صدی عیسوی

۴ - رسالہ شرفیہ از صفی الدین عبدالمومن تیرہویں صدی عیسوی

۵ - کتاب الادوار از مصنف مذکور

۶ - یستخرج منہ الانغام مولفہ شمس الدین الصیداوی الذہبی سولھویں صدی۔

اول الذکر تصنیف کا عنوان یہ ہے :-

۱۔ رسالۃ الاربعۃ من القسم الاول من الریاضیات والموسیقی (من) رسائل اخوان الصفا

للمعارف المجریطی

اس رسالہ میں ریاضیات اور موسیقی دونوں شامل ہیں۔ ریاضیات اور موسیقی کا جو قریبی رشتہ ہے اس سے عرب ناواقف نہ تھے۔ اس ترتیب سے ظاہر ہوتا ہے کہ عرب موسیقی کو ریاضیات پر مبنی تصور کرتے تھے،

عربی نسخہ کئی بار زیور طبع سے مرصع ہو چکا ہے بمبئی میں ۱۸۸۸-۸۹ء میں طبع ہوا ہے

اور قاہرہ (مصر) میں ۱۸۸۹ء میں۔ لیکن قاہرہ کا مطبوعہ نسخہ دیدہ زیب نہیں۔ رسالہ مذکور کا ۱۸۲۵ء میں جرمنی میں بھی ترجمہ ہوا ہے۔

فصلوں کے عنوانات بھی درج ذیل ہیں :-

فصل اول میں ارباب ذوق اور حکما کے ان خیالات کا تبصرہ ہے۔ جو انہوں نے موسیقی کے متعلق ظاہر کئے ہیں۔

فصل دویم میں نظریہ صورت پر بحث کی ہے۔

فصل سویم میں امتزاج و تنافر اصوات کو چھیڑا ہے۔

فصل چہارم میں تاثرات اصوات کا تذکرہ ہے۔

فصل پنجم میں الحان اور انکے قوانین کی شرح کی گئی ہے۔

فصل ششم میں آلات موسیقی کا ذکر ہے۔

فصل ہفتم میں افلاک و سماوات کے نغمات کی سرور بخش بحث ہے۔

فصل ہشتم کا تعلق احکام کلام سے ہے۔

فصل نہم میں علم موسیقی کے مطابق تناسب اعضا کی جس قدر ضرورت ہے اسکی شرح ہے۔

فصل دہم نغمات افلاک کی حقیقت کو ظاہر کرتی ہے۔

فصل یازدہم عناصر وغیرہ کے متعلق ہے۔

فصل دوازدہم میں مختلف سروں کا ذکر ہے۔

فصل سیزدہم میں فلاسفہ کے اقوال نادرہ ہیں۔

فصل چہاردہم میں پر سرور نغمات سے جو قلب و دماغ پر کیفیتیں طاری ہوجاتی

ہیں ان کو بیان کیا ہے۔

۲۔ الفن الثامن من کتاب الشفاء وھو الموسیقی۔

فن مذکور چھ مقالات پر اور مقالات متعدد فصلوں پر تقسیم ہیں۔

مقالہ اول میں صوت کی تعریف کی گئی ہے۔

مقالہ دوم میں وقفہ یا بعد کے متعلق بحث ہے۔

مقالہ سوم میں اجناس و انواع اصوات کا ذکر ہے۔

مقالہ چہارم جموع و انتقال نغمات کے متعلق ہے۔

مقالہ پنجم میں ایقاع پر بحث ہے۔

مقالہ ششم تالیف سے تعلق رکھتا ہے۔

۳۔ کتاب الموسیقی للشیخ الرئیس ابی علی بن سینا (من جملۃ کتاب النجات)

تصنیف حسب معمول ابواب میں تقسیم ہے۔ جن کے عنوانات حسب ذیل ہیں

باب اوّل۔ صوت: تعریف صوت و ابعاد

باب دویم۔ اجناس

باب سویم۔ جموع

باب چہارم۔ ایقاع

باب پنجم۔ سر پیدا کرنا اور ایک سر کا دوسرے میں بدلنا۔

باب ششم۔ اسمار آلات موسیقی

باب ہفتم۔ صنج بربط شاہر دو، طنبورہ و مزمار

باب ہشتم۔ تالیف الحان۔

۴۔ کتاب الرسالۃ الشرفیہ فی السنت التالیفیۃ لصفی الدین عبدالمومن البغدادی،

یہ کتاب پانچ ابواب اور متعدد فصول پر مشتمل ہے۔

باب اول: صوت پر ایک مفصل بحث ہے۔

باب دوئم: ابعاد پر جو دو اصوات کے درمیان میں پیدا ہوتے ہیں۔

باب سوئم: اجناس اصوات۔

باب چہارم: ترتیب اجناس۔

باب پنجم: ایقاع۔

اس کتاب کے نسخے صرف بوڈلین لائبریری ہی میں نہیں بلکہ برلن، پیرس اور ویانا میں بھی اس کے نسخے موجود ہیں، کرا ڈی واکس نے اس کتاب کے مطالب پر ایک پُر مغز مضمون رسالہ ایشیاٹک میں ۱۸۹۱ء میں لکھا تھا۔

۵۔ کتاب الادوار فی الموسیقی (صفی الدین عبدالمومن)

یہ کتاب بھی اپنے صنف میں بے مثال ہے۔ رسالہ پندرہ فصول پر مشتمل ہے لیکن ہر فصل علم موسیقی پر بیش بہا معلومات کے ذخائر پیش کرتی ہے۔ نغمات پر جس شرح و بسط کے ساتھ بحث کی گئی ہے وہ کسی دوسری کتاب میں مشکل سے ملتی ہے، کچھ آلات موسیقی کا بھی تذکرہ ہے اور بالخصوص اُن آلات کا جن میں دو تاریں لگائی جاتی ہیں۔ بہت سے ایسے آلات کے نام ملتے ہیں جن کا وجود دستیاب ہونا تو درکنار انکی خیالی تصویر پیش کرنا بھی کار دارد، گانے کے طریقوں کو بھی سمجھایا ہے لیکن یہ وہ مقام ہے جس کے سمجھنے کے لئے ہی موسیقی

جاننے کی ضرورت ہے۔

اس تصنیف کے متعلق یہ کہنا کسی طرح بیجا نہ ہوگا کہ یہ صدیوں تک عربی۔ عجمی اور ہندوستانی دوسرے الفاظ میں مشرق اسلامیہ کی نظریہ موسیقی کی روح رواں رہی ہے دوسرے مصنفین اپنی تصانیف میں اس کے حوالے دیتے ہیں اور اس کو بہت مستند سمجھتے ہیں۔ یہی اسباب ہیں جن کی بنا پر کتاب الأدوار کی شرحیں بکثرت ہیں۔ کتب خانہ بوڈلین کے علاوہ برٹش میوزیم ونیز دوسرے مقامات پر بھی اس کے نسخے موجود ہیں۔

۴۔ کتاب یستخرج منه النغامه تالیف الشیخ شمس الدین الصیداوی الذہبی

اس کتاب کا بیشتر حصہ نظم ہی میں ہے۔

فصل اول میں چار اصول قایم کئے گئے ہیں اور ان کے تحت میں آٹھ فروع اور بہر بحور۔

فصل دویم میں اصول و فروع و بحور کی تشریح اور انکا دائرہ عمل سمجھایا ہے۔
باقی ماندہ فصول میں تقریباً اسی قدر مواد بہم پہونچایا گیا ہے جس قدر مذکورہ بالا تصانیف میں موجود ہے۔

یہاں تک کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کرنے کے بعد مسٹر فارمر چند اور کتب کا تذکرہ کرتے ہیں، ان میں قابل ذکر حسب ذیل ہیں۔

۱۔ کتاب کنز الطرب و غایۃ الادب
۲۔ کتاب فی علم الموسیقی و معرفۃ النغام
۳۔ کتاب المیزان فی علم الادوار و الاوزان

اس کے مصنف کا پتہ نہیں لگتا لیکن ایک سرسری نظر ڈالنے کے بعد ظاہر ہو جاتا

ہے کہ مصنف نے صفی الدین عبدالمومن کی "کتاب الادوار" اور شریف الدین علائی العلوی الحسینی البغدادی کی معرکۃ الآرا تصنیف المعروف بہ قرأت الزمن فی علم الالحان کی تقلید کی ہے۔

اس مختصر فہرست کے پڑھنے کے بعد تھوڑا بہت ضرور اندازہ ہو سکتا ہے کہ عرب فن موسیقی میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے۔ ان کی تصانیف فن کے لئے بہترین ذخیرہ ہیں۔ افسوس یہ ہے کہ مشرق اسلامیہ کے اس مردہ فن کو کوئی زندہ کرنے والا نہیں۔ کاش موسیقی کانفرنس ہندوستان جہاں وہ آریہ ورت کے قدیم فن موسیقی کے قالب بیجان میں تازہ روح پھونکنے کی کوشش کرے وہاں اس کے دست دبازو یعنی موسیقی اعراب پر ایک نظر ترحم ڈال دے اردو میں فن موسیقی پر کوئی کتاب سوائے راجہ نواب علی خاں صاحب ممبر کونسل آف اسٹیٹ کی قابل قدر تصنیف "النغمات" کے موجود نہیں نہ کوئی صاحب فن ایسا نظر آتا ہے جس نے موسیقی کو ایک سائنس کی حیثیت سے حاصل کیا ہو اور وہ اتنی قدرت رکھتا ہو کہ خاص فن پر ایک سائنٹفک تالیف بھی پیش کر سکے۔ النغمات عام فہم نہیں۔ اس کے مطالعہ میں صرف اُن لوگوں کو دلچسپی ہو سکتی ہے جو فن موسیقی میں کافی مہارت رکھتے ہیں۔ راجہ صاحب نے فن موسیقی کو ریاضیات کے اصول پر مبنی کرکے اس طرح ہمارے سامنے پیش کیا ہے گویا ریاضی اور موسیقی دونوں حقیقی بہنیں ہیں۔ میں دونوں علوم کے رشتہ کے متعلق سطور بالا میں اشارہ کر چکا ہوں۔ اس موقع پر اس بحث کو پھر چھیڑنے کی ضرورت نہیں، لیکن اس نکتہ کا اظہار بھی ضروری ہے کہ فن موسیقی کے بحیثیت ایک سائنس کے اکتساب کرنے کے لئے صرف معمولی ریاضی داں کی ضرورت نہیں بلکہ وہ ایسا طالب علم چاہیے ہے جو دریات ابتدائی کی تکمیل کرکے اس فن لطیف کے حاصل کرنے کے لئے اپنے دماغ کو آراستہ کر چکا ہو۔

عربوں کی قدیم موسیقی کے متعلق آخری افسوس ناک نکتہ جو ہو سکتا ہے وہ یہ ہے کہ یہ ایسا خزانہ تھا جس کی اب قدر و قیمت کچھ نہیں، کیونکہ اگر اس کو مذکورہ بالا تصانیف کی مدد سے اس قابل بنانے کی کوشش کی جائے کہ اہل ذوق اس کو حاصل کر سکیں تو بھی ایسے صاحبان فن دستیاب ہونا ممکن نہیں جو اس خدمت کو انجام دے سکیں۔ مختصر الفاظ میں یہ ہے کہ عربوں کے زوال کے ساتھ تمام وہ علوم و فنون جن کو انہوں نے عروج دیا تھا صفحۂ ہستی سے مٹ گئے۔ وہ اپنی تہذیب اپنا تمدن۔ اپنے علوم و فنون اپنی یادگار تو ضرور چھوڑ گئے لیکن وہ ایسے جواہر تھے کہ دنیا جوہری بن کر بھی ان کی قیمت نہ پرکھ سکی۔

اس مضمون کی ترتیب میں مسٹر فارمر کے اس مضمون سے جس کا اشارہ جا بجا ہے خصوصیت کے ساتھ مدد لی گئی ہے۔

جرنل رائل ایشیاٹک سوسائٹی لنڈن کی پرانی جلدیں وغیرہ وہ کتب اور فہرستیں جن کی مدد ضروری تھی مضمون کا مواد بہم پہنچانے میں معین ہوئی ہیں جس کا نہایت خلوص کے ساتھ اعتراف کیا جاتا ہے۔

جذبات ھادی

(از جناب ہادی صاحب مچھلی شہری)

رازِ غم آشکار ہونا تھا　　مجھ کو بے اختیار ہونا تھا
موت پر اختیار نا ممکن،　　یہی اے غمگسار ہونا تھا
دلِ بلبل کو کس کے بس کی تھی بات　　پائمال بہار ہونا تھا
تو تو وعدہ خلاف تھا ہی مگر　　مجھ کو بھی اعتبار ہونا تھا
غمِ افشائے راز کیا کہ یہی　　دلِ آشفتہ کار ہونا تھا
ہجر میں کیا خبر تھی پی کر بھی،　　شکوۂ سنج خمار ہونا تھا
غمِ جانکاہ اور رہ رہ کر　　اے خدا ایک بار ہونا تھا
کس کے ناوک کو کس کے سینے سے　　اُف ری تقدیر پار ہونا تھا
میں تو مٹتا ہی ہاں تجھے رسوا　　گردشِ روزگار ہونا تھا
خاک ڈالو دلِ پریشاں پر　　ہو گیا بیقرار ہونا تھا

دل کی تسکین کے واسطے ہادی
نشترِ آبدار ہونا تھا

بنت البحر

(از جناب سید محمد محمود صاحب رضوی مخمور۔ بی۔ اے)

(۱)

ساحل بحر سے بہت دور پانی کا رنگ آبی پھولوں کے چمنستان سے زیادہ نظر فریب اور بلور نیلمیں سے زیادہ شفاف تھا لیکن اس مقام پر جہاں پانی کی صفائی اور خوش رنگی اس درجہ مکمل اور دلکش تھی سمندر کی گہرائی کی انتہا نہ تھی اور پیمائش بحر کا کوئی آلہ وہاں کے عمق کا اندازہ نہ کرسکتا تھا۔ یہاں تک کہ اگر کئی اونچے اونچے پہاڑ تلے بعد دیگرے۔ پانی میں ڈال دیئے جاتے تب بھی تہ سے سطح تک نہ پہونچتے۔ سمندر کا یہ عمیق ترین حصہ جل مانسوں کے رہنے کا مقام تھا۔

سمندر کی تہ میں صرف سفید ریت اور چکنے سنگریزے ہی نہ تھے بلکہ طرح طرح کی پرپیچ وخم بیلیں اور قسم قسم کے رنگین وخوش قامت پودے اور درخت بھی تھے جن سے وہاں کے دلفریب مناظر میں ہمہ وقت ایک روحانی کیفیت پیدا رہتی ان کی لچکیلی شاخیں اور خوش قطع پتیاں حد درجہ حسین وجاذب نظر تھیں اور جب تحت البحر کی آہستہ خرام موجیں، باہم اٹکھیلیاں کرتیں ہوئی ان سے مس ہوتیں اس طرح کہ ان دوشیزگان بہار کے اندام نگارین کی پرعصمت نزاکتوں میں ایک تلاطم پیدا کرجاتیں تو معلوم ہوتا کہ عالم رنگ کی نازک بدن پریاں مصروف ملاعبت ہیں اور انکے اخضری اعضائے جسم کی حرکاتِ رقص اور ان کی سیال زلفوں کی خاموش موسیقی

سمندر کی سبک رفتار لہروں میں منتقل ہو کر رہ گئی ہیں۔ چھوٹی چھوٹی مچھلیاں ہر طرف سے آتیں اور ان بحری کنجوں میں پہروں تیرا کرتیں۔ درختوں کی گھنی پتیوں کے درمیان ان ذی حیات سیم پاروں کی شنا وری ایسی معلوم ہوتی گویا قسم قسم کی حسین چڑیاں مسرت طیران میں اپنی معصوم ہستیوں کو گم کئے آسمان کی فضائے بسیط میں مصروف پرواز ہیں لیکن جل مانسوں کے بادشاہ کا قصر اس سے عمیق تر حصہ بحر میں واقع تھا اور سمندری دنیا کا یہی وہ حصہ تھا جو سب سے زیادہ حسین و دلچسپ تھا شاہی محل کی دیواریں خالص مونگے کی تھیں جن میں جا بجا عنبر شفاف کی بلند قامت کھڑکیاں نصب تھیں اور اس کی چھت دنیائے آب کی سب سے زیادہ نادر و بیش قیمت سیپیوں سے بنائی گئی تھی جن کے منہ امواج بحر کی ہر حرکت مد و جزر کے ساتھ کھلتے اور بند ہو جاتے۔ اس انتظام نے قصر شاہی اور اس کے گرد و پیش کے مناظر میں ایک عجیب تاثر دلربائی پیدا کر دی تھی کیونکہ ہر صدف کے اندر ایک ایسا دانہ مروارید بند تھا جو بڑی سے بڑی ذی اقتدار ملکہ کے تاج شاہنشہی کا طغرۂ زینت بن سکتا اس لئے جب جوار کی آمد و شد کے ساتھ تمام سیپیوں کے منہ اک ساتھ کھل جاتے اور موتیوں کی چمک دمک لوٹیں ہر لب صدف سے یکایک تڑپ کر نکل آتیں تو معلوم ہوتا کہ پانی کے اندر ہزاروں حسین مچھلیاں ایک ساتھ کوندگئیں۔

جل مانسوں کی بادشاہ کی ملکہ کئی سال ہوئے مر چکی تھی اور اب وہ تنہا زندگی بسر کرتا تھا اس لئے خانہ داری کے تمام انتظامات اس کی ماں کے سپرد تھے۔

بوڑھی ملکہ ایک ذی فہم و ہوشمند عورت تھی مگر اسے اپنی شرافت نسب کا بڑا غرہ تھا اور اس امتیاز کو ظاہر کرنے کے لئے اس کے جسم کے حصۂ زیریں پر جو بالکل مچھلی کی طرح تھا دس نہایت کمیاب موتی نصب تھے حالانکہ مملکت بحر کے دیگر شرفائے خاندانی کو صرف چھ موتی پہننے

کی اجازت تھی۔ غرور نسب کے علاوہ بوڑھی ملکہ کے خصائل ہر طرح قابل تحسین تھے خصوصاً اس لئے کہ اُسے اپنی کنواری پوتیوں حسین بنات البحر سے بہت محبت تھی۔ یہ شہزادیاں جو تعداد میں چھ تھیں نہایت حسین و پر جمال تھیں لیکن سب سے چھوٹی اپنی پانچوں بہنوں سے زیادہ حسین تھی اور اس کی وہی حیثیت تھی جو درخت میں چوٹیوں کے پھول یا جواہرات میں دُرِ یتیم کی ہوا کرتی ہے اس کا جسم گلاب کی پنکھڑیوں کی طرح نرم و نازک تھا اور اس کی نیلی آنکھیں جو ہر حال میں متبسم معلوم ہوتیں آہوان ختن کی صہبا ریز آنکھوں سے زیادہ مست و مخمور۔ اپنی بہنوں کی طرح اس کے بھی پاؤں نہ تھے اور بجائے پاؤں کے اس کے جسم کا حصہ زیریں بالکل مچھلی کی طرح تھا۔

تمام دن ساری بہنیں محل کے عالیشان ایوانوں میں جن کی دیواروں پر سیکڑوں رنگ کے پھول کھلے ہوئے تھے کھیلا کرتیں۔ اکثر امواج کے لمس پیہم سے عنبریں کھڑکیاں کھل جاتیں اور بالکل اسی طرح جیسے چڑیاں ہمارے کمروں میں آجاتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی مچھلیاں تیرتی ہوئی کمروں میں گھس آتیں اور شہزادیاں ان سے پہروں کھیلا کرتیں۔

محل کے سامنے ایک وسیع باغ تھا جس میں سرخ اور گہرے آبی رنگ کے بہت سے درخت تھے ان کے پھل طلائے خالص کی طرح دمکتے تھے اور اُن کے پھول جن کی نازک شاخوں سے لرزش ایک لمحہ کے لئے جدا نہ ہوتی تھی دہکتے انگاروں کی طرح شعلہ رنگ تھے باغ کی زمین نہایت پاکیزہ تھی اور اس کا رنگ کپاس کے دل آویز پھولوں کی طرح ہلکا زرد تھا۔ وہاں کی ہر آرایش میں ندرت تھی اور ہر رنگ میں کیفیت دلربائی لیکن رنگوں کے اس لطیف تنوع کے باوجود قصر و باغ کا سارا منظر ایک

نظر فریب آبی روشنی میں ہر وقت غرقِ تنویر رہتا اور بجائے اس کے کہ سمندر کی تہ میں واقع
معلوم ہوتا دیکھنے والے ایسا محسوس کرتے گویا سارا طلسم حسن و رنگ فضا میں معلق ہے جہاں
اوپر اور نیچے صرف نیلگوں آسمان ہی آسمان نظر آرہا ہے ۔ عالم آب کے اس دلکش قطعہ میں
ہر موسم کی کیفیات مختلف تھیں اور ہر وقت کے مناظر جداگانہ لیکن اس وقت جب پانی
کی تمام مخلوق ساکت و خموش ہوتی اور زیر آب ایک سکون مطلق طاری تھا تھا تو آفتاب
سے جو وہاں ایک ارغوانی پھول کے مانند دکھائی دیتا انوار سیال کا ایک زبردست
چشمہ جاری نظر آتا اور ایسا معلوم ہوتا گویا معدن طلا کا تمام سرمایۂ حسین رقیق ہو کر بہ نکلا ہے یا آب
زرین کا ایک نظر فریب دریا سنہری موجیں مار رہا ہے پائین محل میں شاہی باغ کے علاوہ،
ہر شہزادی کے لئے علیحدہ علیحدہ باغیچہ تھا جس میں کیاریاں بنانا، پودے لگانا، پھول چننا، غرض
اپنے مذاق کے مطابق آراستہ رکھنے کا سب کام اسی کے سپرد تھا۔ ایک بہن نے اپنی
کیاریاں ویل (سمندر کی ایک دیو قامت مچھلی) کی شکل کی بنائیں، تو دوسری نے نبت البحر کی
صورت کی، لیکن سب سے چھوٹی نے جس کا نام دُردانہ تھا اپنی کیاریاں سورج کی شکل کی
بالکل گول بنائیں اور ان میں سورج کی صباحی کرنوں کے رنگ کے صرف گلابی پھول لگائے۔
دُردانہ اپنی سب بہنوں سے زیادہ حسین و نازک اندام ہی نہ تھی بلکہ اس کا مزاج بھی ان سے
مختلف تھا۔ وہ بہت متین و سنجیدہ تھی لیکن اس کے ساتھ حد درجہ ذہین، حساس اور نفاست
پسند۔ اس کی بہنوں نے اپنے باغیچے مختلف قسم کی اشیائے نادرہ سے جو انہیں
جہازوں کی تباہی کے وقت دستیاب ہوئی تھیں آراستہ کئے تھے۔ مگر دُردانہ کے باغیچہ
میں گلابی پھولوں کے قریب ایک حسین مجسمہ کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ یہ ایک جوان لڑکے کا پیکر
صبیح تھا جو مرمر سپید سے تراشا گیا تھا اور کسی جہاز کی تباہی کے وقت غرق ہو کر سمندر کی

تہ تک پہونچ گیا تھا۔ دردانہ کی شباب پرست نگاہوں نے اُسے اپنے لئے منتخب کرلیا اور اپنے باغیچہ میں نصب کرکے اُس نے بید مجنوں کا ایک درخت اس کے قریب لگا دیا جسے نمو کی فیاضیوں نے بہت جلد ایک پرخلوت و سکون کنج میں منتقل کر دیا۔ بید مجنوں کی نرم و سبز شاخیں چاروں طرف پھیل گئیں، محبوبہ کو اپنی تازگی بخش آغوش میں لے لیا اور بڑھ کر آب رنگ زمین سے مس ہونے لگیں، جہاں ان کا نقشی عکس شاخوں کی طرح ہر لحظہ متحرک رہتا اور ہر وقت یہ معلوم ہوا کرتا کہ بید مجنوں کی جڑیں لچکدار شاخوں سے بوسوں کے ایک پرلذت و کیف تبادلے میں مصروف ہیں۔

دردانہ کے لئے عالم انسان کے متعلق تذکرے سُننے سے زیادہ کسی مشغلے میں مسرت نہ تھی وہ اپنی بوڑھی دادی سے جہازوں، شہروں، انسانوں اور ارضی جانوروں کے متعلق جو کچھ اُسے معلوم تھا سب پوچھنے کی کوشش کیا کرتی اور ہر بات نہایت دلچسپی اور انہماک سے سنتی۔ لیکن یہ بات اُسے سب سے زیادہ عجیب اور دلکش معلوم ہوتی کہ دنیا کے پھولوں میں، برخلاف سمندری پھولوں کے کوئی ایسی لذت بھی پائی جاتی ہے جس کا نام دنیا کی اصطلاح میں "بو" ہے۔ اس کے نزدیک صرف پھولوں کا رنگ ہی ایسا لطف بیکراں تھا جس سے عمر جیسی قلیل مدت میں سیر ہو جانے کا خیال ایک لایعنی سی بات ہے۔ لیکن جب وہ یہ یقین کرنے پر مجبور ہوتی کہ رنگ کی ہم رتبہ کوئی لذت "بو" بھی دنیا کے پھولوں کی ترکیب کا ایک عنصر لطیف ہے جس کا کوئی احساس و اندازہ اسے نہیں۔ تو محض یہ خیال اُسے گھنٹوں کے لئے مدہوش و از خود رفتہ کر جاتا اور جب وہ رنگ و بو کی متحدہ لطف فرمائیوں کا اندازہ کرنے کی کوشش کرتی تو اس کا قیاس طلسم محالات میں گم ہو ہو کر رہ جاتا۔ اُسے دنیا والوں کی قسمت پر رشک آتا اور وہ بے چین ہو ہو کر چاہتی کہ ان کی طرح ایک ہی وقت میں اپنی

نگاہیں پھولوں کے رنگ سے مس بھی کرے اور کیف بو سے اپنے شامّہ کے لئے مسرت نا معلوم کی ایک غیر متناہی لذت بھی حاصل کرنے اور اس فردوس رنگ و بو میں کم از کم ایک ہی لمحہ اسے اپنی روح تحلیل کر دینے کی فرصت میسر آجائے ۔ لیکن جب وہ تخیلات کی دنیا سے نکل کر اسباب پر نظر ڈالتی اور یہ دل شکن حقیقت اس کے پیش نظر ہو جاتی کہ ایسا ہونا اصول تخلیق کی بنا پر اس کے لئے محال تھا تو اس کا دل پست ہو کر رہ جاتا مگر آرزوؤں کی مہلک فراوانی اُسے محالات ممکن دیکھنے کے لئے اب بھی بے حد مضطرب رکھتی ۔

"جب تم پندرہ برس کی ہو جاؤ گی" بوڑھی ملکہ نے کہا "اس وقت تمہیں سمندر سے نکل کر چاندنی راتوں میں چٹان پر بیٹھنے کی اجازت مل جائے گی ۔ اس وقت تم بڑے بڑے جہاز سمندر پر تیرتے دیکھو گی، صحراؤں اور شہروں کے دلچسپ مناظر تمہاری آنکھوں کے سامنے ہوں گے"

اس کی بہنوں میں سب سے بڑی کا پندرھواں برس آئندہ سال پورا ہونے والا تھا ۔ لیکن باقی پانچوں میں ہر ایک دوسری سے ایک سال چھوٹی تھی ۔ اس لئے دردانہ کو دنیا کی چیزیں دیکھنے کے لئے ابھی پورے چھ سال انتظار کرنا تھا ۔ لیکن ہر ایک نے وعدہ کیا تھا کہ پہلے دن جو کچھ وہ دیکھے گی اور جو چیز اس کو سب سے زیادہ عجیب معلوم ہوگی اس کا پورا حال اپنی بہنوں سے بیان کر دے گی ۔ دنیا میں بہت سی چیزیں تھیں جن کے حالات وہ معلوم کرنا چاہتی تھیں مگر ان کی دادی نے کبھی انہیں پوری باتیں نہ بتائی تھیں ۔ اسی لئے ان کی طبیعتوں میں ایک خاص قسم کا اضطراب ہو گیا تھا ۔

چھوں بہنوں میں کسی کا سینہ جذبات شوق سے اسقدر لبریز نہ تھا جتنا سب سے چھوٹی کا اور اسی غریب کو انتظار کے شدید ایام سب سے زیادہ گذارنے تھے ۔ دردانہ فطرتاً خاموش لڑکی تھی اس لئے اس کے خیالات کا اظہار اس کی بہنوں کی بہ نسبت کم ہوتا تھا ۔ اسوا اس کے

اُسے تنہائی بہت پسند تھی اور اس کے وقت کا زیادہ حصہ باغیچہ میں بسر ہوتا تھا۔ اکثر راتوں کو وہ محل کی کشادہ کھڑکیوں کے پاس کھڑی ہو کر سمندر کے گہرے نیلے پانی میں ہو کر اوپر دیکھنے کی کوشش کیا کرتی۔ اُسے چاند اور ستارے نظر آتے مگر ان کی روشنی پیلی اور ان کی جسامت پانی کے اندر معمولی سے زیادہ بڑی معلوم ہوتی۔

لیکن جب اس کی نگاہوں اور چاند کے درمیان ایک طویل سیاہ عکس حائل ہو کر چلتا ہوا معلوم ہوتا تو وہ سمجھ جاتی کہ یا تو کوئی ویل اس کے سر کے اوپر تیر رہی ہے یا کوئی جہاز انسانوں کو لئے ہوئے گذر رہا ہے۔ مگر یقیناً جہاز کے مسافروں کو اس کا گمان بھی نہ ہوتا کہ ایک حسین بنت البحر تہ آب کھڑی جہاز کے حصہ زیرین کی طرف اپنے نقرئی ہاتھ بلند کئے ہوئے ہے۔

سب سے بڑی شہزادی کی پندرہویں سالگرہ ہوئی اور آخر اس کو سطح آب پر جانے کی اجازت مل گئی جب وہ واپس آئی اس کے پاس سینکڑوں باتیں بیان کرنے کے لئے تھیں اس کے نزدیک رتیلے ساحل پر چاندنی رات میں اس وقت لیٹ کر جب سمندر بالکل خاموش ہو۔ قریب کے بڑے شہروں کو جہاں روشنیاں سینکڑوں ستاروں کی طرح چمک رہی ہوں دیکھنا، وہاں کی روح افزا موسیقی سننا، گرجوں کی بلند میناریں دیکھنا اور وہاں کی مقدس گھنٹیاں بجتی سننا سب سے زیادہ دلچسپ مشغلہ تھا۔ مگر وہ ساحل کے قریب نہ جا سکتی تھی۔ اس لئے اس کو یہ ساری چیزیں قریب سے دیکھنے کی آرزو باقی رہ گئی مگر ان کی خیالی دلچسپیاں اس کے جذبات شوق میں اب بھی تلاطم برپا کئے ہوئے تھیں۔

دردانہ نے یہ باتیں، آہ، کس قدر دلچسپی سے سنیں اور شام کے وقت جب وہ محل کے دریچے کے پاس کھڑی ہوئی اور نیلے پانی میں ہو کر اوپر دیکھا، شہر اور وہاں کے تمام دلکش

مناظر حسن کا تذکرہ اس نے اپنی بڑی بہن سے سُنا تھا، اس کے پیش نظر ہو گئے وہ محسوس کرتی تھی کہ گرجے کے گھنٹے سے آوازیں بھی اس کے کان میں آرہی ہیں۔

دوسرے سال دوسری بہن کو، پانی کے اوپر جانے اور جہاں کہیں جی چاہے تیرنے کی اجازت مل گئی جب وہ باہر نکلی سورج غروب ہورہا تھا، اس کے نزدیک یہ حسین ترین منظر تھا، آسمان زرین معلوم ہوتا تھا، بادلوں کا حسن اس کے خیال میں، بیان کی رسائی سے بلند تر تھا، سُرخ و بنفشئی بادل سر پر تیر رہے تھے اور ان کی رفتار سے زیادہ تیز صحرائی ہنسوں کی ایک قطار سطح آب پر غروب ہونے والے سورج کی طرف اڑ رہی تھی وہ خود بھی اسی جانب بڑھی سورج سطح آب کے اسقدر نزدیک تھا کہ اُسے یقین تھا کہ وہ بڑھ کر اُسے چھو لیگی۔ مگر اسکی کوششیں ناکام رہگئیں سورج یکایک ڈوب گیا، بادلوں اور سطح سمندر پر منعکس ہونے والی گلابی روشنی دفعتاً زائل ہو گئی۔

اسی کے ایک سال بعد تیسری بہن کی باری آئی۔ یہ سب سے زیادہ دلیر تھی۔ یہ اس مقام پر جا پہونچی جہاں ایک بڑا دریا سمندر میں گرتا تھا۔ اس نے انگور کی بیلوں سے چھپی ہوئی سرسبز پہاڑیاں، بلند محل، اور شاداب دہقانی تفریح گاہیں، شاندار جنگلوں اور حسین مرغزاروں میں سے نظر آتی دیکھیں۔ اس نے چڑیوں کو گاتا سُنا لیکن سورج اس وقت اس قدر تیز تھا کہ اُسے اپنا گرم چہرہ ٹھنڈا کرنے کے لئے بار بار غوطہ لگانے پر مجبور ہونا پڑتا تھا۔ ایک چھوٹی سی خلیج میں اس نے بچوں کا ایک غول برہنہ نہاتا اور پانی میں کھیلتا دیکھا مگر ان لوگوں نے جوں ہی اُسے دیکھا سب کے سب ڈر کر بھاگ گئے۔ اس کے بعد ایک چھوٹا سا سیاہ جانور آیا یہ کتا تھا۔ کتا اس نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا مگر وہ اس قدر زور سے بھونکا کہ وہ ڈر گئی اور فوراً غوطہ لگا کر جلد بہت دور چلی گئی۔ لیکن

حسین جنگل اور سرسبز پہاڑیاں، اور پیارے پیارے بچے جو بغیر مچھلی کی دُم کے تیر سکتے تھے اُسے بہت دلکش معلوم ہوئے اور اس کے قلب پر مستقل اثر چھوڑ گئے

چوتھی بہن اتنی ہمت والی نہ تھی۔ وہ سمندر کے ایک بعید ترین حصہ ہی میں رہی اور اس کے بیان کے مطابق وہی حسین ترین مقام تھا۔ وہ میلوں تک اپنے چاروں طرف دیکھ سکتی تھی، آسمان مثل شیشہ کے ایک گنبد کے معلوم ہوتا تھا۔ اس نے جہاز دیکھے جو دور سے بالکل بحری چڑیوں کی طرح معلوم ہوتے تھے اس نے عجیب الہیئت ڈولفن (مچھلی) اور دیو قامت ویلیں دیکھیں۔ جن کے نتھنوں سے پانی نکلتا بالکل ایسا معلوم ہوتا تھا گویا ہر طرف سے سیکڑوں فوارے چھوٹ رہے ہیں۔

اب پانچویں بہن کی باری تھی۔ اس کی سالگرہ جاڑوں میں پڑی اس لئے اس نے مناظر دیکھے جو کوئی اپنے پہلے سفر میں نہ دیکھ سکتی تھی۔ سمندر بالکل سبز معلوم ہوتا تھا۔ بڑے بڑے برف کے پہاڑ ہر طرف تیر رہے تھے اور ہر ایک بڑا موتی معلوم ہوتا تھا۔ وہ ان میں سے سب سے بڑے پر جا کر بیٹھ گئی۔ جہاز جو وہاں سے گزرے اُسے وہاں بیٹھا اور اس کے لمبے کالے بال ہوا میں اڑتے دیکھکر خوف سے الگ ہو گئے۔ شام کو آسمان پر کالے بادل چھا گئے، گرج شروع ہو گئی اور بجلی چمکنے لگی، برف کے دیو قامت ٹکڑوں کو جو بجلی کی روشنی میں ہر بار چمک اٹھتے تھے سیاہ لہریں اچھالنے لگیں، جہازوں نے بادبان اتار دیئے ہر شخص خوف سے کانپ رہا تھا لیکن وہ اب بھی چمکیلے برف پارہ پر نہایت مطمئن بیٹھی برق شرربار کی چمک زنی اور سطح آب پر اس کا نورپاش عکس تھرتھراتا دیکھ رہی تھی۔

پہلی مرتبہ جب کوئی بنت البحر سطح آب پر آتی تو بیرون آب کے محاسن و عجائبات دیکھ کر بہت خوش ہوتی۔ ایک مرتبہ جوان ہو کر پانی سے باہر نکلنے اور جہاں جی چاہے تیرنے

کی آزادی حاصل کرنے کے بعد وہ بے پرواہ سی ہو جاتی اور اپنے محل ہی میں رہنا پسند کرتی۔ بلکہ آزادی کا ایک مہینہ گذر جانے کے بعد ان میں سے ہر ایک یہی کہنے لگی کہ سمندر کے اندر ان کا مکان دنیا کی سب چیزوں سے بہتر اور رہنے کا بہترین مقام ہے کبھی کبھی شام کے وقت پانچوں بہنیں بانہیں گلے میں ڈال کر ایک ساتھ پانی سے نکلتیں۔ ان کی آوازیں نہایت دلکش اور انسانی آواز سے زیادہ شیریں وسحر کار ہتیں۔ جب سمندر طوفانی ہوتا اور جہازوں کے غرق ہونے کا انہیں پورا یقین ہو جاتا تو وہ نہایت پر فریب لحن میں سمندر کے عجائبات کی تعریف میں شیریں ترین نغمے گاتیں اور سمندر کے مسافروں کو ان سے قطعی بے خوف رہنے کی خوشخبری سناتیں۔ مگر ملاح ان کے الفاظ نہ سمجھتے اور ان کے نغموں کو طوفان کا شور جانتے۔

اب کی گرمیوں میں جب پانچوں بہنیں شام کے وقت گلے میں بانہیں ڈال کر باہر نکلیں تو دردانہ بیچاری بالکل اکیلی رہ گئی اُسے محسوس ہوتا تھا کہ وہ رونا چاہتی ہے مگر رونا مخلوق آب کی فطرت کے منافی تھا۔ اس لئے کوئی صورت نہ تھی کہ دردانہ کا غم جواب ہر وقت اس کا مونس تنہائی تھا، اس کے قلب و جگر سے جدا ہو کر، ایک لمحہ کے لئے اس کے اضطراب میں سکون پیدا ہو جانے دے۔ چنانچہ اب سوائے اس کے کہ وہ اپنے مصائب ہی سے لذت اندوز ہوا کرے، خلش فراق اور تپش ہجر ہی کو سامان مسرت و تفریح قرار دے لے اس کے لئے کوئی چارہ کار نہ تھا

"کاش میں بھی پندرہ برس کی ہوتی" اس نے خیال کیا "میں جانتی ہوں کہ مجھے دنیائے بیرون آب اور وہاں کے باشندے کسقدر محبوب ہیں"

آخر کار دردانہ کی بھی پندرھویں سالگرہ آپہونچی۔

"اب تم ہمارے ہاتھ سے جانے والی ہو" بوڑھی ملکہ دردانہ کی دادی نے کہا "اچھا آؤ میں تمہیں بھی تمہاری بہنوں کی طرح آراستہ کردوں" یہ کہہ کر اس نے سفید کنول کے پھولوں کا ایک گجرا اس کے بالوں میں لپیٹا۔ گجرے کے پھولوں کی ہر پنکھڑی، نصف پنکھڑی تھی اور نصف موتی۔ اس کے بعد بوڑھی ملکہ نے شہزادی کی عالی نسبی ظاہر کرنے کے لئے آٹھ بڑے موتی اس کی پشت پر نصب کردیئے۔

"مگر ان سے تو بڑی تکلیف ہوتی ہے" دردانہ نے کہا

"آرائش کی خاطر تکلیف برداشت کرنی پڑتی ہے" بوڑھی دادی نے سختی سے جواب دیا۔

دردانہ دل سے چاہتی تھی کہ سارا سامان آرائش اور اپنے سر کا بھاری گجرا اُتار کر رکھدے۔ آہ، اس کے باغیچہ کے سرخ پھول جو اس کے پیارے مجسمہ کے گرد کھلے ہوئے تھے اس کے حسن و رنگ کے لئے کسقدر موزوں تھے اور اسے کس قدر مرغوب و دلپسند لیکن وہ اپنی آرائش میں کسی تبدیلی کی جرات نہ کرسکتی تھی۔

"اچھا میں رخصت ہوتی ہوں" اس نے مسکرا کر کہا اور حباب کی طرح پانی سے گذر کر سطح آب پر جا پہونچی۔ جب اس نے اپنا سر پانی سے نکالا سورج فوراً ہی غروب ہو چکا تھا لیکن بادلوں پر ہلکی گلابی اور سنہری روشنیاں اب بھی چھائی ہوئی تھیں۔ شام کا ستارہ، افق شعلہ گوں پر چمک رہا تھا ہوا دھیمی مگر خوشگوار تھی اور سمندر تالاب کی طرح خاموش تھا۔ ایک بڑا تین بادبان والا جہاز جس کا صرف ایک بادبان چڑھا ہوا تھا قریب ہی پڑا تھا۔ ملاح جہاز کے مختلف مقامات پر بیٹھے تفریح میں مشغول تھے جہاز پر باجا بج رہا تھا اور گانے کی سریلی آوازیں، نسیم بحری کے سبک رفتار

جونکوں کے ساتھ مل کر سطح آب پر دور دور پھیل رہی تھیں۔ جھٹ پٹا ہوتے ہی جہاز پر قسم قسم کی رنگین لالٹینیں روشن کر دی گئیں اور اب پانی کے اندر بیشمار رنگین شعاعیں مرتعش نظر آنے لگیں دردانہ سیدھی کیبن کے دریچوں کے نزدیک پہونچی اور جب اسے لہریں اوپر اٹھا دیتیں تو شفاف شیشوں میں ہو کر اُسے خوش رنگ لباس پہنے والوں کا ایک مجمع نظر آتا۔ ان سب میں نوجوان شہزادہ سب سے زیادہ حسین تھا اور اس کی عمر سولہ برس سے کسی طرح زیادہ نہ تھی۔ اس کے قاتل شباب کی رعنائیاں دردانہ کی حیات کے لئے ناقابل برداشت تھیں اور اس کی رسیلی آنکھیں جوانی کی تند شراب سے یکسر لبریز۔ یہ سارا جشن عیش و نشاط اسی کی سالگرہ کی تہنیت میں تھا۔ ملاح جہاز پر رقص کر رہے تھے اور مبارکباد کے گیتوں کی مسرور موسیقی فضا میں کانپ رہی تھی۔ یکایک شہزادہ صحبت رقص میں داخل ہوا اس وقت ہزاروں ہتابیں ایک ساتھ چھوڑی گئیں، رنگین روشنیوں نے رات کو دن کر دیا اور سارا منظر ایک بقعۂ نور بن کر رہ گیا۔ دردانہ اس سے ڈری اور مجبوراً غوطہ لگا گئی لیکن جرات کر کے فوراً ہی پھر نکل آئی اس کو معلوم ہوتا کہ آسمان کے تمام ستارے ٹوٹ ٹوٹ کر ایک جھرمٹ میں اس کے چاروں طرف سمندر میں گر رہے ہیں۔ اس نے آتشبازی کبھی نہ دیکھی تھی۔ اس کی نظروں میں یہ سارا منظر ایک طلسم تھا اور اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ تھی بڑے بڑے سورج گھوم رہے تھے اور اُن سے آتش رقیق برستی معلوم ہوتی تھی، ذی حیات، آتشیں مچھلیاں نیلگوں فضا میں معلق تھیں اور یہ سارا جمال خوش آئینہ بردار سمندر میں منعکس تھا۔ جہاز پر اس قدر روشنی تھی کہ چھوٹی سے چھوٹی شے صاف نظر آرہی تھی۔ آہ، شہزادہ کسقدر حسین تھا، اس کا تبسم اس وقت جبکہ وہ اپنی سالگرہ کی مبارکباد قبول کر رہا تھا کسقدر دلکش کتنا روح پرور تھا۔

اس مشغلہ میں کافی دیر ہو گئی۔ لیکن دُردانہ اپنی حریص نگاہیں حسین شہزادے کے چہرہ سے نہ ہٹا سکی۔ رنگین شمعیں خاموش کر دیگئیں، مہتابیں چھوٹنا موقوف ہو گیا اہنڈیوں کا شور ختم ہو چکا لیکن کسے معلوم ہے کہ سمندر کے انتہائی عمق میں ایک تلاطم عظیم برپا ہے اور اس کا تباہ کارانہ اثر بہت جلد بیرون آب ظاہر ہو جانے والا ہے۔ یکایک لہریں دردانہ کو اُچھالنے لگیں اب وہ کیبن کے اندر کی چیزیں اور بھی اچھی طرح دیکھ سکتی تھی۔ دفعتہً جہاز میں تزلزل پیدا ہوا بادبانوں میں ہوا بھر گئی، لہروں کا زور دمبدم بڑھنے لگا ۔سیاہ بادل چاروں طرف سے گھر آئے اور جہاز سے تھوڑی دور نہایت سرعت کے ساتھ بجلی چمکنے لگی۔ ملاحوں نے بہت جلد بادبان چھوٹے کر دیئے کیونکہ اب انہیں ایک خطرناک طوفان کا سامنا کرنا تھا۔ طوفانی موجیں جہاز سے ٹکرا ٹکرا کر اس کے ہر حصہ میں قیامت برپا کر رہی تھیں سیاہ رنگ موجیں پہاڑ کی طرح بلند ہوتی تھیں اور اتنی بلند ہو ہو جاتی تھیں کہ دردانہ کو اپنے نیچے دبائے لیتی تھیں مگر وہ ایک حسین بط کی طرح ان میں غوطہ لگا رہی تھی اور بار بار ان کی بلند ترین چوٹیوں پر نمایاں ہو رہی تھی۔ اس کے لئے یہ ایک دلچسپ دوڑ تھی مگر ساکنان جہاز کے لئے انتہائی مصیبت کا سامنا تھا۔ یکایک جہاز پھٹنے کی مہیب آوازیں پیدا ہونے لگیں

دیو قامت تختوں اور لٹھوں کے جوڑ کھُل گئے اور ایک ایک کر کے جہاز سے علیحدہ ہونے لگے اب طوفانی لہروں نے انہیں جھکانا شروع کر دیا، پانی جہاز کے اوپر چڑھ آیا بادبان ہوا کے تند جھونکوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر غرق ہو گئے اور جہاز آہستہ آہستہ ڈوبنے لگا۔

اب دردانہ نے معلوم کیا کہ اہل جہاز خطرہ میں ہیں۔ مگر بہتے ہوئے سامان اور ڈوبتے ہوئے

تختوں اور لٹھوں سے اسے اپنی بھی حفاظت کرنی لازمی ہے۔ ایک لمحہ کے لئے مطلع اس قدر تاریک ہوگیا کہ اُسے کچھ نظر نہ آتا تھا۔ لیکن یکایک بجلی چمکی اور جہاز کی ہر چیز پھر نظر آنے لگی۔ ہر شخص اپنے بچانے کی امکانی کوشش کر رہا تھا لیکن اس کی نگاہیں صرف شہزادے کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ یکایک اس نے شہزادے کو ڈوبتا دیکھا۔ پہلی نظر میں اسکو بڑی مسرت ہوئی کیونکہ اب وہ اس کے قریب تر پہونچا جا رہا تھا۔ لیکن فوراً ہی اسکو یاد آگیا کہ انسان پانی کے اندر زندہ نہیں رہ سکتے اور شہزادہ صرف مر کر اس کے باپ کے محل میں پہونچ سکتا ہے۔ شہزادے کی موت، آہ یہ اس کو کسی طرح گوارا نہ تھی۔ نہیں اسکو مرنا نہیں چاہئے۔ دل میں کچھ عزم کرکے وہ بہتے ہوئے لٹھوں کے درمیان جا پہونچی یہ خیال اس نے قطعی فراموش کر دیا کہ وہ اسکو ہلاک کر سکتے ہیں۔ ہاں شہزادے کی زندگی اس کی زندگی سے زیادہ قیمتی تھی۔ اس نے ایک گہرا غوطہ لگایا اور لہروں کے درمیان سے گذر کر پھر اوپر آگئی۔ شہزادے کے قریب اس وقت پہونچی جب وہ تیرنے کے بالکل ناقابل ہو چکا تھا اور سمندر کی فانی موجیں اسے عنقریب نگل جانے والی تھیں۔ اس کے اعضا سرد ہو چکے تھے اس کی حسین آنکھیں بند تھیں۔ اگر نازک اندام دردانہ اس کی نجات کے لئے نہ آجاتی تو وہ یقیناً مر چکا تھا۔ آخر اس نے شہزادہ کو اپنے ہاتھوں پر لے لیا۔ اس کا منہ پانی سے باہر نکال دیا اور اپنے کو موجوں کے رحم پر چھوڑ دیا صبح ہوتے ہوتے طوفان تو زائل ہو گیا لیکن جہاز اور اس کے مکینوں کا کہیں پتہ نشان بھی نہ تھا۔ سورج اب ایک زرّین چمک کے ساتھ سطح آب سے بلند ہونا شروع ہوا۔ صبح صادق کی گل رنگ شعاعوں نے شہزادے کے رخساروں پر ایک حسین چمک پیدا کر دی مگر اسکی آنکھیں اب تک بند تھیں۔ دردانہ نے اس کے بکھرے ہوئے بال چہرہ سے ہٹائے جن سے

قطرات آب، سچے موتیوں کی طرح اب بھی ٹپک رہے تھے اور اس کی حسین کشادہ پیشانی پر اولین بوسۂ محبت ثبت کر دیا۔ اس کو معلوم ہوتا تھا کہ شہزادہ بالکل اس مرمریں مجسمہ کی طرح ہے جو اس کے باغیچہ میں نصب ہے۔ لیکن مجسمہ کے اعضاء سرد و بےحس تھے اور شہزادے کے گرم و ذی حیات۔ دردانہ نے جب کبھی جوش شوق سے مضطرب ہو کر مجسمہ کو گلے لگایا، کبھی اس کے دل کی دھڑکن اپنے قلب میں منتقل ہوتی محسوس نہ کی، لیکن اس وقت ایک جوان رعنا اس کی آغوش شوق میں تھا، اس کا مہلک شباب اس کی معصوم دوشیزگی سے ہمکنار تھا، یہی نہیں بلکہ دردانہ کی بلوریں کلائیاں اس کی گردن میں حمائل تھیں اور شہزادے کے پرشباب جسم کا اس کے یاسمینی سینہ سے لمس پیہم اس کے سارے وجود میں بجلی سی دوڑائے دیتا تھا اور اس کی نسائیت میں ایک تلاطم برپا کیے ہوئے تھا۔ اس سے پیشتر صرف ایک مرمریں مجسمہ اس کا محبوب و موجب پرستش تھا اور اسی کے گلے میں باہیں ڈال کر گھنٹوں بیٹھی رہنا اس کی تمناؤں کا منتہائے نظر۔ مگر آج پہلی بار وہ محسوس کر رہی تھی کہ ایک پرشباب ذی روح اور اس کے مرمریں مجسمہ میں کیا فرق ہے۔ مجسمہ ایک بے روح قالب۔ حیات سے قطعی معرا، سنگ رخام سے ترشا ہوا ایک پیکر صبیح تھا جس میں ایک مدت کی والہانہ کوششیں کوئی حس بیدار نہ کر سکیں وہ اپنی پرستارہ کے داعیات شباب کا کوئی جواب نہ دے سکا اور اس کے سخت لبوں نے اس کے نازک گلاب آسا ہونٹوں سے مس ہو کر کبھی کوئی شگفتگی، کوئی لذت محسوس نہیں کی۔ اس نے اکثر پیکر مرمریں کو آغوش میں لے لیا اور لئے بیٹھی رہی مگر کبھی ایسی کیفیات اپنی روح میں پیدا ہوتی محسوس نہیں کی جس نے اسے زندگی اور اس کے صحیح مصرف سے آگاہ کر دیا ہو۔ مگر آج حسن و شباب کا ایک جیتا دیوتا اس کی آغوش کی والہانہ نہ ڈھیلی ہونے والی گرفت میں قید

تھا، گو وہ اس وقت بے ہوش تھا اور اپنی عارضی خموشی کے اعتبار سے ایک پیکر مرمریں پڑا سے کسی عنوان فوقیت نہ تھی، مگر دردانہ محسوس کر رہی تھی کہ اس کے جسم میں شعلۂ حیات روشن ہے اور اُسے یقین تھا کہ اس کے چپ مضطرب بوسے شہزادے کو آنکھیں کھول دینے اور اسکی محبت کا اعتراف کرنے پر مجبور کر دیں گے، اس لئے کہ اس کے لبوں کے صرف پہلے ہی لمس نے اس کے جذبات شوق میں ایک مہلک ترین فراوانی پیدا کر کے اس کے اچھوتے بدن میں جو اب تک اس قسم کی کیفیات سے ناآشنائے محض تھا، ایک برقی رَو سی دوڑا دی تھی۔ ہر چند شہزادے کے اعضائے جسم سخت تھے کیونکہ شباب نے ان کے نشو و نما میں اپنی ساری سنگینیاں نہایت فیاضی کے ساتھ صرف کر دی تھیں مگر انکی سنگینی میں ایک ایسا لطیف گداز، ایک ایسی راحت آفریں ملاست و نرمی مضمر تھی، جس سے مس ہو کر وہ شدتِ لطف و انبساط سے کانپ اٹھتی تھی۔

تھوڑی دور شنا دری کے بعد دردانہ کو خشک زمین نظر آنے لگی۔ بلند پہاڑوں کی چوٹیوں پر سپید برف چمکتی ایسی معلوم ہوتی تھی۔ گویا سفید منسوں کی ایک طویل قطار وہاں ساکت بیٹھی ہوئی ہے۔ ساحل کے کنارے کنارے ایک شاداب صحرا تھا اور ساحل سے تھوڑی دور قدیم وضع کی ایک عمارت نظر آ رہی تھی جو غالباً کوئی معبد یا پرستشگاہ تھی۔ عمارت کے سامنے ایک وسیع باغ تھا جس میں لیمو اور سنگترے کے درخت کثرت سے نظر آ رہے تھے اور دروازے کے قریب کئی سر بلند کھجوریں سایہ فگن تھیں۔ اس مقام پر سمندر نے ایک مختصر سی خلیج کی صورت اختیار کر لی تھی۔ یہاں پانی نہایت خموش تھا مگر پہاڑی سلسلے کے کنارے تک نہایت عمیق۔ پہاڑوں کے دامن میں ایک خوبصورت قطعۂ زمین تھا۔ دردانہ شہزادے کو لئے اس مقام پر پہونچی اور ایک جگہ آہستہ سے لٹا دیا۔

سفید بلند عمارت میں اب گھنٹیاں بجنی شروع ہوئیں اور بہت سی حسین دوشیزہ لڑکیاں نکل کر صحن باغ میں ٹہلنے لگیں، دردانہ کا دل چاہتا تھا کہ وہ بھی اس کہکشانِ حسن و شباب میں شامل ہو کر گلگشت کرے اور دنیا کے پھولوں کا ایک ہار بنا کر اپنے گلے میں پہن لے مگر آہ اس کے لئے ایسا ممکن نہ تھا، لڑکیوں کو ساحل کی طرف آتا دیکھ کر وہ بہت دور ایک بلند چٹان کے پیچھے چلی گئی۔ اپنے بالوں اور سینہ کو کف آب سے پوشیدہ کر لیا تا کہ اسکا حسین چہرہ کسی کو نظر نہ آسکے اور بہت شوق سے یہ دیکھنے کی منتظر رہی کہ سب سے پہلے شہزادے پر کس کی نگاہ پڑتی ہے۔

تھوڑی دیر نہ گذری تھی کہ ایک لڑکی وہاں آئی۔ پہلے تو وہ کچھ ڈری لیکن فوراً ہی اپنی سہیلیوں کو بلا لائی۔ دردانہ نے دیکھا کہ شہزادہ بیدار ہونا شروع ہوا اور اپنے گرد سبزہ رنگوں کا ایک حسین مجمع دیکھکر مسکرایا۔

آہ دور افتادہ دردانہ نے خیال کیا وہ میرے آغوش میں بیدار نہ ہوا مجھے دیکھکر مسکرانے کا موقعہ فطرت نے نہ دیا، اُسے کیا معلوم کہ وہ میں ہوں، جس نے طوفان سے اس کی جان بچائی ہے۔

یکایک شہزادہ اُٹھ بیٹھا اور لڑکیاں اُسے اپنے ساتھ بڑی عمارت میں لیجانے لگیں۔ دردانہ کے لئے یہ نظارہ نہایت روح فرسا تھا، غم کی ایک ناقابل برداشت کیفیت اسکے قلب پر طاری ہو گئی اس نے غوطہ لگایا اور اسی طرح ملول و افسردہ، غمگین و مضمحل، اپنے باپ کے محل میں جا پہونچی۔

(باقی دارد)

کون ہے جو کھٹکائے جا کے زنجیرِ وطن

(از نتیجۂ فکر خان بہادر اعتبار الملک حضرت مضطر خیرآبادی مد ظلہٗ)

کس کو روئے کس کو تھامے جانِ دلگیرِ وطن
سر ہے اور تیغِ وطن سینہ ہے اور تیرِ وطن

گھر کی دیواروں پہ یہ برسات کے آنسو نہیں
آج تک روتی ہے مجھ کو میری تقدیرِ وطن

وصلِ احبابِ وطن پچھلے پہر کا خواب تھا
آج دیکھی وادیٔ غربت میں تعبیرِ وطن

دشتِ غربت میں اسے کس کو دکھاؤں کیا کروں
شیشۂ دل میں لئے پھرتا ہوں تصویرِ وطن

اور میری حسرتوں پر رونے والا کون ہے
وقفِ ماتم ہو رہا ہے شورِ زنجیرِ وطن

اے خیالِ دوستاں ہو کا نہ دینا دشت میں
ساتھ اپنے میں لئے چلتا ہوں تصویرِ وطن

وادیٔ غربت میں کٹتے ہیں گلے امید کے

یا تو میں چلتا ہوں یا چلتی ہے شمشیرِ وطن

ابر جب اُٹھا تو اُجڑا آشیاں یاد آگیا

برقِ سوزاں نے دکھادی مجھکو تنویرِ وطن

میری آہیں ناتواں - اور میرے نالے بے سکت

کون ہے جو کھٹکھٹائے جا کے زنجیرِ وطن

مضطرب تم گلشنِ اندور میں تنکے چُنو

موسمِ گل ساتھ اپنے لیگیا سیرِ[لہ] وطن

لہ اشارہ ازدوائے اندور

معلومات

(از جناب مولوی محمد حسین صاحب احسان ندوی)

دیگر ممالک کے مقابلہ میں امریکہ کی سب سے بڑی خصوصیت سرگرمی تیز رفتاری اور عجلت ہے، حتیٰ کہ آبادیاں اور شہر تک آن کی آن میں بس جاتے ہیں اہلِ امریکہ جو کام بھی کرتے ہیں تیزی اور سرعت کے ساتھ کرتے ہیں حتیٰ کہ ان کے چلنے پھرنے اوٹھنے بیٹھنے تک میں یہی روح کارفرما ہے۔

ایک موٹر ہی کو لے لیجئے دنیا بھر میں جسقدر موٹر کار و تکار رواج ہے، اوس کے مقابلہ میں امریکہ میں اون کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔

سنہ ۲۳ء میں واشنگٹن کے اطراف میں مونچیفو کے نام سے ایک شہر آباد کرنے کی تجویز کی گئی، اور دو سال کے قلیل عرصہ یعنی سنہ ۲۵ء تک اس کے رہنے والوں کی تعداد ۷ ہزار تک پہونچ گئی، ایک تھیٹر ہال بھی بن گیا جس میں پچاس ہزار ریال[۱] صرف ہوئے مکانات کی تعداد ۱۴۰۰ سو تک پہونچ گئی، اس کے ساتھ ایک شش منزلہ ہوٹل (جس میں دو سو ۲۰۰ چارپائیوں کی گنجایش ہے) بھی تیار ہو گیا۔ اور وسط آبادی میں ایک بہترین باغ تیار ہو گیا۔

ایک معزز علمی رسالہ میں ایک مضمون شائع ہوا ہے جس میں مردم شماری کے ذریعہ سے

---

[۱] ریال ڈالر کے مساوی ہے تقریباً (ے ؏)

ثابت کیا گیا ہے کہ انسان کی اوسط عمر پہلے کی بہ نسبت زیادہ ہوگئی ہے، چنانچہ فرانس میں ۱۷۸۹ء میں یہ اوسط ۲۰ سال تھا اور ۱۸۰۰ء میں ۲۲ سنہ ۱۸۵۰ء میں ۲۴ اور ۱۸۸۰ء میں ۴۰ سال ہوگیا حتیٰ کہ جنگ عمومی سے قبل ۴۶ سال تک بڑھ گیا۔

تاریخ کے صفحات میں دنیا کے بڑے لوگوں کی عمریں دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یورپ کے ازمنۂ متوسطہ میں ان کی انتہائی عمر کا اوسط فی صدی ½ ۶۲ سال ہوتا تھا لیکن سولہویں صدی میں ½ ۶۳ سترہویں صدی میں ½ ۶۴ اور اٹھارہویں صدی میں ½ ۶۷ سال ہوگیا پھر انیسویں صدی میں صرف ایک سال زیادہ ہوا لیکن بیسویں صدی میں پھر اوسط ۷۱ سال فیصدی ہوگیا۔

زیادتی عمر کی دوسری دلیل یہ ہے کہ مسن اور از کار رفتہ لوگوں کے لئے جو رباطیں (مکانات) بنائی جاتی تھیں ان کی تعداد اب بہت زیادہ ہوگئی ہے۔ اور یہ سب کچھ تمدن کی عام طور پر رواج پذیری حسن معاشرت لطیف و پاکیزہ رہنے اور کھانے پینے میں معتدل رہنے کے برکات ہیں۔

اسکاٹ لینڈ میں رطوبت بہت زیادہ ہے زمین بھی نم رہتی ہے اور اگر لکڑی یا کسی دوسری چیز کا فرش ہو تب بھی تری ہمیشہ رہتی ہے اور اس کا اثر جوتوں پر پڑتا ہے جس سے قسم قسم کے نئے نئے امراض پیدا ہوتے ہیں۔

لیکن اب اس سے حفاظت کے لئے ایلومونیم کے نعل ایجاد کئے گئے ہیں۔ ایلومونیم سب سے ہلکی دھات ہے اس لئے بڑے سے بڑے جوتے کے لئے بھی اس کا وزن بہت ہلکا رہتا ہے، اس نعل کا ایک اور فائدہ بھی ہے کہ انسان پھسلنے نہیں پاتا۔

امریکہ میں ایک نہایت مختصر مشین ایجاد ہوئی ہے جو جوتے کی ایڑی میں لگادی جاتی ہے اور وہ ہر وقت کیچڑ کو جوتے سے علیحدہ کرتی رہتی ہے۔ جوتے کو کوئی نقصان نہیں پہونچتا ہے۔ یہ مشین بہت ارزاں ہے اور وزن میں بھی بہت کم ہے۔ یقین ہے کہ ہندستان کے لئے نہایت مفید ثابت ہوگی۔

جامعہ بودا (امریکہ) میں ایک نیا آلہ ایجاد ہوا ہے جس سے گانے اور گفتگو کی آواز کو محفوظ کرلینا ممکن ہوگیا ہے۔

اس آلہ میں سب سے زیادہ اہم چیز ایک شیشہ ہے آواز کی حرکت اور توّج کے مطابق اوس میں نہایت خفیف ارتعاش پیدا ہوتا ہے اور اس شیشہ کی حرکت فوٹو گرافی کے آلہ پر اثر انداز ہوتی ہے۔ سینما کی طرح اس کا بھی فلم ہوتا ہے۔

عام انسانوں کی طرح مجرموں میں بھی نحوست اور بدفالی کے توہمات ہوتے ہیں جن کو وہ بہت اہمیت دیتے ہیں اور نحوست دور کرنے کے لئے طرح طرح کے وسائل اختیار کرتے ہیں اٹلی میں چور چوری سے قبل گرجا میں جاکر کامیابی کے لئے نمازیں پڑھتے ہیں بعض تعویذ باندھے رہتے ہیں اور ان کے گم ہوجانے کو سخت نحوست اور بدفالی سمجھتے ہیں۔

بعض ممالک میں گرجا سے قریب گھروں میں چوری سے احتیاط کی جاتی ہے، اس کے خلاف کوتوالی کے قریب مکانات میں چوری کی خواہش و آرزو رہتی ہے،

انگلستان میں تو جمعہ کے دنوں کا بہت احترام اور اوس عرصہ میں بدفالی کے خوف سے چوری سے سخت احتراز کیا جاتا تھا، علاوہ بریں تیرہ ۱۳ کے عدد میں بھی بعض لوگ

کے تردیک خاص تاثیر ہے چنانچہ ایک ہوٹل کا ملازم جس کمرہ پر ۱۳ کا عدد لکھا ہوا اُس میں داخل ہونے سے کانوں پہ ہاتھ دھرتا تھا حالانکہ وہ ایک ماہر چور تھا۔

شرقی ممالک کے جرائم پیشہ طبقہ میں عجیب عجیب وساوس واوہام موجود ہیں چور کو چوری کرتے وقت چھینک آجاتی ہے تو وہ اس کو فال بد سمجھتا ہے اسی طرح ایک مجرم جرم سے پیشتر بکری کا تھوڑا سا دودھ زمین پر ڈال دیتا ہے تاکہ دیوتا راضی ہو جائیں یا اُن کا جوش غضب ٹھنڈا ہو جائے۔

افریقہ کے غلام باشندوں کی اُن خراب عادات ورسوم پر بہت کچھ نقد و نظر کیا جا رہا ہے جو انہوں نے یورپین نو آبادکاروں سے اخذ کی ہیں وہ بہت سی باتوں میں اپنے مفید نام: باشندوں کی نقل اور تقلید کرتے ہیں۔

مثلاً جب اونہوں نے دیکھا کہ کبیرہ کے یورپین باشندے جہانتک ممکن ہو ہفتہ کے آخر میں شہر چھوڑ دیتے ہیں اور اتوار کا دن شہر کے باہر دیہات میں گذارتے ہیں کہ ہفتہ بھر کی محنت کے بعد کچھ آرام و سکون مل جائے تو فوراً اس تقلید میں شہر کے باہر مکانات بنوانا شروع کر دیئے ہر شخص ایک دوسرے پر سبقت کرنے لگا۔

لیکن فرق محض اسقدر تھا کہ یورپین طبقہ پورا ہفتہ شہر میں گذار کر صرف ایک دن کے لئے باہر جاتا تھا؛ اور یہ پورا ہفتہ شہر کے باہر اور صرف اتوار کا روز شہر میں گذارنے لگے۔

یورپ میں جہاں اس امر کی پیہم کوشش جاری ہے کہ انسانی عمر کم از کم سو برس کی ہوا کرے وہاں ابھی سے یہ فکر دامنگیر ہوگئی ہے کہ ان لوگوں کو رہنے کے لئے زمین کہاں سے آئیگی؟ یورپ میں اب بھی قلت زمین کی وجہ سے سخت تکلیف ہے۔ ظاہر ہے کہ یورپ کے بعد دیگر ممالک میں بھی طویل العمری رائج کیجائیگی۔ اور پھر ایک ایسا وقت بھی آئیگا کہ تمام عالم کی زمین انسانی بود و باش کے لئے کافی نہ ہوگی ممکن ہے کہ دنیا میں ایسا وقت بھی آجائے۔ لیکن جب تک یورپ کی نوآبادیاں قائم ہیں اہل یورپ کو فکرمند ہونے کی بظاہر کوئی معقول وجہ نہیں ہے۔ ہندوستان ہی ایک اتنا بڑا ملک ہے کہ اگر یہاں کی اقتصادی مشکلات اسیطرح قایم رہیں تو یقین ہے کہ ۵۰ برس میں نصف آبادی تکالیف کا شکار ہوکر مر جائیگی۔ اور اس وقت یہاں کے ٹھنڈے مقامات اہل یورپ کی مہمانداری کا حق اچھی طرح ادا کرسکیں گے۔

ایک اہل یورپ اور اہل امریکہ ہیں کہ موجودہ میعاد زندگی سے اُن کے دل سیر نہیں ہوتے۔ اور تمنا کرتے ہیں کہ "یا الٰہی تا قیامت بر نہ آید آفتاب"! ایک ہم ہندوستانی ہیں کہ ہوش سنبھال کر پھر دل یہی سوچا کرتے ہیں کہ ہم دنیا میں آکر کن گناہوں کی پاداش بھگت رہے ہیں؟ اور یہ سلسلۂ تکالیف اور روحانی عذاب کا کبھی ختم بھی ہوگا یا نہیں!

یورپ کا اسی برس کا بوڑھا آرزو کرتا ہے کہ ۲۰ برس اور زندہ رہے اور یورپ کی زندگی کی بہاریں لوٹے۔ ہندوستان کا ۲۵ برس کا نوجوان یہ دعائیں مانگتا ہے کہ سلسلۂ حیات کسی طرح منقطع ہو اور اقتصادی کشمکش سے کسی عنوان نجات ملے!

اسی سلسلہ میں فرانس کے ایک اخبار کے ذریعہ اس نمایش کے اعداد و شمار کا ملخص معلوم ہوا ہے جو سنہ ۱۹ میں اس شہر میں قائم کی گئی تھی، قارئین کی دلچسپی کے لئے یہ اعداد و شمار ذیل میں شائع کئے جاتے ہیں۔

۱۵ اپریل سنہ ۱۹ء میں نمایش کا افتتاح ہوا اور اسی روز اس میں داخل ہونے والوں کی تعداد ۵۴۳۰۱،۱ تھی

عید حضرہ (یہودیوں کی عید) کے روز یہ تعداد ۰۰۷۵۱۵ اس کے دوسرے روز ۹ ستمبر کو ۱۸۳۰۰۶ اور اتوار کے روز ۱۷ اکتوبر کو ۲۸۰۲۵۶ تک پہونچ گئی، اور یہ سب سے بڑی تعداد ہے جو اس روز نمایش میں داخل ہوئی۔

یہ نمایش ۱۵ اپریل سے ۱۲ نومبر تک رہی اس عرصہ میں زائرین کی تعداد کا شمار ۵۰ ملین ۱۰۸۰۶۰۸ کیا گیا ہے۔

اخراجات کی مقدار ۱۶۱۸۱۳۱۲۶۳۱ فرانک اور ۵۰ سنتیم ہے تمام جمع خرچ پورا کر کے ۱۶۴۲۹۰۷ فرانک، ۳۴ سنتیم منافع ہوا۔

اس سلسلہ میں فرانس اس کی نوآبادیوں اور اس کے زیر اثر مقامات نیز دیگر ممالک کے نمائشی اشیاء پیش کرنے والوں کو جو انعامات دیئے گئے اون کے اعداد و شمار حسب ذیل ہیں۔

نام ملک	مقدار انعام	نمایشی اشیا پیش کرنے والوں کی تعداد
فرانس اوس کی نوآبادیاں اور اس کے زیر اثر مقامات	۲۳۸۳	۳۸۲۵۲[1]

[1] یہ تعداد صرف فرانس کے نوآبادیوں وغیرہ سے شرکت کرنے والوں کی ہے۔ ۱۲

نام ملک	مقدار انعام	نمایشی اشیا پیش کرنیوالوں کی تعداد
ممالک متحدہ امریکہ	۲۳۷۸	۷۶۱۰
اٹلی	۲۰۱۹	۳۱۰۰
جرمنی	۱۹۸۴	۲۶۹۶

مغرب کے مقابلہ میں مشرق میں بچپن کی مدت کم ہوتی ہے اس لئے ہمیں اپنے بچوں کو مغربی بچوں کے مقابلے میں زیادہ کم عمری میں مدارس میں بھیجنا چاہئے، اگر کنڈر گارٹن کی قسم کے مدارس قایم ہوں تو پانچ سال کی عمر میں بھیجدینے میں کوئی مضائقہ نہیں ورنہ دوسرے عام مدارس میں ساتویں سال سے پہلے یقیناً بھیجدینا چاہئے۔

شروع شروع میں چاند کے ذریعہ سے لوگوں نے (صرف) مہینہ کا اندازہ لگایا جب تک زراعت کا رواج نہیں ہوا تھا اسی کو کافی سمجھا جاتا تھا لیکن جب زراعت کا رواج ہوگیا تو اونہیں ایک ایسے فلکی سال کی ضرورت محسوس ہوئی جس سے اون کی فصلوں میں تغیر نہ ہو اور اسی ضرورت سے اونہوں نے فلکی سال متعین کیا۔

مرجح یہ ہے کہ سب سے پہلے جس قوم نے کاشتکاری کو رواج دیا مصری قوم ہے سال شمسی کو بھی سب سے پہلے مصری قوم نے معلوم اور متعین کیا۔

مصریوں نے ایک ہفتہ کو سات دن میں تقسیم کیا اور چاند سورج اور دوسرے (مشہور) پانچ ستاروں کے نام پر اونہوں نے ان دنوں کے نام رکھے۔ یورپ اور ایشیا نے انہیں سے نقل کیا۔

ہیروڈوٹس کا بیان ہے کہ ہفتہ کو سب سے پہلے مصریوں نے متعین و معلوم کیا۔

اکثر علما کا خیال ہے کہ قیصر کا لفظ فرانسیسی لفظ (Caesar) سے کے مقابل ہے یہ لفظ ، لاطینی (Caesar) سے ماخوذ ہے اور اگر ایسا ہے تو اس کے معنی بادشاہ کے نہیں اور نہ یہ کوئی عزت کا لفظ ہے ....
بلکہ .... یہ (Caesar) کی مثل لاطینی لفظ ہے اور اسی کے معنی میں ہے - یہ دونوں کے دونوں ( ) سے مشتق ہیں یعنی قطع کرنا مارنا پھاڑنا وغیرہ وغیرہ پس سیزار (قیصر) کے معنی ہیں جو ماں کا پیٹ چاک کر کے نکالا گیا ہو - اور یہ اس لئے کہ جب ولادت میں سخت دقت ہوئی تو اس کی ماں کا پیٹ چاک کر دیا گیا حتی کہ بعد کو علم طب کی اصطلاح میں اس قسم کی عمل جراحی کا نام ہی قیصریہ (Caesarean operation) پڑ گیا - پھر یہ لقب اس کے بھانجے اوکٹاوین کو ملا کیونکہ وہی اوس کا وارث تھا ، یہ شخص متعدد لڑائیوں کے بعد روما کا بادشاہ ہو گیا - اور یہ سیزار (قیصر) کا لفظ اوس کا اور اس کے بعد کے بادشاہوں کا مستقل لقب ہو گیا - اس طرح اصلی معنی بالکل معدوم ہو گئے اور اس کے بجائے شہنشاہوں کے مجد و عزت کو سرعنوان گیا -

---

انسانی حالات کی تفتیش کے صرف وہی لوگ محتاج نہیں جو جرائم کی تحقیق کرتے ہیں بلکہ بسا اوقات کسی شخص کے حالات معلوم کرنے کی سخت ضرورت پڑ جاتی ہے - گو وہ مجرم نہ سہی -

اس لئے مسٹر آنزبٹ نیویارک کے پولس افسر نے تجویز پیش کی ہے کہ حکومت، بنک اور پولس کے دفاتر میں ہر شخص کے متعلق ایک یادداشت محفوظ رکھی جائے جسمیں اس کا فوٹو اوس کی اونگلیوں کے نشانات، اور اس سے متعلق بعض معلومات مندرج ہوں۔

نیز یہ بھی تجویز پیش کی ہے کہ نو مولود بچوں کے لئے بھی ایسا ہی انتظام ضروری ہے، تاکہ لاوارث بچوں کا پتہ چل سکے نیز مجرموں کی تفتیش میں زیادہ پریشانی نہ ہو۔

۱۹۲۲ء میں مسز الیپن کاسل نے لنڈن سے بیچلر کی ڈگری پائی اسی سال مسز ولیمز نے بیرسٹری کا ڈپلوما حاصل کیا مسز کولمان ۱۹۱۳ء میں ایک شہر کی حاکم منتخب ہوئی،

شاید قارئین کرام کے لئے ذیل کے اعداد و شمار دلچسپی کا موجب ہوں گے جن سے پتہ چلے گا کہ موجودہ صدی میں انگلستان کی جنس لطیف نے کسقدر زبردست ترقی کی ہے۔

جج	۸۹۵
شہر کی افسر	۲
میونسپلٹی کی ممبر	۲۲۴
انتظامی مجالس کی ممبر	۲۰
دوسری نیابتی مجالس کی ممبر	۱۱۹



عزت مآب نواب کرنل حاجی محمد حمید اللہ خاں بہادر
بی-اے (علیگ) ، سی-ایس-آئی ، سی-وی-او
فرماں روائے بھوپال

جلد ۲	فہرست مضامین رسالہ شمع بابتہ ماہ دسمبر ۱۹۲۶ء	نمبر ۶

شبیہ ہز ہائینس فرمانروائی بھوپال

اطلاع

شمع کا جنوری ۱۹۲۷ء نمبر

احتیاطاً زیادہ تعداد مین چھپوایا گیا ہی لیکن گذشتہ تجربون کی بنا پر احتمال ہی کہ یہ تعداد بھی کافی ثابت نہو

اس لئے

اس مرتبہ یہ انتظام کیا گیا ہی کہ سال بھر کے خریدارون سے اگر رسالہ بچ رہیگا تو ایک نمبر کے خریدار کو مل سکیگا۔

شمع آپ کے پورے سال کی دلچسپیوں کا مستقل ذریعہ ہی

ایک سال کی خریداری سے خود اندازہ ہوجائیگا کہ آپ کے پاس صرف ۶ روپیہ میں وہ علمی اور ادبی سرمایہ پہنچ گیا جو مہینون کی کوشش اور سیکڑون روپیہ کے صرف سے فراہم ہوتا۔

شاہان اودہ اُن کے امرار، اور شعرار لکھنؤ کی تصاویر کا سلسلہ سال روان مین قصداً شروع نہین کیا گیا تھا۔ کیونکہ سال کے درمیان مین شروع ہونے سے سال کے اخیر تک وہ ختم نہ ہوتا۔ اس لئے اب یہہ عجوبہ روزگار سلسلہ ۱۹۲۷ء سے شروع کردیا جائیگا۔ پورے سال کے خریدارون کو یہی فائدہ ہوگا کہ اخیر سال تک اُن کے پاس ایک نفیس تاریخی اور ادبی البم جمع ہوجائیگا۔

منیجر "شمع"

رسالہ

شمع

بابت ماہ دسمبر ۱۹۲۶ء

تعلیم

(از جناب عبداللہ یوسف علی صاحب ایم اے۔ ال ال ایم۔ آئی سی ایس۔ بیرسٹرایٹ لا و پرنسپل اسلامیہ کالج لاہور)

لفظ تعلیم جو عام طور پر استعمال ہوتا ہے دراصل "تربیت" و "تعلیم" دو چیزوں پر مشتمل ہے چونکہ "تربیت" "تعلیم" کا ایک ناقابل انقطاع جزو ہے اس لئے لفظ تعلیم کا اطلاق تعلیم اور تربیت دونوں پر ہوتا ہے تربیت اور تعلیم دونوں ساتھ ہی ہونی چاہئیں اور ایسی تعلیم جسمیں تربیت شامل نہ ہو تعلیم کے نام کی مستحق نہیں ہے۔ وہ اُس پرند کی طرح ہے جو طاقت پرواز نہیں رکھتا یا اُس انسانی جسم کے مشابہ ہے جسکی روح پرواز کر چکی ہے تعلیم ایک ایسا جامع اور عالمگیر مسئلہ ہے کہ اسمیں اُستاد، شاگرد، رعیّت حکومت، اولاد و والدین، مرد و عورت اور دُنیاوی مشاغل کا ہر شعبہ حصّہ لیتا ہے۔ یہاں تمام انسانی قوتوں کی محرّک ہے جو بغیر اس کے کمزور ہو کر اپنے فعل سے معطّل

ہو جاتے ہیں اور آخر کار رجحانات کے زہریلے اثرات ضائع ہو جاتے ہیں۔ یہ مرہم جسم کے زخموں کے لئے مرہم اور اس کی بیماریوں کے لئے دوا کا کام کرتی ہے۔

یوں تو تعلیم بہت سی چیزوں کی امداد کی محتاج ہے لیکن استاد و طالب علم اسکی جان ہیں۔ جس طرح ایک ہوشیار باغبان عمدہ بیج استعمال کرکے ایک خوبصورت باغ تیار کرسکتا ہے اسی طرح انسانی دنیا کا چمن بھی اساتذہ و تلامذہ کی متحدہ کوششوں سے آراستہ و پیراستہ کیا جاسکتا ہے۔ اس کوشش میں چند فرائض استاد اور چند طالب علم اور بعض دونوں پر یکساں عاید ہوتے ہیں۔ ان دونوں ہستیوں کو اپنی ذمہ داری کا پورا پورا احساس ہونا چاہئے اور اپنے فرائض کی ادائیگی میں کسی صورت سے کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھنا چاہئے۔

طالب علم اور اس کے والدین استاد کو دنیا کے چمن کی زیبائش کے لئے ضروری چیزیں بہم پہنچاتے ہیں اور استاد انکو اپنی عقل، علم و تجربہ کو استعمال کرکے چمن کو زینت بخشتا ہے۔ ایک قابل استاد ان کے محاسن و معائب پر غور کرتا ہے اور جس طرح ہوشیار مالی اپنے درختوں کی کمزور و بے قاعدہ بڑھتی ہوئی ڈالیوں کو کاٹ کر عمدہ شاخوں کی بالیدگی میں مدد دیتا ہے اسی طرح استاد بھی اپنے تربیت پذیر طالبعلموں کو برائی سے باز رکھتا اور نیک اور سیدھے راستہ کی طرف مائل کرکے مفید اور کارآمد انسان بناتا ہے۔ کند اور بدشوق بچوں کو بھی تنزل کے گڑھے میں گرنے سے روکتا ہے۔ اس طرح تمام اچھے برے طالبعلم اپنے استاد سے حسب مراتب مستفید ہوتے ہیں۔

استادوں کو اس امر کا بھی لحاظ رکھنا چاہئے کہ صحبت کا اثر بہت جلد ہوتا ہے اور لڑکوں کے انتخاب میں انکی تمدنی اور دماغی حالتوں کے علاوہ ان کے اخلاقی پہلو پر بھی ہر طرح سے غور کرنا چاہئے۔

لڑکوں اور لڑکیوں کی دماغی اصلاح کے ساتھ انکی جسمانی صحت اور نشو و نما کی بھی فکر کرنا چاہئے

رہائش کے کمرے روشن۔ہوادار اور آرام دہ بنوائے جائیں۔جسمانی ورزش اور کھیل کود کا انتظام بھی اس درجہ معقول ہو کہ نہ صرف قوی ہیکل جوان ہی اسمیں حصّہ لے سکیں بلکہ عام ضعیف الجثہ طالبعلم بھی اس سے مستفیض ہو کر اپنی صحت کو برقرار اور جسمانی قوت کو بڑھا سکیں۔

بورڈنگ ہاؤس میں اخلاقی، تمدنی و دیگر دلچسپیوں کے سامان کے علاوہ مذہبی واقفیت حاصل کرنے کے بھی ذرائع بہم پہنچائے جائیں۔اُستادوں کو چاہیئے کہ طلبا میں عملی طور پر اخوت اسلام پیدا کریں تاکہ ان کے ایامِ تعلیم میں اس اخوت کی شان ان کے برتاؤ اور اخلاق میں نمایاں ہو اور آیندہ زندگی میں بھی امید افزا نتائج پیدا ہوں۔

طلباء کے والدین میں اخوت کا جذبہ پیدا کرنیکا بہترین طریقہ یہی ہے کہ موجودہ نسل کی تعلیم و تربیت میں اخوت کی نشو ونما بھی ہو تاکہ یہ بچے جوان ہو کر اخوت کا پورا اثر اپنی اولاد کو وراثت میں دیں

طالبعلم کے فرائض بھی کچھ اُستاد سے کم نہیں ہماری قوم کے بچوں میں بہت سی خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں جن کے زیادہ تر وہ خود اور بعض حالتوں میں ان کے اُستاد و والدین ذمہ دار ہیں ان تمام باتوں کا اصل سبب خراب صحبت اور عام مذہبی ناواقفیت ہے۔

طلباء کو سمجھنا چاہیئے کہ وہ اخوت اسلام کی زنجیر کی کڑیاں ہیں جسکی مضبوطی کا دارومدار اسکی سب سے کمزور کڑی پر ہے اس لئے زنجیر کو مضبوط بنانے کے لئے ہر فرد کا فرض ہے کہ وہ باہمی تنازعات و فسادات کو دور کرنے کی حتی المقدور کوشش کرے اور اپنے متفقہ اتحاد اور کوشش سے دُنیا کے سامنے اخوت کی عدیم المثال نظیر پیش کرے۔

طالب علموں میں نفس قابو میں رکھنے کا مادّہ پیدا ہونا چاہیئے تاکہ وہ اپنے حرکات و سکنات کو ہر طرح ضبط رکھ سکیں۔اپنے آپکو اچھے رنگ میں رنگ سکیں اور حسب ضرورت اپنی عادتوں میں تبدیلی پیدا کر سکیں۔

انکی طبیعت میں دشوار پسندی اور ان کے قلوب میں مدارج عروج کے طے کرنے کی تڑپ ہونا چاہئے۔ عالی ظرفی۔ خودداری۔ اعلیٰ تہذیب و تمدن کی خواہش کے علاوہ ان کو اس بات کا احساس ہونا چاہئے کہ اصلی ترقی صداقت پر مبنی ہے۔

تعلیم میں مضامین کے انتخاب پر نہایت غور و خوض سے کام لینا چاہئے۔ ہر مضمون ہر شخص کے لئے موزون نہین ہے۔ طلبا و والدین اور استادون سے بھی اس فیصلہ مین مشورہ کرنا چاہئے۔ انکو اپنی طبیعت کے میلان کا اندازہ اور اپنی زندگی مین کسی خاص پیشہ یا حالت کے ارادہ کا استحکام معلوم کر کے مضمون لینا چاہئے۔ اس لئے کہ جبتک طبیعت کے ساتھ مضمون کو مناسبت نہین ہوتی کام میں دلچسپی پیدا نہین ہوسکتی اور بغیر دلچسپی قابلیت ممکن نہیں۔ خلاف طبیعت انتخاب مضامین کا نتیجہ ناکامیابی اور نامرادی ہوتا ہے۔

غزل

(از جناب مرزا ذاکر حسین صاحب قزلباش لکھنوی ۔ تخلص ثاقب)

آنکھ پڑتے ہی نہ تھا نام شکیبائی کا
درمیاں نہ تھا نقشہ تری انگڑائی کا

پاک دامانیٔ یوسف تھی زلیخا کی سزا
راستہ چاک سے پیدا ہوا رسوائی کا

سختیاں ہمت دل ہو۔ تو بدل جاتی ہیں
موت اک کھیل ہے لیکن ترے شیدائی کا

تار ملبوس میں تھی یا خطِ تقدیر میں تھی
حال کھلتا نہیں یعقوب کی بینائی کا

ہم کو اس میکدۂ دہر سے امید نہیں
ساغر الٹا ہوا ہے، گنبدِ مینائی کا

نیند آنے دے تو سب سوئیں۔ مگر اے توبہ!
نالہ عاشق کا، اور اس پر شبِ تنہائی کا

دلِ نازک متحمل نہیں غم ہو کہ سرور
پھول مقتول ہے خود اپنی ہی رعنائی کا

نہ ہوا وصلِ تمنا، نہ گئی وحشتِ دل
کیا نتیجہ تھا، مری بادیہ پیمائی کا

آئینہ جس میں سدا ڈوب کے ابھرا کیا حسن
ایک ٹھہرا ہوا پانی تھا خود آرائی کا

ساتھ رونے کا تو احسان ہے تجھ پر لیکن
شمع نے نام ڈبویا مری تنہائی کا

حسن کے ہاتھ بندھے تو وہ ذرا دیر سہی
مجھ پہ احسان تری آئی ہوئی انگڑائی کا

اس کے سننے کے لئے جمع ہوا ہے محشر
رہ گیا تھا جو فسانہ مری رسوائی کا

شوق پابوسیٔ محبوب تھا ورنہ ثاقب
سنگ در پر کوئی موقع تھا جبیں سائی کا

محکومیت لنسواں

(مصنفۂ جان اسٹورٹ مل)

(۲)

از

(جناب محمد معین الدین انصاری صاحب ۔ بی ، اے (کینٹب) ایم ، آر ، اے ، ایس ۔ بیرسٹر ایٹ لاء)

سوسائٹی نے عورت کی زندگی کا نصب العین محض ازدواج اور ازدواجی زندگی تک محدود کر دیا ہے۔ اسکی تربیت میں تمامتر یہی مطمح نظر مضمر ہے۔ گویا بیاہی زندگی کو خوشگوار اور دلکش بنانا اس قدر ضروری ہے اور اس حد تک واجب ہے کہ طبقۂ لنسواں کی کسی دوسری قسم کی بہبودی لائق التفات نہیں۔ اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے جو غیر منصفانہ روش اختیار کی جائے گویا جائز ہے۔

اگلے زمانہ میں عورتیں یا تو گرفتار ہو کر مرد کے قابو میں آتی تھیں یا ماں باپ سے خرید لی جاتی تھیں پھر زمانہ نے رفتہ رفتہ یہ ترقی کی کہ ازدواج کے لئے ایجاب قبول کا طریقہ رائج ہوا لیکن اس زینۂ ارتقا پر آجانے کے باوجود بھی عورت کے لئے (نکاح قبولتے وقت) "ہاں" کہنا محض ایک رسمی شے ہو گئی۔ خود لڑکی کی اتنی مجال کب ہو سکتی تھی کہ اپنے باپ کی مرضی کے خلاف "نہیں" بھی کر سکے۔ وہ زمانہ بھی قریب ہی کا ہے کہ عورت کے حق میں شوہر کا مرتبہ مالک الکل کا تھا۔ بلکہ یہاں تک تسلیم کیا جاتا تھا کہ شوہر کو اپنی زوجہ کے قتل تک کا اختیار ہے۔ اور اس زمانہ میں اگر زوجہ شوہر کو قتل کر دیتی تو اسکو جلا دینے کا حکم تھا۔ شوہر کے قتل کا اقدام قانونی اصطلاح میں "بغاوت ادنیٰ" کہلاتا تھا۔ اور اب تک

انگلستان کے قوانین کے رو سے بہت سے معاملات میں عورت مرد کی گویا زرخرید ہے۔ اور بمنزلہ جائداد غیر منقولہ کے ہے۔ تعزیری قوانین میں ابتک اس قسم کے نظریے جاری ہیں۔ عورت کی جائیداد اکثر صورتوں میں اُس کے شوہر کی جائیداد کے مرادف ہے اگرچہ ہمارے قوانین میں ایک نظریہ یہ بھی ہے کہ زن وشو بعض معاملات میں "ایک جان دو قالب" ہیں لیکن اگر اس نظریہ سے بالفعل کوئی مستفید ہے تو تمامتر مرد۔ نہ کہ عورت۔ گویا شادی کرنے کے معنی عملی دنیا میں یہ ہیں کہ ایک عورت نے اپنے کو ایک مرد کی غلامی میں دیدیا۔ جہاں تک قانون کا تعلق ہے بیاہی سے بن بیاہی اور بیوہ اچھی ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ بحالات موجودہ بھی ممکن ہے کہ لوگ اپنی زوجہ کو لونڈیوں سے بدرجہا زائد آزاد اور صد درجہ باحیثیت بنا کر رکھیں۔ اون پر کوئی تشدد نہ کریں۔ بلکہ اُن کے اشاروں پر چلنے لگیں مگر یہ وہی صورت ہوگی جیسے کوئی آقا باوجود اپنے وسیع اختیارات کے اپنے غلاموں کے ساتھ شفقت کا برتاؤ کرتا رہے اور اپنی حکومت جتانا مناسب نہ سمجھے۔

اکثر ممالک میں جہاں غلامی کا رواج باقی ہے آقا کے لئے اپنی لونڈی سے بالجبر مباشرت کرنا بھی جائز ہے۔ البتہ مسیحی دنیا میں اس قسم کا تشدد لونڈیوں پر کبھی جائز نہیں سمجھا گیا۔ لیکن یہ کیا اندھیر ہے کہ اپنی بی بی سے اس قسم کا جبر بھی سب کہیں جائز ہے؟ ہر شوہر کو اختیار دیدیا گیا ہے کہ جب چاہے بغیر اُوسکی مرضی کے اُس مظلومہ کو اپنی رکیک ترین حیوانی خواہشات کے رفع کرنے کا ایک ادنی آلہ بنالے اگر وہ غریب شوہر سے بھاگنا چاہتی ہے تو قانوناً طرح طرح سے اُسکو شوہر کے ساتھ دینے پر مجبور کرسکتے ہیں اولاد اگر ہو تو معمولاً وہ باپ کی ہے۔ نہ کہ ماں کی۔ اگرچہ باپ ماں کے مقابلہ میں کچھ بھی شفقت نہیں رکھتا شوہر خواہ کتنا ہی جابر وظالم کیوں نہ ہو جبتک اُس کے ظلم کے ساتھ اُس کے زناکار ہونے کا ثبوت نہ ملے وہ بیچاری طلاق بھی حاصل نہیں کرسکتی۔

یہ بالکل درست ہے کہ قانون نے عورت کو جسقدر ذلیل کر رکھا ہے عملی زندگی میں درحقیقت وہ

اسقدر ذلیل نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ خود مرد کا مفاد عورت سے اسقدر وابستہ ہے کہ وہ مجبوراً عورت کو زیادہ نہیں دبا سکتا۔ یہ خود مردوں کے جذبات اور محسوسات ہیں جو عورت کو مہلت زیست عنایت کرتے ہیں۔ غرضیکہ حقیقی خرابیاں دنیائے سیاست میں مطلق العنان اشخاص کی ذات سے پیدا ہوتی ہیں وہ سب مرد کی خانگی مطلق العنانی سے خانگی دنیا میں پیدا ہیں۔

لوگ کہتے ہیں کہ مرد ظالم اور حکومت پسند سہی مگر پھر بھی عورتیں اپنے شوہروں پر جان فدا کئے ہوئے ہیں میں کہتا ہوں کہ یہی بات ذلیل ترین غلاموں پر بھی صادق آتی ہے جب غلامی کا رواج تھا اور اب بھی جہاں ہے دیکھا گیا ہے کہ غلاموں سے زیادہ کوئی ذلیل ہو سکتا ہے نہ غلاموں سے زیادہ کوئی جان نثار ہو سکتا ہے۔

میں پوچھتا ہوں کہ ان اشخاص سے بڑھکر لائق شکر گذاری اور قابل تعریف کون ہو سکتا ہے جن کا یہ حال تھا کہ اگر وہ چاہتے تو ایک پل میں ہزاروں لاکھوں انسانی ہستیوں کو بلا خوف باز پرس دنیا سے نیست و نابود کر سکتے تھے اور پھر بھی وہ اس حرکت سے باز رہے؟ مگر کون کہہ سکتا ہے کہ ایک انسان کا اس حد تک باختیار رہنا اصولاً قابل ستایش ہے یا روا رکھا جا سکتا ہے؟ مرد اگر عورت کے مقابلہ میں اپنے جملہ اختیارات استعمال میں نہیں لاتا ہے تو وہ اپنی ساہا کے مطابق ضرور لایق ستایش ہے۔ لیکن اسکا اسقدر با اختیار ہونا ہی ایک مخدوش امر ہے۔

لوگ کہتے ہیں کہ فلاں شخص کی زوجہ نے یہ شرارت کی۔ وہ شخص اگر چاہتا تو اس صورت سے اس عورت کو عاجز کر سکتا تھا۔ مگر وہ کیسا نیک آدمی ہے کہ انتقام و تعزیر سے باز رہا! یہ بھی سنا ہے کہ فلاں عورت کسقدر خوش خلق ہے کہ اس کے شوہر نے اس پر ایسے مظالم کئے۔ مگر اس نے صبر سے کام لیا اور بالآخر شوہر کو اپنی محبت سے اپنا گرویدہ بنالیا بے شک یہ مثالیں سچی ہیں۔ لیکن لائق غور یہ امر ہے کہ زن و مرد کے تعلقات باہمی کا مسئلہ ایک عالمگیر مسئلہ ہے۔ انفرادی مثالوں سے کام لیکر دنیا کے

ہر مرد اور ہر عورت کی نیک دلی اور سلیقہ شعاری پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ کہنا مقصود نہیں کہ مردوں اور عورتوں کو اس قسم کی تربیت بے کار ہے کہ وہ باہم راضی رہکر زندگی بسر کریں اور باہم نیکی کا برتاؤ کرتے ہیں لیکن یہ تعلیم خاص و عامۃ یک اول تو متعدی نہیں ہو سکتی اور اگر ہو بھی تو ہر ظرف کا انسان اس سے یکساں متاثر نہیں ہو سکتا۔ جو لوگ اچھے لوگ ہیں اُن کے لئے اگر کوئی تعزیری قانون نہ بھی ہو تو کوئی ہرج نہیں۔ تعزیر تو بُرے لوگوں کے لئے ہے اور قانون کی ضرورت اُنہی کے لئے ہے جو بُرے ہیں۔ مگر صورت حال یہ ہے کہ عورتوں میں جو بُری ہیں اُن کے لئے ہر قسم کی تعزیر موجود ہے لیکن بُرے مردوں کی روک ٹوک کا اہتمام قانون سازوں کے نزدیک چنداں ضروری نہیں۔

غرضکہ جہاں تک قوانین کا تعلق ہے شوہروں کو اختیارات بے پایاں نہ دینا چاہئے کہ اگر وہ بُرائی پر مائل ہوں تو ظلم کر سکیں۔ بعض لوگ عقد کے بعد الزام دینے لگتے ہیں فلاں لڑکی نے اور اُس کے والدین نے پہلے سے مرد کی طبیعت کا اندازہ کیوں نہ کر لیا۔ میں کہتا ہوں کہ لڑکی اور لڑکی والوں کے لئے قطعاً ناممکن ہے کہ شوہروں کی طبیعت کا صحیح امتحان شادی سے پہلے کر لیا کریں۔ اکثر تو یہ ہوتا ہے کہ شادی کے بعد انسان کی شخصیت بدل جاتی ہے۔ جو پہلے نیکدل تھا وہ ظالم بن جاتا ہے۔ رفتہ رفتہ اپنے قانونی اختیارات پر ناز کرنے لگتا ہے جب غصہ میں ہوتا ہے تو سب کچھ کر بیٹھتا ہے۔ کیونکہ جانتا ہے کہ بہت سی حرکتوں میں اگر ثبوت ممکن ہوا تب بھی قانون کے حدود سے اُس نے تجاوز نہیں کیا۔ اور بہت سی عورتیں محض اس وجہ سے اپنے شوہروں کی بھلی بُری اُٹھا لیتی ہیں کہ سوسائٹی نے اُنکو شوہر کا غلام بنایا ہے۔

سچ پوچھئے تو فطرت انسانی اس قدر کا کت پسند اور کم ظرف واقع ہوئی ہے کہ زیادتی اختیارات کی اہل نہیں۔ تشدد کی استطاعت رکھکر تشدد سے احتراز یہ ہر شریف مرد کا جوہر ہے لیکن مقنن کا جوہر یہ ہے کہ وہ تشدد کے امکان کو نابود کر دے۔

یہ بھی بعض اوقات کہا جاتا ہی کہ بحالت موجودہ بھی اگر عورت چاہے تو ظالم شوہر سے کسی نہ کسی طرح ضرور بدلہ لے سکتی ہے۔ اسکو دق کرتا ہی تو وہ دوسری طرح مرد کو عاجز کرسکتی ہے لیکن انتقام تو وہ چیز ہی کہ ظلم کا انسداد کرنے کے بجائے ظلم در ظلم پیدا کر دیتا ہی۔ اگر یہ اصول برتا جائے تو بھی میرا خیال یہی ہی کہ بااختیار دبحالات موجودہ بالا مرد ہی کے ہاتھ رہے گا۔

میں مانتا ہوں کہ انسانی محبت بھی ایک چیز ہی جو پتھر کو موم بنا دیتی ہے۔ زن و شوہر میں محبت یوں پیدا ہوتی ہی کہ دونوں متوالے رہتے ہیں۔ ایک دوسرے کی ہمدردی کرتے ہیں اور باہمی خواہشات کو رفع کرتے ہیں۔ بلکہ دونوں کا مقصد زندگی گویا ایک ہوتا ہی۔ اس اتحاد کا نتیجہ بے شک یہ ہوسکتا ہی کہ مرد پر عورت حاوی ہوجائے مگر افسوس کہ پھر بھی وہ آزاد نہیں ہوسکتی۔ محکوم کو خواہ کتنے ہی اختیارات دیدیئے خواہ خود اس کے کہنے پر چلنے لگیے۔ مگر حریت چیز ہی اور ہی! ایک خوبصورت سی چڑیا فرض کیجیے جس کی خوش الحانی پر آپ فریفتہ ہیں۔ اوسکی آواز آپ کے حواس پر قابو کئے ہوئے ہے۔ آپ اس پر اسقدر مہربان ہیں کہ آپ نے اُسے اسیر قفس کر دیا ہی اور ہر دم اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔ آپکی ذات سے اسکو سب کچھ میسر ہی۔ مگر آزادی نہیں۔ حقیقت یہ ہی کہ راحت کبھی آزادی کا بدل نہیں ہوسکتی۔ ایک محکوم ذات کے لئے اس محکوم کے اختیارات کی وسعت اسکی حریت کا پاسنگ بھی نہیں ہی۔

لوگ کہتے ہیں کہ ہر گھرانے میں ایک افسر خاندان ہونا چاہئے۔ اب مرد اگر با اختیار اور مالک الکل نہ ہو تو افسر خاندان کیونکر بن سکتا ہی۔ اور اس کے خاندان کا کام کیونکر چل سکتا ہی؟ میرے نزدیک اول تو یہی کچھ ضروری نہیں کہ ہر گھرانے میں ایک افسر بھی ہوا کرے۔ مختلف تجارتوں میں اکثر ہوتا ہی کہ کئی آدمی شریک کار ہوتے ہیں جنمیں کوئی افسری کی حیثیت نہیں رکھتا اور شراکت کا کل انتظام کامیابی کے ساتھ جاری رہتا ہی یہی صورت ہر خاندان کی بھی ہوسکتی ہے۔ دوسرے یہ

کہ جو افسر خاندان ہو اُس کو دوسرے ارکان خاندان کے مقابلہ میں اسقدر بے پایاں قانونی اختیارات حاصل ہونے کی حاجت نہیں جتنے کہ مرد کو عورت پر قانوناً حاصل ہیں پھر یہ کیا ضروری ہو کہ ہمیشہ مرد ہی افسر خاندان ہوا کرے۔ میری رائے میں ہر خاندان میں زن و مرد تقسیم کار کر لیا کریں۔ اور یہ صورت بحالت موجودہ بھی بہت سے خاندانوں میں کامیاب نظر آتی ہو۔ اختیارات کی کمی بیشی پر ازدواجی اور خانگی زندگی کا دارومدار ہرگز نہ ہونا چاہئے۔ نیز دنیا میں بہت سے خاندان ایسے ہیں جن میں عورتیں اپنے مردوں سے کہیں زیادہ لائق او منتظم واقع ہوئی ہیں۔ اس لئے میرا مطلب یہ ہو کہ جو جس کام کا زیادہ اہل ہو اُسی کے سپرد وہ کام ہونا چاہئے۔

یہ بھی میں مانتا ہوں کہ اکثر مرد اپنی زوجہ سے عمر میں بڑے ہوتے ہیں اور زیادہ تجربہ رکھتے ہیں لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ دنیا کے تمام مردوں کو نسبتہً زیادہ با اختیار ہونا چاہئے درست نہیں اگر اصول سے چلئے تو اُن عورتوں کو مردوں کے مقابلہ میں زیادہ با اختیار کر دیجئے جو عمر اور تجربہ میں اپنے مردوں سے زیادہ ہیں۔

پرانے لوگوں کا قول تھا کہ جبتک عورتوں کو سب باتوں میں نہ دبا رکھنگے وہ کوئی بات اپنی نہ دینگی۔ اور اسی بنا پر بالاعلان وہ عورتوں کو خوب دبائے رکھتے تھے! وہ اپنی اس سرکشی کا اقرار بالکل معیوب نہیں خیال کرتے تھے۔ مگر اب لوگ اس اقرار سے گریز کرتے ہیں اور اس کے بجائے یوں کہتے ہیں کہ عورتوں میں ایثار کا مادہ زیادہ ہو اور اگر عورتوں کو مساوی حقوق دیدیئے جائیں تو انکی خصلت بالکل برعکس ہو جائیگی ممکن ہے کہ یہ صحیح ہو۔ مگر میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ایثار اگر کوئی خوبی ہو تو مردوں میں بھی یہ مادہ پیدا ہونا چاہئے۔ اور جبتک سوسائٹی کی نظر عنایت عورتوں کے مقابلہ میں مردوں پر اسی طرح رہے گی۔ اُس وقت تک مرد اس صفت سے محروم ہی رہیں گے!

(باقی دارد)

جاپانی شاعری پر اک نظر

(از جناب سید حسن عابد صاحب جعفری ڈاکسن (بیرسٹر ایٹ لا۔ ڈیرہ غازی خان)

تمہید | جاپان کی قدیم ضرب المثل ہی کہ "قلب صادق کی حفاظت ایک دیوتا کے سپرد ہی، اگرچہ اس قلب سے کوئی دعا نہ نکلتی ہو" یہی حالت جاپانی شاعری کی ہے۔ وہ الفاظ، بحور اور قوافی سے بالکل مستغنی ہے اور اس کی بنیاد صرف "سکوت" اور "خواب" پر ہی۔ یہی وجہ ہی کہ بعض وقت وہ بظاہر بے معنی معلوم ہوتی ہی اور الفاظ شعری سے گذر گیا تو وہ اس قدر عمیق ہو جاتی ہی یا اس قدر ہلکی ہو جاتی ہی کہ جبتک سامع کے دل پر ایک خاص کیفیت کا اثر نہ ہو وہ اس کے سمجھنے سے عاری رہتا ہی۔

اس میں دل کے معاملات اور عشق کے اندوہناک واقعات، وصل و جدائی کی کیفیات اور چاند تاروں اور پھولوں کی نغمہ سرائی غرض سب کچھ موجود ہی لیکن جاپانی عقیدہ یہ ہی کہ بہترین اشعار وہ ہین جو ضبط تحریر مین نہ آسکیں اور ان کا نغمہ کبھی شرمندۂ ساز نہ ہو۔ بلکہ پردۂ سکوت میں ترنم ریزیان کرتا ہی۔ جاپانی شاعری مین بہترین اشعار وہ مانے جاتے ہین جو قدرت کے کسی ایک موقع یا زندگی کے کسی واحد لمحہ پر تصور یا کیفیت کی تیز شعاع چشم زدن کے لئے ڈالتے ہین اور کسی بھولی ہوئی، یا پس پردہ شے کی جھلک دکھا کر دلوں کو زخمی یا مسرور کر دیتے ہین۔

تاریخ | جاپانی شاعری کب سے شروع ہوئی، اس کا تاریخی ثبوت کوئی موجود نہیں ہے۔ سینکڑون برس کے پُرانے اشعار موجود ہیں۔ لیکن ان سے پہلے بھی جاپان مین شاعری ہوتی تھی، شاعری کی قدامت اس درجہ پر ہی کہ بعض محققین ہزارہا برس پہلے شاعری کے وجود کو مانتے

ہیں اور اس طرح پر ایک طریقہ سے اُن جاپانیوں سے متفق ہیں جو اپنی شاعری کی ابتدا دیوتاؤں سے منسوب کرتے ہیں۔ بہرکیف سب سے جاپانی تاریخ کا پتہ چلتا ہی۔ دو باتیں ثابت ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ شاعری جاپان میں موجود تھی اور دوسرے یہ کہ جاپانی حکومت و معاشرت میں شاعر کو امتیازی رتبہ حاصل تھا۔ چنانچہ صدہا روایتیں اور بیانات اس واقعہ کی تائید میں موجود ہیں۔ ہمارا مقصد صرف جاپان کی قدیم شاعری پر ایک نظر ڈالنا ہی کیونکہ جاپان پر موقوف نہیں ہی بلکہ تمام دنیا سے دورِ شاعری اُٹھ چکا ہی۔ اور کیا ہندوستان، کیا جاپان، کیا عرب، یورپ اور ایران، شاعری دنیا سے اُٹھ گئی اور اب سوائے پرانے شعرا کے کلام کے شاعری کا دنیا میں کوسوں پتہ نہیں ہی۔ اور نہ اس دورِ مادہ پرستی میں شاعری کا جادو کسی پر چل سکتا ہی۔

بہرکیف جاپان کی بہترین شاعری کا زمانہ وہ تھا جبکہ وہاں کے لوگ فن تحریر سے واقف نہ تھے اور شاعری کو ایک مستقل فن تصور کرتے ہوئے اسی فن میں زندگی بسر کرتے تھے۔ ایشیا کے دیگر ممالک کی طرح جاپان میں بھی اُستادی، شاگردی کا سلسلہ جاری تھا اور وہاں بھی مشہور استادوں اور شاگردوں کے درمیان شاعری کا نسب نامہ پایا جاتا تھا۔ لیکن یہ بات البتہ مجھکو جاپانی شعرا میں نئی ملی کہ وہ اپنے فن میں اس درجہ مستغرق رہتے تھے کہ نام و نمود، جاہ و ثروت، دولت و امارت شاعری کے منافی خیال کی جاتی تھی اور بالعموم تمام مشہور شعرا سخت غربت اور عسرت کی زندگی بسر کرنا اپنے فرض سمجھتے تھے۔ ہندوستان میں بھی ایسی مثالیں ضرور موجود ہیں اور میرے خیال میں دیگر ممالک بھی ایسی روشن مثالیں ضرور پیش کریں گے۔ تاہم جاپان میں شاعری اور افلاس کا اجتماع بالکل لازمی قرار دیا گیا تھا اور اس پر سختی کے ساتھ پابندی کی جاتی تھی چنانچہ مشہور شاعر باشوموتوسو کے متعلق کہا جاتا ہی کہ اس کی پچاس سالہ شاعرانہ زندگی نہایت درجہ افلاس کی حالت میں گذری اور یہی مفلسی اس کی اخلاقی طاقت اور دماغی یکسوئی کا باعث ہوئی کسی موقع پر

اس کے شاگردون نے ڈیڑھ پچاس روپیہ کے اس کو بطور زادِ راہ دینا چاہا لیکن اس نے باوجود زمانہ قدیم کی سفر کی صعوبتون کے روپیہ لینے سے انکار کر دیا کیونکہ "ممکن ہے یہ نئی دولت چورون کو میری طرف رجوع کرے اور میرے خیالات کے انتشار کا باعث ہو جائے۔"

کہا جاتا ہے کہ جاپانی شعرا اصول فن میں بڑی محنت کرتے تھے اور اسی سبب سے زندگی مین صرف تھوڑے سے اشعار کہہ سکتے تھے۔ اسی باعث آج یہ مشکل تمام جاپانی شاعری مین چند سو یا قریب ایک ہزار اشعار چوٹی کے لئے جاتے ہین۔ اِس واقعہ پر ممکن ہے کہ بعض لوگ جاپانی شاعری کو کم وقعت خیال کریں لیکن اگر وہ غور کرین تو معلوم ہوگا کہ غالب۔ سا پہلوان سخن، فطرت شناس، اُستاد زبان، عالم بے مثال، شاعر نازک خیال و کہنہ مشق اپنے دیوان اردو کے انتخاب پر مجبور ہوا لیکن اس کا بھی یہ حال ہے کہ کوئی صحیح المذاق شخص انکار نہیں کر سکتا کہ اس انتخاب مین بھی رطب ویابس موجود ہے اور یہ انتخاب، انتخاب مزید کا محتاج ہے۔ اسی طرح اس خدائے سخن۔ پیغمبر سخن، شہید فن، میر تقی میر کا دیوان دیکھو بعض جگہہ سر کو دیوار سے پھوڑو گے تو کہیں بلا کسی تاثر کے صفحے کے صفحے الٹتے چلے جاؤ گے۔

اسی اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے اگر میر انیس کے مراثی پر نظر ڈالو گے تو (عقاید سے برطرف) محض شاعری مین میر و مرزا کی ٹکر کے اُستاد ثابت ہوتے ہیں تاہم مین پھر معافی چاہ کر عرض کرتا ہون کہ مذہبی عقائد کے معاملات سے علاحدہ ہو کر) اگر صرف شاعری کی حیثیت سے اُن کے مراثی کا انتخاب اس خیال سے کیا جاوے کہ وہ اشعار جو بے نظیر ہون صرف انتخاب میں لائے جائین تو کسقدر اشعار منتخب ہو سکین گے! مکرر اور سہ کرر غور کے بعد احباب سلیم الطبع جو جواب دین گے اس سے اردو کی دنیا ادب مین ایک تلاطم برپا ہو جائے گا۔ ایک جاپانی محقق یورپ کو مخاطب کرکے کہتا ہے "شاعرون کو چاہیے کہ اپنے کلام کی اشاعت سے بے نیاز ہو کر قدیم شعرا

جاپان کی طرح اپنی زندگی فن شاعری میں بسر کردیں، کیونکہ شاعر کے لئے شعریت میں زندگی بسر کرنا دنیا کی اول اور اخیر خوشی نعمت ہوسکتی ہے، شاعری اور زندگی کی مواصلت اور یکجائی صرف عملاً اور فعلاً ہی ممکن ہے نہ کہ بذریعہ مطابع کلام کی اشاعت سے۔ مین نے اکثر شعراء دیکھے ہیں جو اپنے دیوان کی جلدون میں زندہ رہے اور جب اوراق کی سیاہی زائل ہوگئی وہ بھی دنیا سے مٹ گئے"۔

مذکورہ بالا طعن آمیز الفاظ پر اگر دنیا کاربند ہوتی تو آج صرف چند ہزار اشعار رہوتے، یا ممکن ہے لاکھ دو لاکھ تک تعداد پہنچ جاتی، لیکن مذاق شعری دنیا کا آج کسقدر صحیح ہوتا اور شاعری آج بھی روحانی و اخلاقی ترقی میں ایک عالمگیر اثر ڈالنے والی نعمت خیال کیجاتی۔

جاپانی شاعری میں اپنی معلومات کی بنا پر کہہ سکتا ہوں (اگرچہ میری معلومات بجائے خود نہایت محدود ہیں) کہ جاپانی شاعری نی نفسہ، اردو، فارسی، عربی، سنسکرت، بھاشا وغیرہ کی شاعری سے مختلف نہیں ہے، میں ہمیشہ سے اس بات کا قائل رہا ہوں اور میرے محدود علم و تجربہ اور سیاحت نے میرے خیال کو مستحکم کردیا ہے کہ دنیا میں ہر زبان اور قوم کی اصل شاعری ایک ہی ہے، تراکیب و اسالیب، واقعات و مشاہدات، رسوم و رواج، انداز بیان و زبان کی خصوصیات و نیز مذاق ملکی و قومی کی بنا پر جو بظاہر اختلاف نظر آتا ہے وہ بہت کچھ ناتجربہ کاری اور کوتہ نظری کی وجہ سے ہے، ورنہ کیفیات قلب، حضرت آدم کے وقت سے ابتک وہی ہین، جذبات اور فطرت کی کہانیاں ہزارون شعراء سناگئے اور ہر ملک مین ان کو مختلف پیرایون میں سنایا گیا لیکن اصل اصول وہی ایک رہا، عاشقی مین اگر ہجر کا سامنا تھا تو دل کی بے قراری ہر شاعری مین موجود ہے۔ رقیب کا اگر کھٹکا تھا تو خیالات مین برہمی ہر شکل مین نمایان ہے اسی طرح مواصلت مین جو خوشی ہوتی ہے وہ انگلستان کے شعراء سے لیکر عرب کے بدوؤن تک نے ہمیشہ محسوس کی، اور نیپال و افریقہ

مین بھی اس کے گیت گائے جاتے ہین۔ اسی طرح مناظر قدرت و دیگر کیفیات قلب دُنیا کی شاعری مین موجود ہین۔ یہی حال جاپانی شاعری کا ہی۔

پھر بھی جاپانی نقطۂ نظر سے "شاعری بیکار حیثیت مین کارآمد چیز ہی" اور اس کی مثال یون دی گئی ہی کہ "آبشار مین پتھر کے ٹکڑے کو دیکھو، فی نفسہ وہ بالکل مبتذل ہی لیکن یہ خیال آتے ہی کہ آبشار کا ترنم صرف اس ذلیل سنگ پارہ سے مس ہونے پر منحصر ہی۔ سنگ ریزہ کی بے بضاعتی محو ہو جاتی ہی اور وہ ایک کارآمد و مفید شے معلوم ہونے لگتا ہی" اسی طرح الفاظ، جاپانی شاعری مین سنگریزہ ہین، لیکن چونکہ شاعری کا ترنم الفاظ پر منحصر ہی۔ اس لئے وہ الفاظ جن کا مجموعہ شعر ہی قابل قدر چیز ثابت ہوتے ہین۔

بالشومتسو شاعر کے ایک شاگرد دھوکوشی کا واقعہ ہی کہ جب اس نے اپنے مکان کی آتش زدگی کے موقع پر نظم جو جاپانی شاعری مین صنعت ہکو کہی جاتی ہی تصنیف کی۔

"وہ (یعنی میرا مکان) جل کر خاک مین مل گیا
پھولوں کے گرنے میں کسقدر پُر اطمینان مسرت ہوتی ہی"

تو استاد شفیق نے کہا "زمانہ قدیم مین جاپان مین ایک شاعر تھا جس نے اپنے شعر کی خوبی سے متاثر ہو کر اپنی جان دیدی تھی۔ جب تم ایسی نظم کہہ سکتے ہو تو مجھے یقین ہی کہ مکان کے جل جانے کا تم کو غم نہ ہوگا۔" اور واقعہ بھی یہ ہی کہ کسی کا دل اگر اپنے مکان کے خاکستری کے موقع پر آگ کی چنگاریون کو پھولون سے تشبیہ دے، تو حقیقتاً وہ شخص اپنی زندگی شعر مین بسر کرتا ہی۔ غرض اس مثال سے یہ تھی کہ بظاہر انداز بیان نے اس جاپانی شعر کو ہندوستانی مذاق سے جدا کر دیا ہے لیکن اپنی خانہ بربادی پر مسرور ہونے کا مضمون ہمارے یہان پامال ہی۔

ایک جاپانی شاعر (۱۶۹۵ء) کہتا ہی:-

"حیف۔ میرا رازِ محبت آشکارا ہو گیا

(۱) میں سوچا کرتا تھا کہ یہ عالم کسی پر ظاہر نہ ہو سکے گا"

"حیف میری صورت نے میرا رازِ الفت افشا کر دیا

(۲) لوگ متحیر ہو کر پوچھا کرتے تھے کہ تو اُداس کیوں ہا کرتا ہے"

ان ہر دو نظموں کے مضمون مختلف طور پر ہمارے شعرا کے دیوانوں میں بھرے ہوئے ہیں۔ ایک اور جاپانی نظم لیجئے:۔

" چاند میں یہ قدرت نہیں ہے کہ مجھ پر سکوت کا عالم طاری کر دے اور میری آنکھوں سے آنسو نہ نکلیں، مگر افسوس ہے کہ میرے آنسو (نہ معلوم کیوں) اُمڈ کر ان خود بخود نکلے پڑتے ہیں"

یا اس نظم کو دیکھئے:۔

" طوفانِ برف باری میں جو پھول (بسرعت) گر رہے ہیں یہ فی الحقیقت پھولوں کا گرنا نہیں ہے بلکہ میری زندگی کے لمحے مجھ سے جدا ہو رہے ہیں، اور میری زندگی کم ہوتی جاتی ہے"

یہ مضمون میر صاحب انیس اعلی اللہ مقامہ کے شعر سے ملتا جلتا ہے۔

خود نوید زندگی لائی قضا میرے لئے شمع کُشتہ ہوں فنا میں ہے بقا میرے لئے

چونکہ سلسلہ مثال شروع ہو گیا ہے لہذا دو نظمیں اور درج کروں گا جو بذاتہ اپنی لطافت میں دُنیا کے ہر لٹریچر کے لئے مایۂ ناز ہو سکتی ہیں۔

"آج بہار کا دن ہے، آسمان بہرس کر کھل گیا ہے اور آفتاب کی روشنی دور تک پھیلی ہے لیکن پھول کیوں افسردہ ہیں اور کیوں شاخ سے جدا ہو رہے ہیں!"

مندرجہ ذیل نظم مسلسل ہے۔ اس موقعہ پر مجھکو سر ولیم جونز (sir william jones) کا عبرانی شاعری کے متعلق مقولہ یاد آگیا اگر میرا حافظہ میرا ساتھ دیتا ہے تو وہ عبرانی شاعری کی نسبت

میں لکھتے ہیں کہ جبرانی شاعری کی مثال اس درخت کے تنے کی ہے جو سنسان ویرانہ میں ہے۔

"آگ لگ گئی ہے اور وہ تنہا کھڑا ہوا جل رہا ہے"

دیکھو ایک مہجور، مایوس، دل شکستہ، متاع سوختہ، جبران نظم میں انتہائے الم کی حالت میں دنیا لبا ویرانہ میں مثل درخت کے تنے کے کھڑا ہوا آتش دل سے پھک رہا ہے اور اس عالم بیابان میں ایک سنگ پارہ کو اٹھا کر بے اختیار کہتا ہے۔

"میں اس پتھر کے ٹکڑے کو اٹھاتا ہوں جس میں کوئی آواز نہیں ہے اور اپنی دنیا کو آنسوؤں سے تر اور کر دیتا ہوں۔

یہ خیال غلط ہے کہ محبت کی وجہ سے میری یہ حالت ہو گئی ہے مجھے درد دل کی تکلیف نہیں ہے جس کے باعث میں اس تدبیر میں ہوں میری حالت محبت اور درد دونوں کی حد سے گذر چکی ہے جب تنہائی کا سناٹا میرے سینہ میں سما جاتا ہے تو آتش درون سے میرے خیالات کا گوشت جلنے لگتا ہے اور میری آنکھوں سے گرم آنسو بے اختیارانہ نکلتے ہیں

اس وقت نہ مجھ میں نہ اہوتا ہے اور نہ موت ہوتی ہے۔

مجھ پر صرف تنہائی کے سناٹے کا قبضہ ہوتا ہے۔

اب میں اپنی زندگی کے ہاتھوں خود شکار ہوں۔

اور اس دنیائے ناپیدا کنار کو اس خاموش پتھر کی ہمنوائی میں رو کر بھلا رہا ہوں۔

میری حالت جوں جوں خراب ہوتی ہے اس سنگ پارہ کی خاموشی بڑھتی جاتی ہے۔

اور میں اسی طرح اس کو اپنے آنسوؤں سے تر کیا کرتا ہوں۔"

میں اس سلسلہ کو قائم رکھتا لیکن مقصد مضمون فوت ہو جائیگا اور جو سرخی میرے مضمون کی ہے اس سے جدا ہو جاؤنگا۔ اس لئے صرف انہی پر اکتفا کرتا ہوں۔

جاپانی شاعری بھی مختلف اصناف پر منقسم ہے، چونکہ ہر صنف پر لکھنے کے لئے کسی رسالہ کا
حجم درکار ہے اس لئے جو بالکل نئی اور تعجب خیز صنف ہے اس کا کچھ ذکر کرتا ہوں، اس کو "ھکو"
کہتے ہیں، ھکو نظم میں سترہ ٹکڑے ہوتے ہیں اور اپنے اختصار کے باعث نہایت عجیب صنعت ہے
نظم میں بہ مشکل چند الفاظ ہوتے ہیں لیکن ہر لفظ ایسے موقع اور محل سے رکھا جاتا ہے کہ اشارات
اور کنایوں سے بڑے سے بڑا مضمون پیدا کر سکے۔ یہ اشاروں اور کنایوں کا دل آویز مجموعہ
جاپان میں نہایت قدیم اور مقبول ہے، مجموعہ کیا ہوتا ہے مختلف پھولوں کی پتیوں سے ایک گلدستہ
بنایا جاتا ہے جس کی مجموعی خوشبو اور ایک ایک پنکھڑی کی جداگانہ خوشبو دماغ میں مختلف اقسام
کے پھولوں کا تختہ پیدا کر دیتی ہے۔ اس صنعت میں جو نظم ہوتی ہے وہ اپنی نزاکت الفاظ [illegible] بیانی
کے باعث بجائے خود کچھ حقیقت نہیں رکھتی لیکن اس میں یہ تاثیر ہوتی ہے کہ دلوں پر ہلکا سا نشتر
لگا کر خیالات کو کسی بھولی ہوئی چیز، دور از یا صحبت یا نظروں سے اوجھل منظر کی برق وش یاد
دلا کر طبیعت کو بے چین کر دیتی ہے۔ اور یہی اصل شاعری ہے، مندرجہ ذیل نظم ھکو ہے۔

کندا اچی نی
ستونے باکے تاری
یوئی نو ہارو"

اس نظم کو پڑھو ۔ سترہ ٹکڑوں میں بآسانی تقسیم کر سکو گے۔ اس صنعت کا مالک
باشو نامی شاعر ہے جو سترہویں صدی میں زندہ تھا، اس نے اپنی تمام عمر سیاحی میں گذاری، بستر
مرگ پر پڑا ہوا یہ نظم کہتا ہے۔

" سفر میں بیمار پڑا ہوں
مگر میرے خیالات وطن کے ویران کھیتوں میں پھر رہے ہیں۔"

بوسن شاعر کہتا ہی اور کس قدر سچ کہتا ہی انداز بیان دیکھو :-

"بمشکل جو دن کٹتے تھے جمع ہوئے در جمع ہو کر حیف ہی کہ بہت جلد گذر گئے"۔

ناظرین نے اب سمجھ لیا ہو گا کہ ہکو شاعری فی الواقع کسی شے یا کسی واقعہ کی تصویر نہیں کھینچتی ہی اور نہ کوئی خاص لفظی خوبی ہوتی ہی، وہ صرف شاعر کے خیال یا جذبہ کی ایک جھلک دکھاتی ہی اور مختلف طبائع مختلف طریقہ پر لطف اندوز ہوتے ہیں یعنی نظم محض ایک خاکہ یا فریم ہی اور اس کو پڑھنے والا اپنے حوصلہ اور خیال کے مطابق اس میں رنگ بھر کر تصویر طیار کر لیتا ہی۔

ایک جاپانی شاعر کہتا ہی :-

"پورانا تالاب
اس میں مینڈک کودا
ذرا پانی کی آواز سنو"!

سچ یہ ہی کہ حضرت غوک جس طرح آپ کے ملک میں بدنام ہیں - جاپان میں ذلیل و رسوا نہیں ہیں - وہاں ان کی طرح طرح سے خاطر و مدارات ہوتی ہی اور جس طرح یہاں بعض گھروں میں جوڑے پالے جاتے ہیں، اسی طرح ان جناب کی بھی جاپان میں پرورش کیجاتی ہی اور ان کو نہایت ذوق سے دسترخوان کی زینت کا فخر دیا جاتا ہی۔

خیر یہ جملہ معترضہ تھا تنہائی میں مینڈک کا تالاب میں کودنا آواز پیدا کرکے سکوت کو شکست کر دیتا ہی اور دور سے یہ آواز بھلی معلوم ہوتی ہی اور اس نظم سے جاپان کے موسم زمستان کا پتہ چلتا ہی۔

جاپان میں اس نظم کو تقدس کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں، کیونکہ کہا جاتا ہی کہ اس نظم کے بعد شاعر کو اپنی شاعری کا اندازہ ہو گیا اور پھر تمام عمر اسی طریق کی شاعری کا پابند رہا دلغرض

رفع غلط فہمی یہ عرض کر دینا ضروری ہو کہ شاعر نے تمام عمر حضرت نوک کی شان مین قصائد نہین لکھے، بلکہ مقصد یہ ہو کہ اس نے تمام عمر اشارے اور کنائے کی شاعری کی۔)

"کس قدر فرحناک وہ گھنٹی کی آواز ہو

جو گھنٹی سے بھی جدا ہو جاتی ہو"

جو لوگ دور سے گھنٹہ کی آواز سن کر فرق بتا سکتے ہین کہ یہ شب کے وقت یا دن کے وقت کی آواز ہو وہ بآسانی اس نظم کو سمجھ سکیں گے، شاعر کا مطلب یہ ہو کہ موسم بہار میں طلوع آفتاب سے قبل جبکہ ہر شے پر سکون طاری ہو شاعر دور سے گھنٹہ کی آواز سن رہا ہو اور اس آواز کو فرحناک بتاتا ہو اور کہتا ہو کہ وہ آواز گھنٹہ سے بھی جدا ہو جاتی ہو، رات اور دن کے گھنٹے کی آواز مین بھی فرق ہو۔ غرض اس نظم مین شاعر اس لطف کو یاد دلاتا ہو۔

"موسم بہار کی رات

اُف شام اور صبح صادق کا وہ درمیانی عرصہ!"

ھکو شاعری بہتے پانی کی طرح ہو جسمین تم کو خود تمھارا عکس نظر آرہا ہو، اسیوجہ سے وہ ترجمہ سے بے نیاز ہو اور اس کا ترجمہ تقریباً ناممکن ہو۔ ایک جاپانی نقاد اس صنعت کے متعلق کہتا ہو کہ ھکو شاعری شبنم کے قطرہ کی طرح کنول کے سبز پتوں یا پیپل کے سرخ پتوں پر چمکتی ہو شبنم کا وجود کچھ حیثیت نہیں رکھتا۔ لیکن آفتاب کی شعاعوں، اور حرکت کی باعث کبھی ارغوانی کبھی نیلی اور کبھی سچے موتی کے رنگ مین چمکتا ہو۔

یا بالفاظ دیگر ھکو شاعری اُس خانہ عنکبوت کی مانند ہو جس پر بے شمار قطرے شبنم کے لدے ہوئے ہین اور وہ دو شاخون پر تنا ہوا پتون کے سایہ مین ہلکے ہلکے جھکولے لے رہا ہو، کڑی کا جالا کچھ حقیقت نہین رکھتا ہو لیکن اس کے حرکت اور جنبش کی ناقابل بیان خوبی اس لطف کو ظاہر

کرتی ہے جو اس صنعت شاعری سے متعلق ہے۔

کاگاکی مشہور شاعرہ چی یو اپنے لڑکے کی موت پر مرثیہ لکھتی ہے۔

"بھونرے کے پیچھے بھاگتا ہوا

وہ آج کتنی دور نکل گیا ہے!! (کہ) ابتک نہیں لوٹا"

بچہ کا بھونرے کے پیچھے بھاگنا اور بھاگتے ہوئے ماں کی نظروں سے اوجھل ہو کر دور نکل جانا اور پھر ماں کا انتظار کیسے لطیف کنائے ہیں، اور جب یہ شعر ماں کی زبان سے بچہ کی موت کے موقع پر ادا ہو تو کسقدر دلگداز دلدوز اور دل بھر لانے والا کنایہ ہے۔ غالباً ماں کی زبان سے اس سے بہتر معصومانہ اور منتظرانہ اشعار دنیا کا کوئی لٹریچر پیش نہ کر سکے۔ اس وقت مجھے سیفو یونان کی آتشی شاعرہ کا ایک شعر شام کی تعریف میں یاد آگیا جس کا مطلب یہ ہے۔

"شام جو بھیڑوں کے گلہ کو چراگاہ سے واپس بھیجتی ہے اور بچھڑے ہوئے بچے کو اس کی ماں سے ملا دیتی ہے"

صدہا شعرا کے دیوان اس شعر پر قربان ہیں، افسوس کہ اس شاعرہ کا کلام مفقود ہو گیا۔ اس وقت یورپ میں اس کے صرف چند اشعار و مصرعے اور سہ حرفوں کے اجزا موجود ہیں اور جو کچھ محفوظ ہیں غیر فانی ہیں اور کسی قوم اور کسی لٹریچر کے مقابلہ میں نہایت آب و تاب کے ساتھ پیش کئے جاسکتے ہیں۔

میں عنقریب سیفو پر بھی کچھ لکھوں گا۔ اس کے حالات زندگی مختصر ہیں، مگر گذشتہ شاعری کی جو مثال وہ پیش کرتی ہے، اس کی شان کچھ اور ہے۔

غزل

(از جناب لسان الملک مرزا کاظم حسین صاحب محشر لکھنوی)

بھلا ہو لے خدا دستِ جنونِ فتنہ ساماں کا
لکھا کیا با اثر قصہ مرے چاکِ گریباں کا

بیاں ہو دسترس کیونکر جنونِ فتنہ ساماں کا
عدو ہے دامنِ یوسف کا اور میرے گریباں کا

زمانے والے عالم سے جسے تعبیر کرتے ہیں
وہ کیا ہے؟ مختصر قصہ مرے خوابِ پریشاں کا

مصیبت ہو کہ راحت قید ہستی تک جھگڑے ہیں
ہمارے بعد خود ہی قفل کھلجائیگا زنداں کا

کوئی تا حشر پہونچا اکوئی آیا کوہ سینا پر
خدا جانے پتا کس کو ملا تیری شبستاں کا

پر پروانہ جانباز کی شب بھر ہوا کھائی
علاج اچھا کیا اے شمع محفل سوزِ پنہاں کا

یہ کس کی گرم رفتاری نے یا رب وشنی ڈالی
کہ جل اٹھا چراغِ عمر ذراتِ بیاباں کا

خدا ہنستا ہی رکھے کیا کوئی ظلم اور یاد آیا
سبب کھلتا نہیں تیرے تبسم ہائے پنہاں کا

نتیجہ انتظارِ دوست کا آخر میں یہ دیکھا
لہو دامن پہ ٹپکا آنکھ سے جذباتِ پنہاں کا

بشر سر سے قدم تک جامۂ روحانیت پہنے
محالِ عقل ہے پائے نشاں تیری شبستاں کا

نہاں ہے پردۂ دستِ جنوں میں اور ہی قدرت
بہت کم فصل ہے میری رگِ جاں سے گریباں کا

کشاکش ہائے باہم سے مٹی روحانیت محشر
خدا حافظ ہے شیخ و برہمن دونوں کے ایماں کا

گیتانجلی اور فلسفۂ حیات

از

مسٹر آروِن چندر داس گپتا

مترجمہ

سید حسن زاہد صاحب جعفری، منیجر "شمع"

گیتان جلی، رابندرا ناتھ ٹیگور کی بے مثال تصنیف ہی جو اردو داں طبقہ میں اسقدر شہرت پا چکی ہی کہ مزید تعارف سی مستغنی ہی لیکن بدقسمتی سے اردو داں حضرات نے اسکی خاطر خواہ قدر نہ کی حالانکہ جیسے بلند آہنگ نغمے اس مختصر سی کتاب میں ہیں وہ ہر قسم کی ثنا و توصیف سی بالاتر ہیں۔ اس میں انسان کی روح کے بیقرار نالے، انسان کی دنیاوی ہستی کے نالوں کے ساتھ نہایت خوبصورتی کے ساتھ مل گئی ہیں۔ اور جو فلسفۂ حیات اسمیں موجود ہی وہ زمانہ گذشتہ اور زمانہ موجودہ یعنی مشرق و مغرب کے تخیلات کی آمیزش کا عجیب و غریب نمونہ ہی۔

گیتان جلی کے چھوٹے چھوٹے گیتوں میں روحانیت کا نغمہ بھرا ہوا ہی، اور انسانی روح کے متعلق جو کچھ ٹیگور نے لکھا ہی وہ انسانی روح اور خدا کے باہمی تعلقات پر وشنو عقائد کے مطابق ہی جنکی تمثیل کرشن اور رادھا ہیں۔

اُن کا یعنی ٹیگور کا عقیدہ ہی کہ انسان کی روح اللہ تعالیٰ سے خوف زدہ ہو کر گریز نہیں کرتی ہی

بلکہ محبت کے جوش میں اُسکی طرف بڑھتی ہی، اور دونوں کے درمیان میں ایسا گہرا تعلق ہی کہ ایک کے بغیر دوسرے کا وجود ناممکن ہی، اسی باعث ایک کو دوسرے کی تلاش رہتی ہی۔

ٹیگور نے اس خیال کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہی :-

"اے تمام افلاک کے مالک ! اگر میں نہ ہوتا تو تیرا عشق کہاں ہوتا؟" گیتان جلی ۵۶

"میرا اور تیرے چھپ جانے اور پھر مل جانے سے زمانہ کے سب دور گذر جاتے ہیں"

گیتان جلی ۱۷

وشنو عقائد کے مطابق ٹیگور کے یہاں بھی روح اور خدا کو باہم جدائی بہت شاق گذرتی ہی اور وصل میں مسرت حاصل ہوتی ہی۔ دونوں سچے عاشق ہیں اور روح قادرِ مطلق سے ملنے کے لئے ہمیشہ بے قرار رہتی ہی، اور وصل وہجر کی مسرت بخش اور اندوہناک متذبذب درمیانی حالت میں انتظار کرتے کرتے بہت مایوس ہوجایا کرتی ہی۔

"تیرے مس سے میری ہستی جو محض بخارہی نہیں ہٹی، اور اُس نے مجھکو تیری روشنی کے ساتھ نہیں ملایا، اس آرزو مواصلت میں، میں تیری جدائی کے مہینوں اور برسوں کو گنا کرتا ہوں"! گیتان جلی ۸۰

"صرف میں ہی وہ ہوں جو تیرا انتظار کرے گا، روئے گا، اور تیرے عبث اشتیاق میں اپنے دل کو مٹا ڈالے گا" گیتان جلی ۴۱

"اے پیارے! تو مجھے اپنے دروازہ سے باہر انتظار میں کیوں اکیلا کھڑا رکھتا ہی؟"

گیتان جلی ۱۸

یہ خیال کہ انسان کی ترکیب میں اعلیٰ و اسفل اجزا ہیں، اور اسفل جزو انسان کو دنیاوی غلاظتوں کی طرف کھینچتا ہی، اور اعلیٰ جز و تلاش حق کی جانب یعنی آسمان کی طرف لیجاتا ہی ٹیگور

خوبی کے ساتھ مندرجہ ذیل اشعار میں ظاہر کیا گیا ہے:

"میں اپنے معبود کے پاس جانے کے لئے تن تنہا باہر نکل آیا۔ مگر یہ کون ہے جو تاریکی کے سناٹے میں میرے پیچھے پیچھے چلا آ رہا ہے؟ میں اس کے راستے سے ہٹ جاتا ہوں مگر بھاگ نہیں سکتا"

کہا جاتا ہے کہ انسان جب دولت کمانے کے پیچھے پڑ جاتا ہے تو وہ اپنی حقیقی ہستی کو فراموش کر دیتا ہے۔

"مجھے یقین ہے کہ تجھ میں دولت بے حساب موجود ہے اور تو میرا بہترین دوست ہے لیکن میرے دل میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ اس کمرے کے سامان کو جس سے میری کوٹھری بھری ہوئی ہے چھٹکارا حاصل کر سکوں" گیتانجلی [?]

"میں اس بڑی دیوار پر نازاں ہوں اور اس پر خاک اور مٹی کا لیپ کرتا ہوں تاکہ کوئی سوراخ نہ رہ جائے۔ مگر اس فکر اور کوشش میں میں اپنی اصلی ہستی کو بھول جاتا ہوں۔" گیتانجلی [?]

مادے کے پر [?] روح پرور اور دنیا کی آواز پر خدا کے موجود ہونے کا احساس [?] وقت آتا ہے کہ پردہ اٹھ جاتا ہے ہم ان واقعات سے دو چار ہو جاتے ہیں"

"جو پردہ تو نے لگا رکھا ہے اس پر شب و روز کی مختلف تصویریں بنا دی ہیں۔ اس پردہ کے پیچھے تیری نشست ہے جو عجیب و غریب رنگ برنگ کی تصویروں سے بنی ہے"

گیتانجلی [?]

بتایا جاتا ہے کہ انسان کا منتہائے مقصد اپنے اندر خدائی جلوہ کو شناخت کرنا ہے کیونکہ خدا انسان کے قلب میں رہتا ہے لیکن انسان نہیں جانتا کہ اس کے اندر کیا بیش قدر جوہر موجود ہے۔

"مجھے اس وقت علم نہ تھا کہ وہ مقصد قریب تھا اور میرا تھا، اور اس کامل پاکیزگی نے میرے دل کی گہرائیوں میں غنچہ کی صورت اختیار کر لی تھی" گیتانجلی [?]

شاعر کا عقیدہ ہے کہ گہرے استغراق، اور مادّی تعلقات سے جدا ہو کر، انسان اگر اپنی ہستی میں پناہ گزین ہو جائے تو وہ اپنے اندر خدائی جلوہ کو دیکھ سکتا ہے، کیونکہ خدا رتعالیٰ انسانی قلب کے بیچوں بیچ قیام کرتا ہے۔

" رات کی گہرائی میں ہمارے تاریک اور بھیانک گھر کا بادشاہ آیا!" گیتان جلی ۵۱

" جولائی کے مہینہ کے تاریک سایہ میں، تو نظر بازوں کی نظر بچا کر، خاموش رات کی طرح دبے پاؤں چلتا ہے، جنگلوں کے راگ ختم ہو چکے ہیں، اور تمام مکانوں کے کواڑ بند ہیں، اس سنسان راستہ پر چلنے والا بس ایک تو ہے!" گیتان جلی ۲۲

یہ خیال کہ دن کی تیز روشنی اور مادّی دنیا کے شور و شغب میں خدا نہیں ملتا، ٹیگور کے ڈرامہ " اندھیری کوٹھری کا بادشاہ" سے ماخوذ ہے۔

اگرچہ ٹیگور کا عقیدہ ہے کہ خیر محدود کو صرف گہرے دھیان اور گیان سے حاصل کر سکتی ہیں، لیکن وہ سادھوؤں کا بھی مخالف ہے جو اپنی حساس قوتوں کو روکتے ہیں اور دنیا کو ترک کر کے اس کے شور و شغب سے پناہ لینے کے لئے جنگلوں کو آباد کرتے ہیں ٹیگور، زندگی کو پُر مسرت خیال کرتا ہے دنیا میں قیام کرنا بے لطف اور کیف سے خالی نہیں ہے۔ دنیا خدا کے نور سے معمور ہے اور خدا کا مشاہدہ دنیا کی مسرتوں اور اس کے حسن کے اندر ہو سکتا ہے کیونکہ خود دنیا انوار الٰہی کی مظہر ہے۔

" نور! نور! دنیا کو منور بنانیوالا نور، آنکھوں کو چومنے والا نور، دل میں حلاوت پیدا کرنیوالا نور" گیتان جلی ۵۷

" پیارے! پتہ پتہ پر مسرت بے اندازہ، اور تبسم پھیلا ہوا ہے۔ نورانی دریا نے بڑھ کر اپنے کنارے تک غرق کر دئیے ہیں اور مسرت کی طغیانی زوروں پر ہے۔" گیتان جلی ۵۷

"وہی چشمۂ حیات جو میری رگوں میں شب و روز موجزن ہے، دنیا کے ساتھ ہم آہنگ ہوکر بہہ رہا ہے۔" گیتان جلی ۶۹

چونکہ تمام مخلوقات پر خدا کی قدرت کا اثر ہے اس لئے وہ اسکی طرف بڑھتی ہے تاکہ اُس کو پیار کرے۔

"دریا کو اپنی خدمت روزانہ انجام دینی پڑتی ہے اور وہ دیہاتوں اور کھیتوں میں ہوکر بہہ رہا ہے لیکن اسکی مسلسل لہریں تیرے پیر دھونے کے لئے آگے بڑھ رہی ہیں، پھول ہوا کو معطر کر دیتا ہے لیکن اسکی آخری خدمت یہ ہوتی ہے کہ تجھ پر نثار ہو جائے۔" گیتان جلی ۷۵

سنیاسی ترک دنیا کے بعد نجات کا طالب ہوتا ہے لیکن ٹیگور کے عقیدے کے مطابق اس طرح نجات حاصل نہیں ہوتی ہے۔ دُنیا کی لذتوں سے پوری طرح لُطف اندوز ہونا چاہیئے اور کسی حالت میں بھی اپنی قوتوں کو خوشیوں سے محروم نہ رکھنا چاہیئے۔

"اس دنیا کی ضیافت میں میری بھی دعوت ہے، اس طرح پر میری زندگی متبرک ہوگئی ہے۔ اس کو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اپنے کانوں سے سُنا ہے۔" گیتان جلی ۱۶

"نہیں! میں اپنی قوت احساس کے دروازے بند نہیں کرونگا۔" گیتان جلی ۷۳

خدا جب انسان کی تخلیق میں مصروف رہتا ہے تو کیا وجہ ہے کہ انسانُ دنیا سے گریز کرے، محنت میں راحت ہے۔

"ترک دُنیا میرا ذریعۂ نجات نہیں ہے، مسرتوں کے ہزار بندھنوں میں مجھے آزادی حاصل ہوتی ہے۔" گیتان جلی ۷۳

"بلند آواز میں عبادت، اور مالا کا جپنا بند کر، مندر کے تاریک گوشہ میں کواڑ بند کرکے تو کس کو پوج رہا ہے؟ آنکھ کھول، اور دیکھ یہاں خدا موجود نہیں ہے۔" گیتان جلی ۱۱

"جب محنت سے ابر و عرق آلود ہو، تو اُس سے مل اور اُس کا قرب حاصل کر" گیتان جلی ص۱۱

خدا کو کہیں باہر نہ ڈھونڈھو، اس کو دنیا کی مصروفیتوں اور سرگرمیوں میں تلاش کرو، لیکن ایسا نہ ہو کہ دنیاوی فرائض کے چکر میں تم اس کو فراموش کر بیٹھو،

"میری دعا کو قبول کر، اوروں کے ساتھ کھیل میں تو اس ذاتِ واحد کی مس سے مجھے محروم نہ رکھ،" گیتان جلی ص۶۳

ذاتِ باری تعالیٰ پر قطعی بھروسہ رکھنا چاہئے۔

"اپنے بوجھ کو اُس کے سپرد کر، کیونکہ وہی ہر قسم کے بار کو برداشت کر سکتا ہے، اور پیچھے مڑ کر نہ دیکھ،" گیتان جلی ص۹

شاعر کا عقیدہ ہے کہ صرف محنت ہی نہیں، بلکہ محبت بھی جو کہ زندگی کا اعلیٰ ترین اصول ہے قربتِ خدا کا ذریعہ ہے، ذاتِ باری تعالیٰ جو خود عشق ہے محدود اور غیر محدود کے باہمی اتصال سے ایک ہو گئی ہے، اس لئے اگر ہم عشق سے بے پرواہ ہیں تو غیر محدود کی جھلک کو محدود کے ذریعہ سے نہیں دیکھ سکتے ہیں۔

صرف محبت ہم میں حسنِ عالم کے احساس کا جذبہ پیدا کرتی ہے۔ دنیا کو تنگ و تاریک سمجھ کر اُس سے گریز نہ کرنا چاہئے۔ اور بیوی بچوں سے بھاگ کر روحانی ترقی کی فکر نہ کرنی چاہئے کیونکہ انسانی محبت عشقِ الٰہی کی طرف رجوع کرتی ہے۔

"مجھے صرف محبت کا انتظار ہے تاکہ اپنے آپکو اس کے سپرد کر دوں" گیتان جلی ص۱۷

شاعر محض مسرت، اور بے اصول اطمینان کی تعلیم نہیں دیتا ہے وہ انسانی آلام اور مصائب سے بھی خوب واقف ہے، غربا اور نادارون کے لئے بھی اُس کے پاس مژدہ جان بخش موجود ہے۔

"یہ وہ جگہہ ہے جہاں تو اپنا پیر رکھکر اُس کو آرام دے سکے، یہاں دنیا کی غریب ترین،

"دلی ترین، اور کھولی ہوئی مخلوق آباد ہے" گیتان جلی ۱۰

"وہ اس جگہ موجود ہے جہاں کسان سخت زمین کو جوت رہے ہیں، اور سڑک بنانیوالے پتھروں کو توڑ رہے ہیں" گیتان جلی ۱۱

شاعر کا مقولہ ہے کہ ہم کو صبر و شکر کے ساتھ تکالیف اور مصائب کا خیر مقدم کرنا چاہئے۔ کیونکہ سب تب ہی روح کو اخلاقی قوت بخشتے ہیں، اور انہیں کی وساطت سے ہم کو رحمت الٰہی سے قرب حاصل ہوتا ہے۔

"روز بروز تو انکار کر کے مجھے اپنی مکمل قبولیت کے شایان بنا رہا ہے" گیتان جلی ۱۴

"آہ میری ہستی! اسکو کیا مل گیا؟ تیری محبت کی کونسی نشانی اسکو حاصل ہوئی؟ نہ تو پھول ملے، نہ دوائیں دار تیاں، اور نہ خوشبو یات سے لبریز کٹورا! البتہ تیری زبردست تلوار شعلہ کی طرح شرر فشاں ہے اور بجلی کی طرح لپک رہی ہے" گیتان جلی ۵۲

اسی بنا پر موت جو خداوند تعالیٰ کی جانب سے آتی ہے ہمارے لئے خوف کا باعث نہ ہونی چاہئے بلکہ اس کا خیر مقدم کرنا چاہئے۔

"موت جو تیرے احکام کی پابند ہے میرے دروازہ پر کھڑی ہے، وہ نامعلوم سمندر روں کو عبور کر کے تیرا حکم مجھ تک لائی ہے رات اندھیری ہے اور میرا دل دھڑک رہا ہے مگر میں چراغ لیکر اپنے دروازہ کو کھول دوں گا، اور سر جھکا کر اس کا استقبال کروں گا" گیتان جلی ۸۶

اسکا یہ بھی مقولہ ہے کہ ناکامیوں اور خامیوں سے ہم کو ہراساں نہ ہونا چاہئے انسان کی قدر و قیمت کا اندازہ اس کی کامیابیوں سے نہ کرنا چاہئے کیونکہ اس دنیا میں زندگی خود شناسی کا خاتمہ نہیں ہے بلکہ ابتدا ہے۔

رابندر ناتھ ٹیگور کا عقیدہ ارتقا اور انسانی زندگی کی تکمیل کے متعلق مستقل ہے، اور

موت انسانی زندگی کا خاتمہ نہیں ہے بلکہ غیر محدود عالم میں داخلہ کا ذریعہ ہے جو اعلیٰ تر زندگی تک پہونچاتی ہے۔

"پھول گندھ چکے ہیں، اور تیرے دولہ کے لئے ہار تیار ہے، شادی کے بعد دُلہن اپنے میکہ سے چلی جائیگی اور رات کے سناٹے میں اپنے آقا سے بغلگیر ہوگی"۔ گیتانجلی ۹۱

"تو نے مجھے غیر محدود بنادیا۔ یہی تیری مرضی تھی! اس نازک اور ناتوان برتن کو تو بار بار خالی کرتا ہے اور پھر تازہ زندگی سے بھر دیتا ہے" گیتانجلی ۱

غرضکہ اگر مختصراً بیان کیا جائے تو مندرجہ بالا نکات ٹیگور کی گیتانجلی کے فلسفہ میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ اور مشرق کے روحانی نغمہ کو مغرب کی مادیت سے ہم آغوش پاتے ہیں۔ شاعر کا کمال یہ ہے کہ اس نے روح کی اشتہا کو جسم کی مشتہیات سے ملا دیا ہے اور دنیا کو ایک پیغام پہونچایا ہے۔ جو امید محبت، اور ایمان کو محنت اور مسرت سے ہم آہنگ کرتا ہے۔ شاعر کا راگ صرف یہ ہے کہ "دنیا میں رہو لیکن دنیا کے ہو کر نہ رہو"۔

ماں کے حکم کی تعمیل

(از پروفیسر محمد عبدالشکور صاحب ایم۔ اے، علیگ)

مرزا بہادر بیگ مغلیہ فوج کے ایک کارگزار افسر تھے، اُنکی ساری عمر اسی ملازمت میں گذری تھی، اُن کے باپ دادا بھی یہی کام کرتے تھے، اِس لئے یہ یقین کرنا قرین قیاس ہے کہ وہ خدا کی طرف سے جدال وقتال، خونریزی و جنگ جوئی کے لئے ایک خاص صلاحیت لے کر پیدا ہوئے تھے، - یوں کہنا چاہئے کہ مرزا صاحب نے میدان کارزار ہی میں آنکھ کھولی، اور دایہ کی لوری کی بجائے رزمیہ گیت، اور جوشیلے اشعار سُنے، یہی وجہ تھی کہ دُور دُور اُنکی بہادری اور شجاعت کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی، اور اپنے زمانۂ ملازمت میں وہ بارہا فن سپہگری کے جوہر دکھا چکے تھے، ادھر چار پانچ سال سے مرزا صاحب عالمگیر کے ساتھ دکن میں لڑ رہے تھے مگر اس وقت وہ کچھ پژمردہ اور متفکر بیٹھے تھے کچھ تو طبیعت ناساز تھی، اور کچھ عزیز و اقربا کی یاد دل میں برابر چٹکیاں لے رہی تھی، اسی اثنا میں ڈاک کا تھیلا آیا، اُس میں اُنکی ماں کا یہ خط موجود تھا :-

"عزیز از جان من! بعد دعائے دارین کے واضح ہو کہ میں اب تک تین ماہ سے علیل چلی جاتی ہوں، بخار کسی وقت کم نہیں ہوتا، گو علاج برابر جاری ہے، اور ہر قسم کا پرہیز بھی کیا جاتا ہے، مگر اب قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ میری عمر طبیعی ختم ہو چکی، اب میں چراغ سحری ہوں۔ آج مری کل دوسرا دن، اس لئے میں پھر وہی کہتی ہوں جو میں بار بار اصرار سے لکھ چکی ہوں۔ یعنی یہ کہ تمھاری شادی خانہ آبادی کی رسم اگر میرے سامنے ادا ہو جاتی

اور تھیں میں جیتے جی "نوشہ" بنا دیکھ لیتی تو بھر بے کھٹکے مرتی، لہذا تم اس خط کو دیکھتے ہی رخصت لیکر دلی آجاؤ، اور مجھ سے آخری ملاقات کر جاؤ۔ والدعا۔

(تمھاری والدہ)"

اس خط کو پڑھتے ہی مرزا صاحب کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، کچھ غمگین پہلے ہی سے تھے، اس پر طرہ یہ ہوا کہ اس فرشتہ رحمت کا ایسا دردناک خط پہونچا جسکی مہربانیوں اور نوازشوں کی قیمت اس دنیا کا بڑے سے بڑا خزانہ ادا نہیں کر سکتا اس کو دیکھتے ہی بیتاب ہو گئے رخصت کی درخواست لکھکر حاکم بالا کے پاس روانہ کی، اور خود سفر کا سامان درست کرنے لگے، دوسرے روز عرضی افسر جنگ کی خدمت میں پیش ہوئی۔ انھوں نے عرضی دیکھتے ہی مرزا صاحب کو طلب کیا، اور کہا،

" مرزا صاحب! اس وقت آپکا دلی جانا مصلحت کے خلاف ہی، اول تو یہ آپکو معلوم ہی کہ جنگ کیسی شد ومد کے ساتھ جاری ہی، شاید ونادر ہی کوئی دن ایسا جاتا ہی کہ ہمیں لڑنا نہ پڑتا ہو۔ سب متردد اور پریشان ہیں، ہم ایسے زمانہ میں آزمودہ کار اور قابل اعتماد افسران فوج کو کیسے رخصت دے سکتے ہیں، دوسرے آمد و شد کا راستہ نہایت مخدوش ہی، رسد اور ڈاک میں نہایت دقت سی آتی ہی، مرہٹے برابر حملے کر رہے ہیں سینکڑوں بار مسافر مارے جا چکے ہیں۔ آپ نے اس بات پر کافی غور کر لیا ہی؟"

مرزا صاحب ایک خاص متانت کے ساتھ پوری تقریر سننے کے بعد بولے۔

"جناب من! میں نے تمام عمر حضور کا نمک کھایا ہی، میں لڑائی سے جان چرا کر نہیں بھاگتا، میں ان لوگوں میں سے ہوں جو سپہ سالار اور بادشاہ کے خاطر ہمیشہ سر بکف رہتے ہیں، مگر یہ ناممکن ہی کہ میں ماں کے آخری مرتبہ قدم نہ چوموں، انکی خدمت اور ان کے

احکامات کی تعمیل میں سکر لئے اور تین فرض ہی میں صرف تین ماہ کی رخصت مانگتا ہوں، اور تقریباً دو ماہ آمد ورفت میں صرف ہوں گے، رہا راستہ کا سوال، سو مان کی خاطر میں ستر مرتبہ گردن کٹوانے کے لئے تیار ہوں"۔

انسر جنگ نے جلد محسوس کر لیا کہ مرزا صاحب کو اس وقت کوئی قوت دلی جانے سے باز نہیں رکھ سکتی، پھر ماں کے آخری دیدار کا مسئلہ تھا سمجھ میں آگیا کہ انکو اس وقت روکنا مناسب نہیں ہے اور وہ جا۔ انہیں رخصت منظور ہی کرنا پڑی، مرزا صاحب شاداں و فرحاں مکان واپس آئے اور دوسرے ہی روز دلی کو روانہ ہوگئے۔

اُس زمانہ میں چونکہ لڑائی بہت زوروں پر تھی اور مرہٹے بے در پے شبخون مار رہے تھے اس لئے یہ سفر نہایت خطرناک اور مشکل تھا۔ ایک دو سوار تن تنہا جانے کی کبھی ہمت نہ کرتے تھے دستور یہ تھا کہ سرکاری ڈاک کے ساتھ فوج کا ایک مضبوط دستہ ہوتا اور اسی کے ساتھ مسافر ہوتے تھے اور اس طریقے سے بعد وقت لیا دشمنوں سے بچتے ہوئے اور قلعوں کی توپوں کی زد میں پناہ لیتے ہوئے دلی کی طرف جاتے تھے۔ مرزا صاحب بھی اسی شان کے ساتھ روانہ ہوئے اُن کو دلی پہونچنے کی بہت عجلت تھی انکی ماں بیمار تھیں اور غالباً انکی یہ علالت بیماری موت تھی اس لئے وہ جانتے تھے کہ جلد سے جلد دلی پہونچیں اور اُن کے دیدار فرحت آثار سے مشرف ہوں۔ مرزا صاحب اپنے گھوڑے پر سوار آہستہ آہستہ آگے تھے اور یہ چھوٹا سا قافلہ معہ فوجی دستہ کے پیچھے پیچھے آرہا تھا۔ وہ اس وقت تنہا نہ تھے اُن کے ساتھ رستم خان گھوڑے پر سوار تھا اور دونوں صبح کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا میں باتیں کرتے چلے جارہے تھے رستم خان شاہی توپخانہ کا ذی اقتدار افسر تھا وہ بھی سرکاری کام سے دلی جارہا تھا۔ مرزا صاحب بہت خوش تھے کہ ایسے طویل سفر کے لئے انہیں ایک خوش مذاق

ساتھی مل گیا جسکی وجہ سے راستہ اچھی طرح کٹ سکتا تھا۔

گرمی کا موسم تھا اور رفتہ رفتہ دھوپ تیز ہوتی جاتی تھی آخرکار دوپہر کی حدت کیوجہ سے مسافر اور گھوڑے دونوں پسینے پسینے ہونے لگے اور اسکی ضرورت محسوس ہوئی کہ اگلی گڑھی پر جلد پہونچکر قیام کریں اور کچھ آرام کرنے کے بعد دوسری منزل طے کریں، مگر ابھی دوسری گڑھی نسبتاً دور تھی اور آفتاب کی گرمی برابر بڑھتی جاتی تھی اسی دوران میں رستم خان نے اپنے ساتھی سے کہا۔

" مرزا صاحب! گرمی بہت زوروں پر ہے۔ میرا گھوڑا برابر ہانپ رہا ہے گڑھی ابھی دور ہے آئیے ہم آپ آگے بڑھ چلیں، ہم دونوں مسلح ہیں اور یہاں کچھ خطرہ بھی نہیں معلوم ہوتا۔"

مرزا صاحب :" واقعی گرمی کی وجہ سے پریشان تو میں بھی ہوں مگر زمانہ بہت خراب ہے اور مرہٹے گروہ گروہ، ہر گھاٹی میں موجود رہتے ہیں۔"

رستم خاں :" مرزا صاحب ایسی بھی بزدلی کیا، آخر ہم دونوں بھی تو مسلح ہیں۔"

مرزا صاحب :" مسلح ضرور ہیں مگر صرف ہم دونوں۔ خدا برے وقت سے بچائے کیا کرسکینگے؟"

رستم خان :" اجی خدا پر نظر رکھئے ہم نے اور آپ نے تو بارہا میدان جنگ دیکھا ہے ہمت کر جائیے!"

مرزا صاحب :" میں طیار ہوں مگر یہ سراسر مصلحت کے خلاف ہے مجھے آپ کم ہمت نہ سمجھیں مگر دور اندیشی بھی کوئی چیز ہے۔"

رستم خان کی ہمت دلانے اور اصرار سے آخرکار مرزا صاحب آگے بڑھنے کے لئے طیار ہوگئے گرمی بھی بہت زیادہ ہوگئی تھی جسکی وجہ سے دونوں سوار پسینہ میں شرابور

ہو رہے تھے، دونوں نے گھوڑوں کو ایڑھ لگائی اور تیزی کے ساتھ آگے بڑھنے لگے،

دونوں سوار گھوڑوں پر تیز جا رہے تھے اور چاروں طرف نگاہیں ڈالتے جاتے تھے سطح ہموار تھی اور انکی نگاہیں کئی کئی میل کا جائزہ لے سکتی تھیں مگر آگے چلکر ہموار میدان ختم ہوگیا اور اُن کا راستہ ایک تنگ گھاٹی میں ہو کر گذرا جس کے دونوں جانب اونچی اونچی پہاڑیاں تھیں وہاں پہنچکر دونوں رک گئے اور رستم خان نے کہا میں پہاڑی کے اوپر ہو آتا ہوں شاید مرہٹے یہاں کہیں دبے بیٹھے ہوں ورنہ ممکن ہے کہ ہم ایک قدم بڑھاتے ہی جال میں پھنس جائیں۔ یہ دیکھکر رستم خان آن واحد میں پہاڑی پر چڑھ گیا اور دس منٹ میں لوٹ آیا۔ مگر اسکی حالت بالکل متغیر تھی اُسکی آنکھوں سے وحشت اور خوف ٹپک رہا تھا اُس نے اپنے ساتھی کو تیزی کے ساتھ لوٹنے کا اشارہ کیا مگر قبل اس کے کہ یہ دونوں لوٹیں مرہٹوں کی ایک جماعت آن پہونچی اور لڑائی شروع ہوگئی۔ دونوں کے گھوڑے زخمی ہوئے اور مرزا صاحب معہ اپنے ساتھی کے گرفتار کر لئے گئے۔

---

(۳)

مرزا صاحب۔ "کہئے خانصاحب کیسے برے پھنسے کہ اب نہ پائے رفتن ہے نہ جائے ماندن"۔

رستم خان۔ "دراصل اسوقت پیشقدمی کرنا سراسر مصلحت کے خلاف تھا"۔

مرزا صاحب۔ "مگر اب رہائی کی کیا صورت ہے"؟

رستم خان۔ "یہاں تو کوئی صورت نظر نہیں آتی لمہار راؤ کہتے تھے کہ دس دس ہزار روپیہ ادا کردو ورنہ ایک ماہ کے اندر ہم دونوں قتل کر دیئے جائیں گے"۔

مرزا صاحب "۔ یہ کثیر رقم کہاں سے آئیگی؟ یہ ممکن ہے کہ ہم دونوں دلّی چلے جائیں اور وہاں سے روپیہ فراہم کرکے بھیجدیں۔"

رستم خان "۔ یہ تجویز ہرگز نہ مانیں گے۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ مکانوں کو خط لکھدو اور روپیہ منگوالو۔"

مرزا صاحب "۔ خط لکھنے سے کوئی روپیہ نہیں بھیجیگا۔"

اس گفتگو کے بعد دونوں ساتھی موٹے موٹے کمبلوں پر لیٹ کر سونیکی ناکام کوشش کرنے لگے، رات کا وقت تھا ایک ضعیف چراغ اُس تیرہ و تاریک کمرہ میں ٹمٹما رہا تھا جسمیں یہ دونوں بدقسمت قیدی بند تھے اُن کے ہاتھوں میں لوہے کی مضبوط ہتکڑیاں پڑی تھیں اور پاؤں بیڑیوں کے جکڑ بند میں مقید تھے دونوں اپنی اپنی مصیبت کا دلخراش اندازہ کرکر کے آہیں بھرتے اور اپنی بدنصیبی پر آنسو بہاتے جاتے تھے قسمت کا یہ انقلاب کیسا درد آفرین اور اندوہناک تھا!! دنیا کی یہ دو بدنصیب ہستیاں اسی کشمکش میں مبتلا تھیں کہ دروازہ کا قفل کھلتا ہوا معلوم ہوا اور لمبا تڑنگا اس مرہٹی گروہ کا سردار معہ اپنی چند ساتھیوں کے اس کوٹھری میں داخل ہوا۔ اور بولا۔

"خانصاحب و مرزا صاحب آپکو معلوم ہے کہ آپ آپ ہمارے ہاتھ میں قید میں۔ آپکی رہائی صرف اسی طریقہ سے ممکن ہے کہ آپ دس دس ہزار روپیہ ایک ماہ کے اندر ادا کریں مگر چونکہ آپ ذی عزّت ہیں اس لئے کل صبح سے آپکی بیڑیاں اور ہتکڑیاں اُتار دیجائینگی۔ اور اجازت ہوگی کہ آپ اس چھوٹی سی آبادی کی وسعت میں چل پھر سکیں جہانتک ممکن ہوگا آپکو کوئی اذیت نہ پہونچائی جائیگی مگر روپیہ کا جلد بندوبست کیجئے کل خط روانہ کرکے ہمیں اطمینان دلائیے کہ یہ رقم اتنی مدت میں آجائیگی۔"

مرزا صاحب "ہم دونوں آپکی نوازش کے بہت احسانمند ہیں مگر روپیہ کا بند وبست صرف خط کے ذریعہ سے محال ہے۔"

ملہار راؤ "پھر اور کیا صورت ہوگی؟"

مرزا صاحب "واقعہ تو یہ ہے کہ ہم دونوں بغیر دلی گئے روپیہ نہیں دے سکتے مگر کل ہم خطوط لکھدینگے اور خدا کرے ارشاد کی تعمیل ہو جائیگی۔"

ملہار راؤ "ایسی صورت میں رہائی ناممکن ہے۔"

مرزا صاحب "ہم خطوط لکھنے کے لئے طیار ہیں۔"

ملہار راؤ "کل ضرور لکھدیجئے۔"

رستم خان "بہت خوب۔"

ملہار راؤ رخصت ہوا اور پھر کنج قفس میں وہی بیکسی اور بےبسی کا عالم طاری ہوگیا۔

چراغ ٹمٹما رہا تھا اور مغلیہ فوج کے دونوں افسر تصویر یاس بنے ہوئے بیٹھے تھے۔

رستم خان "خدا کا شکر ہے کہ صبح سے ہتکڑیاں اور بیڑیاں تو کھلیں اور آبادی میں نکلنے بیٹھنے کی اجازت مل گئی۔"

مرزا صاحب "ہاں یہ بہت اچھا ہوا ورنہ میں اس اندھیری کوٹھری میں جلد دفن ہو چکا ہوتا یہاں کیسا حبس اور کیسی گرمی ہے میرا دم گھٹا جاتا ہے۔"

رستم خان "واللہ اگر یہاں چار پانچ روز اور رہنا ہوتا تو ہم دونوں مر چکے ہوتے۔"

مرزا صاحب "باہر نکلنے کے بعد شاید کوئی مفید مطلب تدبیر نکل سکے۔"

--- (باقی) ---

(۱۳)

گرمی کا موسم تھا ، شدید گرمی ، کا ، راتیں نہایت مختصر اور دن ضرورت سے زیادہ طویل ہوتے ہین حالانکہ دونون بہت خستہ حال اور شکستہ مزاج تھے ۔ مگر گرمی کی شدت کی وجہ سے ذرا بھی نہ سو سکے کئی گھنٹے بعد کوٹھری میں روشنی نمودار ہوئی معلوم ہوگیا کہ شب آخر ہوئی اور آفتاب عالمتاب نے صفحہ دہر پر ضیاپاشی شروع کر دی اس روشنی کے ساتھ ساتھ پرندون کے چہچہے اور تازہ تازہ ہوا کی مشام نواز جھونکون کے فرحت بخش اثرات اس کوٹھری میں پہونچنے لگے ۔ مرزا صاحب اور رستم خان لیٹے سے اٹھ بیٹھے اور مقفل کواڑ دن کے سوراخون مین سے جھانکنے کی نیم کامیاب کوشش کرنے لگے ۔ سامنے ان کو ایک بلند پہاڑی نظر آئی جس کا گوشہ گوشہ پود دن اور بیلون سے آراستہ تھا ۔ پہاڑی کے دائین جانب ایک خام سڑک نظر پڑی جس کے کنارے کنارے مرہٹون کے جھونپڑے واقع تھے صبح کی روشنی نمودار ہونے کے ساتھ ساتھ ان جھونپڑون مین بھی آثار حیات واضح ہو چلے اور ہر طرف چہل پہل شروع ہوگئی نوگرفتاران قفس جھونپڑ دن کے کتوں اور بکریون پر اشتیاق آمیز نگاہین ڈال رہے تھے جن کو چلنے پھرنے بھاگنے دوڑنے اور کھانے پینے کی کامل آزادی حاصل تھی ۔ اور جو صبح کی دلکش فضا میں ادھر ادھر ٹہل ٹہل کر وقت گذار رہے تھے ۔ مرہٹوں کے اس گروہ میں کوئی ایسا سپاہی نہ تھا جو ان بوالہوسون کی نقل و حرکت پر نظر رکھتا اور انکو ایک لاچار قیدی سمجھتا ۔ اسی اثنا میں دروازہ کھلا دونون قیدیون کی بیڑیان وغیرہ جدا کی گئیں اور دونون باہر لائے گئے یہ نقل مکانی ان قیدیون کے لئے کیسی نشاط انگیز تھی ۔ کہاں وہ کال کوٹھری جسمیں نہ ہوا کا گذر اور نہ روشنی کا ۔ نہایت گرم دم گھٹنے والی اور

رُوح کو اذیت پہونچانے والی یا یہ عالم تھا کہ سامنے ایک حسین و جمیل پہاڑی تھی نہایت نظر نواز اور پُشت پر دریائے نربدا سنگ مرمر کے دلفریب ٹکڑوں کو اپنی آغوش میں لئے ہوئے موجیں مار رہا تھا۔ مرزا صاحب اور رستم خان ایسے دلکش مناظر کو دیکھکر نہایت خوش ہوئے مگر قید کے تخیل نے اُن کے جذباتِ مسرت کو جلد ختم کردیا اور اُنکو اپنی بے بضاعتی کا نہایت تلخ احساس ہوا۔ ساتھ ہی اُنکو مسلح سپاہی دُور سے نظر پڑے جو اغلباً اُن کی نقل و حرکت پر برابر نظر جمائے ہوئے تھے۔

اُسی روز زبردستی مرزا صاحب اور رستم خان کو روپیہ کی طلبی کے لئے خطوط لکھنا پڑے مگر مرزا صاحب کو امید نہ تھی کہ اس خط پر ایسی کثیر رقم آ جائیگی یہ خطوط لکھوا کر ٹھاکر راؤ نے اپنے قبضہ میں لے لئے گویا وہ بیس ہزار روپیہ کی دو ہنڈیاں تھیں اور قیدیوں سے مخاطب ہوکر خوش مزاجی کے لہجہ میں کہنے لگا۔

"میں نے آپکی شرافت پر بھروسہ کرکے آپکو قید خانہ سے باہر نکالا ہے میں جانتا ہوں کہ آپکو رہائی کی بڑی تمنا ہے یہ تقاضائے فطرت ہے میں خود آپکی جان لینا نہیں چاہتا۔ آپ آج اس رقم کا بندوبست کر دیں تو آج ہی جا سکتے ہیں ایسی حالت میں اگر آپکو میں نے بھاگنے کی کوشش کرتے ہوئے پایا تو میں آپکا سخت ترین دشمن ہوجاؤنگا۔ لہذا آپکو چاہیئے کہ آپ اس آبادی میں جہاں آپکا جی چاہے چلیں پھریں۔ دو مُستعد سپاہی آپکی خبرگیری میں ہر وقت مصروف رہیں گے۔ اور رات کو آپ اسی کوٹھری میں بند کر دئیے جایا کریں گے۔ مجھے امید ہے کہ آپ میرے اعتماد سے ناجائز فائدہ نہ اُٹھائیں گے"۔

رستم خان پر اس تقریر کا بہت گہرا اثر ہوا اور اُس نے اپنے ساتھی سے ٹھاکر راؤ کے جانے کے بعد صاف صاف کہدیا کہ آپ چاہیں تو رہائی کی تدبیریں سوچیں مگر میں

یہیں رہوں گا اور دس ہزار روپیہ ادا کئے بغیر یہاں سے قدم نہ اٹھاؤں گا۔ ملہار راؤ نے ہم پر بھروسہ کیا ہے چاہئے کہ ہم اُسے دھوکہ نہ دیں۔ مرزا صاحب یہ تقریر سنکر دنگ رہگئے اور انھوں نے بار بار رستم خان کو سمجھانا چاہا کہ وہ اس ارادہ سے باز آئیں لیکن بے سود ہوا۔ اُنھوں نے آخر کار ر جبکر خانصاحب سے صاف صاف کہدیا کہ آپ یہاں رہئے میں تو نکل بھاگنے کی تدبیر سوچ رہا ہوں جسوقت موقع ملے گا بھاگ جاؤں گا۔ آپ اگر میرا ساتھ دیتے تو ایک اور ایک گیارہ ہوجاتے مگر خیر اب میں تن تنہا کوشش کرتا ہوں اگر نکل گیا تو ماں کی زیارت ہوجائیگی ورنہ یہ حسرت دل کی دل ہی میں رہیگی میں خود ملہار راؤ کی شرافت کا معترف ہوں اور یقیناً اُسکی شرافت کا جواب شرافت ہی سے دیتا مگر اس وقت مجبور ہوں۔ ماں کی محبت مجھے بیچین کئے ہوتے ہے۔

(۴)

ان دونوں قیدیوں کو اس کوردہ میں رہتے ہوئے پورا ایک ماہ گذر گیا۔ مگر نہ روپیہ فراہم ہوسکا نہ بھاگ نکلنے کی کوئی تدبیر ہاتھ آئی۔ مرزا صاحب نے جلد محسوس کرلیا کہ نظر بندی پوری مستعدی سے کی جاتی ہے اور اس لئے آسانی کے ساتھ فرار ہونا محال ہے۔ مگر رفتہ رفتہ حالات ایسے رونما ہونے لگے جن سے اُنکو کچھ ہمت ہوئی، اور اسی وجہ سے وہ کافی احتیاط کے ساتھ شب و روز اسی اُدھیڑبن میں لگے رہتے تھے، تھوڑے ہی عرصہ میں مرزا صاحب اُس مختصر سی آبادی سے بہت کچھ روشناس ہوگئے۔ اور لوگوں میں بلا پس و پیش اُٹھنے بیٹھنے لگے، اور جلد وقعت اور احترام کی نگاہوں سے دیکھے جانے لگے، مگر اُن کو وہاں کئی قسم کی تکلیفیں تھیں، مثلاً، کھانا نہایت ناقص اور بے حلاوت

ہوتا، روٹیاں نہایت کثیف اور موٹی موٹی بے مزہ ہوتی تھیں، اور کبھی کبھار خود اپنے ہی ہاتھ سے پکانا پڑتی تھیں، مرزا صاحب اور رستم خان دونوں یہ ناکافی اور ناموافق غذا کھاتے شکر ایزدی بجا لاتے، اور غور کر لیا کرتے کہ ابھی تو ہم قیدی ہی ہیں ہمیں شکایت، اور شکوہ کا حق نہیں، رستم خان کو اپنی ساتھی کے برخلاف امید تھی کہ اس کے گھر سے روپیہ آجائیگا، اور وہ رہائی حاصل کریگا، اسی وجہ سے وہ بالکل تن تنہا کھیت کی منڈیر، دریا کے کنارے پر یا چہ بچہ کے پاس بیٹھا رہتا، اور روپیہ کی آمد کے ایام شمار کرتا رہتا، آبادی سے اسے کوئی سروکار نہ تھا، وہ صرف یہ جانتا تھا کہ مرزا صاحب لوگوں میں خوب شیر و شکر ہوگئے ہیں، اور بھاگ نکلنے کی گھات میں ہر وقت دماغ پر زور دیتے رہتے ہیں۔ مگر اس جدوجہد میں وہ اپنے ساتھی کے شریک کار نہ تھا، اس کے برخلاف خاموش، ساکت، متین اور سنجیدہ، نہ منہ سے بولتا نہ سر سے کھیلتا، مرزا صاحب بالطبع نہایت شریف مزاج، اور دوست نواز واقع ہوئے تھے۔

ماں کی محبت ان کے دل پر نقش کالحجر کی طرح ثبت تھی، کیا صبح کیا شام ان کو یہی دھن تھی کہ کسی طرح دلّی پہونچوں، اور ماں کے قدم لوں، مگر موقعہ ہاتھ نہ آتا تھا، تجربہ کار آدمی تھے، یہ بھی ممکن نہ تھا کہ نیم پختہ اسکیم پر کاربند ہو کر پھر گرفتار ہوتے، اور جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے، اول تو مرزا صاحب خود ملنسار آدمی تھے، مگر یہاں ضرورتاً انھوں نے مرہٹوں کے ساتھ بہت زیادہ ارتباط برتنا شروع کیا، بچوں کو مٹی کی مورتیاں اور گڑیاں بنا دیتے، ملہار راؤ کے باغیچہ میں پانی دیتے اور گھاس کاٹنے لگتے، تعویذ گنڈے، اور جھاڑ پھونک کا سلسلہ بھی انھوں نے شروع کر دیا، اور اسمیں حیرت انگیز کامیابی حاصل کی۔ نام نہاد دوا بھی مہیا کر لیں اور ساٹھ ستر فیصدی مریضوں کو شفا ہونے لگی، لوگوں میں نہایت ہر دلعزیز ہو گئے، اور مرہٹوں کو ان سے ایک خاص قسم کی محبت ہو گئی۔

مرزا صاحب نے ایک روز ایک خوبصورت سی گڑیا بنائی، اور اُس کو اچھے اچھے کپڑے پہنائے، اور علی الصباح اپنی کوٹھری کے سامنے رکھکر علٰحدہ بیٹھ گئے، اس کوٹھری کے قریب ہی ایک کچّا کنواں تھا، جہاں دن رات اُس حصّہ آبادی کی عورتیں آتیں، اور اپنے گھڑے بھر کر لیجاتیں۔ لمبار راؤ کی لڑکی جس کی عمر چودہ پندرہ سال کی ہوگی وہ بھی اس کنوئیں پر دن میں دو تین مرتبہ آتی، اور پانی بھر کر لیجاتی، اس لڑکی کا نام رتن تھا، نہایت رحمدل منکسر مزاج، سیرچشم، اُس نے بارہا مرزا صاحب اور رستم خان کو دیکھا، اور انکی حالت پر کفِ افسوس ملے، مرزا صاحب پر اُسکی خاص عنایت تھی، اکثر وہ اچھی اچھی روٹیاں اور پھل اپنے گھر سے چھپا کر لاتی، اور مرزا صاحب کو دیجاتی، مرزا صاحب شکریہ کے ساتھ لے لیتے، اور مٹی کی مورتیاں، کپڑوں کی گڑیاں بنا بنا کر رتن کو دیتے، اور کہا کرتے "افسوس! آج میں قیدی ہوں، ورنہ تیری مہمان نوازی کا شکریہ پورے طریقہ سے ادا کرتا"۔ رتن اس تقریر کو نہ سنتی اور جلد واپس چلی جاتی۔ مرزا صاحب اکثر افسوس کیا کرتے کہ کیسی لاچاری اور بے بسی ہے، یہ بیچاری رتن محض ازراہ ترحم چھپ چھپا کر سب کی مرضی کے خلاف پھل پھلاری لے آتی ہے، جس سے ذرا تسکین ہو جاتی ہے۔ ورنہ ایسی روٹیاں کھا کر کیسے زندہ رہتے، مگر وائے ناکامی! ہم اس لائق بھی نہیں ہیں کہ اس معصوم لڑکی کی عنایت کا نعم البدل مہیا کر سکیں کیسی شریف، رحمدل، فرشتہ خصلت لڑکی ہے جو لاوارث قیدیوں پر رحم کھاتی ہے، اور نڈر ہو کر انکی خدمت کرتی ہے، فیاض اور کریم النفسی کی یہ محیر العقول مثال کیسی سبق آموز ہے؟

مرزا صاحب جب کبھی رتن کو دیکھتے تو بیخود ہو ہو کر جھومنے لگتے، اور اپنی صناعی کے بہتر سے بہتر نمونہ گلہائے عقیدت کی طرح اُس کے آستانۂ بے نیاز پر نثار کرتے، وہ اُن کو اعجوبۂ روزگار سمجھکر اُٹھا لیتی، چومتی، اور سینہ سے چپٹا کر مکان کی جانب تیزی سے لوٹ جاتی۔

آج بھی مرزا صاحب نے ایک نہایت عمدہ گڑیا تیار کی ۔ اور حتی المقدور عمدہ سے عمدہ کپڑے اس کے زیب تن کئے ، اور اس انتظار میں بیٹھے کہ رتن آئے ، اور اس کو یہ تحفہ دیں ، چنانچہ حسب معمول رتن آئی ۔

مرزا صاحب " رتن ! لو ۔ یہ گڑیا ہم نے تمھارے لئے بنائی ہے "

رتن نے گڑیا لے لی ، اور شرم سے گردن نیچی کر کے اپنے نقرئی کڑوں کو بار بار بلا قصد پھرانے لگی ، یہ نہایت تعجب انگیز بات تھی کہ آج سے قبل رتن نے مرزا صاحب سے کبھی کوئی بات نہ کی ، گویا اس کے لبوں پر ایک مہر سکوت ثبت تھی جسکو توڑنا فرشتوں کے بھی دائرہ امکان سے باہر تھا ۔ اسکی زبان سے اسکی سیاہ پتلی والی لانبی لانبی آنکھیں زیادہ فصیح تھیں ، جن میں محبت کے ساتھ ساتھ تشکر و امتنان ترحم و ترس کے جذبات موجزن تھے ، آج مرزا صاحب سے نہ رہا گیا دل بے قابو ہو رہا تھا ، جذبات امنڈ رہے تھے ، رتن کا ہاتھ پکڑ کر بولے ،

" رتن ! یہ کیا بات ہے کہ تم سارے جہان سے بولتی ہو ، مگر میرے سامنے ہمیشہ خاموش رہیں " رتن نے آنکھیں نیچی کر لیں ۔

مرزا صاحب ! " پھر چپ ہو ؟ "

رتن ۔ (بڑی کوشش کر کے) " مجھے شرم آتی ہے "

مرزا صاحب ۔ " مجھ سے شرم آتی ہے ، مجھ سے ؟ یہ آخر کیوں ؟ "

رتن خاموش رہتی ہے ۔

مرزا صاحب " میں تمھارا بندۂ بیدرم ہوں ، تم نے میرے اوپر بڑے بڑے احسانات کئے ہیں جسکا شکریہ ادا کرنا میرے امکان سے باہر ہے "

رتن " ۔ احسانات کا ہے کے (نظریں نیچی کر کے) شکریہ کس بات کا ! "

مرزا صاحب - واہ!! احسان کرکے بھول جانا تمھارا ہی کام ہی۔ اب ایک ضروری اور نہایت خفیہ بات کرتا ہون، مجھے پوری امید ہی کہ تم میری مدد کروگی۔"

رتن :"وہ کیا بات ہی؟"

مرزا صاحب:" دلی میں میری پیاری ماں سخت بیمار رہیں۔ کیا تعجب ہی کہ ابتک گذر چکی ہون، میرا دل نہایت بیتاب ہی، میں جلد سے جلد وہان پہونچنا چاہتا ہون، شاید مجھے اُن کی زیارت ہوجائے۔"

رتن:" میں تمھاری کیسے مدد کرسکتی ہون۔"

مرزا صاحب:" تم مجھے یہان سے نکلوا دو۔"

رتن:" یہ تو بڑا مشکل کام ہی، دو سپاہی تمھارے اوپر ہر وقت طیار رہتے ہین، اُنکی آنکھون مین کیسے خاک ڈالی جائے؟"

مرزا صاحب:" تم یہان کی راجکماری ہو، بھلا ایسا ہوسکتا ہی کہ جو تم چاہو، وہ نہ ہو۔"

رتن:" اچھا، اب بھی دیر ہوتی ہی، زیادہ دیر نہین ٹھہر سکتی، مین سوچ کر تدبیر نکالون گی، شاید کوئی صورت نکل آئے، مگر خطرہ ضرور ہی۔"

مرزا صاحب:" خطرے سے نہ ڈرو، مین اب زیادہ یہان قیام نہین کرسکتا، اس کوشش مین اگر جان بھی چلی جائے تو کچھ ہرج نہیں۔"

رتن:" اچھا، میں کل پھر اسی وقت آؤن گی۔"

---

(۵)

قسمت نے آج مرزا صاحب کو یہ نادر موقع دیا کہ رتن اُن سے پہلی مرتبہ صرف ہمکلام ہوئی

بلکہ ایک ایسا افسون کیونک گئی جس نے مرزا صاحب کے دل و دماغ پر ایک بیخودی اور وارفتگی کا عالم پیدا کر دیا احساسات خفتہ بیدار ہو چلے اور محبت کے وہ شرارے جو ابتک خاکستر دل میں مخفی تھے چمک چمک کر تن بدن میں شعلہ زن ہوتے گئے۔ ابتک مرزا صاحب صرف جسمانی طور سے مقید تھے مگر اب ان کا دل اور ان کا دماغ اور انکی روح اس کے قبضہ قدرت میں تھی اور لاعلمی میں راجکماری منیہ موہنی کے اس افسر کو جس نے بڑے بڑے شوربا بہادروں کو نیچا دکھایا تھا بے قابو کر چکی تھی۔ اس پہلی ملاقات کے بعد مرزا صاحب کو معلوم ہوا کہ رتن سے ان کو صرف طفلانہ ہی انس نہیں ہے بلکہ وہ اس کو دل سے چاہتے ہیں اور اس کی شمع حسن پر پروانہ وار فدا ہونے کے لئے طیار ہیں۔ اس حیرت انگیز انکشاف نے مرزا صاحب کو کچھ مبہوت سا کر دیا، اوّل تو وہ کچھ عشق و محبت کے قائل نہ تھے اور سانس عمر میں انکو عورتوں سے کوئی دلچسپی نہ رہی تھی دوسرے وہ دل ہی دل میں یہ بھی کہتے تھے کہ نادان دل کیسے نہوٹ زلف شکیں میں جا پھنسا جو کسی طرح ان کے قبضہ میں نہیں آسکتا وہ بار بار سوچتے تھے میں دل میں عالمگیر صاحب قرانی کے لشکر جرار کا افسر اور یہ ایک مرہٹے سردار کی بیٹی دونوں برسرپیکار ایک دوسرے کے جان کے دشمن اس اتحاد کا خیال ہی کیسا مضحکہ انگیز اور ناممکن الوقوع تھا!! مگر دل حزین نہایت بیتاب تھا اور بعید مطلب اکثر دیکھا گیا ہے کہ سوسائٹی کے وہ افراد جو صنف لطیف سے دور دور رہتے ہیں کسی کے زلف عنبرین میں پھنسنے کے بعد انکی حالت سب سے زیادہ قابل رحم اور درد آفرین ہو جاتی ہے کسی پہلو اور کسی عنوان ان کو چین نصیب نہیں ہوتا۔ ان کا عشق ابتدائی مراحل طے کرنے کے بعد اسقدر جلد تکمیل کو پہونچ جاتا ہے کہ دیکھنے والے الامان والحفیظ پکار اٹھتے ہیں۔ بیچارے مرزا صاحب پر بھی یہی واردات گذرتی۔ آجتک وہ ہمیشہ تیر و تفنگ نیزہ و تبر کے شیدائی رہے اور میدان کارزار کو اپنا بستر راحت سمجھتے رہے اب یہ حالت تھی کہ اول تو رات کو نیند نہ آتی مگر جب کبھی

ذرا آنکھ لگتی تو رتن کی تصویر خیالی اور فرضی ہمکلامی اُن کو بار بار چونکا دیتی دُنیا و مافیہا اُنکی نگاہ مین تاریک تھی اور وہی قید اور تکالیف نظربندی جو اس سے بین اُن کے نئے سوہان رُوح تھین اب نہ صرف ذریعہ مسرت بلکہ وجہ حیات ثابت ہونے لگیں کیونکہ رہائی پانے کی صورت میں جمالِ یار پیشِ نظر رہنے کی کوئی توقع نہ تھی۔

رُستم خان کہ آزمودہ کار اور نسبتاً سن رسیدہ تھے اپنے ساتھی کی حالت زار دیکھکر بہت ملول اور غمگین ہوئے اور کہنے لگے۔

"مرزا صاحب آپ نے تو ہمیں بالکل تباہ کر دیا کسی نوعمر او ر نارسیدہ لڑکے سے اگر یہ حماقت سرزد ہوتی تو خیر مگر آپکا اس دار الحرب مین عشق بازی کرنا کیسی نادانی ہی؟"

مرزا صاحب"۔ بھائی مین خود نہایت نادم اور پشیمان ہون مگر ع

دلِ بیتاب بہلتا نہیں بہلانے سے"

رُستم خان"۔ بھاڑ مین جائیں آپ اور چولہے مین جائے آپکا دلِ بیتاب"۔

مرزا صاحب"۔ تمھارا غصّہ میرے سر آنکھون پر"۔

رُستم خان"۔ مگر بھائی کچھ تو عقل سے کام لیا ہوتا"۔

مرزا صاحب"۔ میری عقل سب سلب ہوگئی ہی اور دماغ بالکل بیکار ہی لاکھ سمجھانے کی کوشش کرتا ہون مگر کچھ نہین ہوتا"۔

رُستم خان"۔ میان! یہ نہ سمجھنا کہ تم مُغل اور وہ مرہٹے ایک دوسرے کے جانی دُشمن تمھارا اُن کا کیا میل"۔

مرزا صاحب"۔ یہ سب سوچتا ہون مگر میری عقل زائل ہو چکی ہی"۔

رُستم خان"۔ تو بس اپنے کئے کو بُھگتو مجھے تمھارے ساتھ دلی ہمدردی ہی مگر میں تمھاری

کیا مدد کر سکتا ہون"۔

مرزا صاحب "بس دعا کرو کہ خدا تعالیٰ مجھے جلد اٹھا لے۔ کار برآری کی کوئی صورت نہین ہی"۔

رستم خان "اللہ تعالیٰ تمھارے اوپر رحم کرے، اسقدر نا امید نہ ہو وہ مسبب الاسباب ہے شاید کوئی صورت نکل آئے، بظاہر تو کوئی صورت کامیابی کی نہیں ہی"۔

گفتگو ختم ہوئی مرزا صاحب کمبل لپیٹ کر رونے لگے دل بے قابو تھا اس کے ساتھ ساتھ گھر کی یاد اور ماں کی علالت کے خیال نے احساس قید کو بہت گھبرا کر دیا اور وہ بے اختیار ہو کر آہ وزاری کرنے لگے"۔

---

(۲)

مرزا صاحب کو نقل وحرکت کی تھوڑی بہت آزادی حاصل تھی اور اس زمانہ مین انھون نے اپنے رویہ سے لوگون کے دلون مین اعتماد کا سکہ بٹھا دیا تھا وہ کئی مرتبہ محض چہل قدمی کی غرض سے پہرہ داروں سے اجازت لیکر کبھی نربدا کی جانب اور کبھی پہاڑی پر گئے پہاڑیوں کا سلسلہ دور تک چلا گیا تھا اور اس کو عبور کرنا انسانی طاقت سے باہر تھا، ادھر نربدا کو عبور کرنا بغیر کسی ساز وسامان کے اور بغیر گرفتار ہوئے سراسر محال تھا۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ دو متصل پہاڑون کے پاس ایک تنگ سا درہ تھا جس کے ذریعہ سے لوگ باہر سے آ اور جا سکتے تھے۔ مرزا صاحب اس درہ کو بارہا دیکھ چکے تھے اور پہاڑی کی بلندی پر سے ان کو یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ دوسری جانب ایک خوفناک گھنا جنگل ہے جس کو طے کرنا بغیر کسی رہنما کے از حد دشوار ہے ایسے حالات میں مرزا صاحب کیسے اور کہاں بھاگ سکتے تھے سوائے رتن کے کوئی ان کا اور شیر کا مددگار

اور ہمدرد نہ تھا۔ مگر رتن نے بھی اُن کی کچھ زیادہ حوصلہ افزائی نہ کی اور یہ وعدہ کر گئی کہ میں دوسرے روز آکر اگر ممکن ہوا تو فراری کی کوئی تدبیر نکالونگی۔ مرزا صاحب اُسی کی آمد پر آس لگائے ہوئے بیٹھے تھے مگر اُن کے جذبات میں اسوقت ایک عجیب کشمکش تھی ایک طرف یاد وطن اور مہر مادری جوش مار رہی تھی اور دوسری طرف یہ تازہ جنون عشق و جذبۂ الفت اُن کے قدموں میں زنجیریں ڈالے ہوئے تھا۔ اگر بھاگ نکلتے ہیں تو پیاری رتن سے ہمیشہ کے لئے جدائی ہوتی ہے اور اگر یہیں رہتے ہیں تو ماں کا آخری دیدار نصیب نہیں ہوتا بہت غور کیا دماغ پر بہت زور ڈالا مگر مرزا صاحب اس معمہ کو حل نہ کرسکے اور مایوس ہو کر اپنی بدنصیبی پر کفِ افسوس ملنے لگے۔ اسی دوران میں پاؤں کی آہٹ معلوم ہوئی اور رتن سامنے آکر کھڑی ہوگئی اور بولی "رات کو بارہ بجے تیار رہنا"

"یہ کہکر اُس نے کچھ پھل اور چند تازہ روٹیاں مرزا صاحب کو دیں اور آن کی آن میں چل کھڑی ہوئی۔

مرزا صاحب ششدر رہ گئے اور سوچنے لگے کہ میں خواب میں ہوں یا عالم بیداری میں، ضرور بیداری ہے۔ یہ روٹیاں اور پھل موجود ہیں، پھر دیکھو آج رات کو بارہ بجے رتن کیا گل کھلاتی ہیں اور کس طرح اس قید محن سے نجات ملتی ہے ظالم ایک منٹ بھی تو نہ ٹھہری اپنی تدبیر بتاتی اُس پر میں غور کرتا اور اس دلِ مضطر کو اطمینان حاصل ہوتا۔ رات کو بارہ بجے! بارہ بجے!! خیر آجکل تو راتیں بہت تاریک ہیں کہیں تین بجے جاکر چاند نمودار ہوتا ہے مگر پھر بھی اُس کی روشنی بہت ضعیف ہوتی ہے مگر اُس وقت تک اگر خدا نے چاہا تو میں خطرہ سے باہر نکل جاؤنگا یہاں سے بیس میل پر ہماری عملداری شروع ہو جاتی ہے تین گھنٹے میں بیس میل انشاءاللہ ضرور طے ہو جائینگے مگر ولئے ناکامی! آج بارہ بجے کے بعد کیا پھر کبھی رتن کی صورت نظر نہ آئیگی افسوس کیا معمہ ہے۔

کیسی سخت کشمکش ہو نہ جائے رفیق نہ پائے ماندن۔ تمام رتن ایک منٹ بھی نہ ٹھہری ورنہ تجھ سے درد دل کہتا! فرقت کی گھڑیاں بھی کیسی صبر آزما اور جان گسل ہوتی ہیں اور پھر فرقت دائمی کی تکالیف کی شدت!!!۔ مگر ہاں! ابتک یہ بھی تو پتہ نہ چلا کہ رتن کے دل میں بھی میری کچھ گنجایش ہی کہ نہیں یا صرف میں اُس کے جذبہ ہمدردی کو اپنے عشق سے متاثر ہو کر جذبۂ الفت کی صورت میں دیکھ رہا ہوں۔ اُف!! کچھ سمجھ میں نہیں آتا یہ دوہری قید اور دوسری پابندی بے ہوش و حواس پر بجلی گرا رہی ہے۔ ہمارے ساتھی رستم خان کسی مصرف کے نہ رہی پہلے بھی فلسفی تھے اب اس قید تنہائی نے اُن کو پاگل بنا دیا میں تدبیریں کرتا کرتا گھُلا جا رہا ہوں اسی تجو میں یہ نیا آزار مول لیا جس کی وجہ سے میری جان کے لالے پڑ گئے مگر وہ کیسے بے حس اور مستغنی ہیں کہ اُنہیں اصلا خبر نہیں کہ ہم پر کیا گذر رہی ہے۔ یہ کونسی آدمیت ہی کہ دوست ہلاک ہو رہا ہو اور اُس کے ہمدم ہمراز کو اُس کی تکلیف کا علم بھی نہ ہو............ خیر............ اگر میں بچ نکلا تو رتن مستحق مبارکباد ہے کہ میں............ مگر خدا وہ دن تو لائے دلی پہونچنے کے بعد میری پہلی کوشش یہ ہوگی کہ رتن کو حاصل کروں......... مگر بیشتر اس کے یہ امر دریافت طلب ہی کہ آیا وہ مجھے چاہتی ہی یا نہیں؟۔

مرزا صاحب اسی اُدھیڑبن میں مبتلا تھے کہ رستم خان آگئے اُن کا چہرہ حسب معمول خشک اور بے رونق تھا ایک مشین کی طرح وہ آبادی کے تنہا گوشوں میں، پہاڑیوں کے درون میں، نربدا کے کنارے بیٹھے رہتے تھے اور اُن کے نظام اوقات میں کبھی کوئی خلل نہ پڑتا تھا ہمیشہ چپ چاپ، کم گو اور الگ تھلگ رہتے۔ اُن کے آنے کے دو ہی منٹ بعد ٹھاکر داؤ اپنے ساتھیوں کو لیئے آ پہونچا اور کہنے لگا۔

"ایک مہینہ گذر گیا مگر آپ لوگوں کا روپیہ نہیں آیا۔ اب زیادہ توقف میں نہیں کر سکتا،

مین آپکو ایک ہفتہ کی مہلت اور دیتا ہون آج پورے ایک ہفتہ کی، اس کے بعد اگر روپیہ نہ آیا تو یہ خنجر آبدار ہوگا (اپنے خنجر کی طرف اشارہ کرکے) اور آپ کی گردنیں، کان کھول کر سن لیجئے اور اس کے بعد مجھ سے کوئی رحم کی توقع نہ کیجیئے۔" یہ کہکر بغیر جواب کا انتظار کئے چلدیا اس روز اغلباً وہ کسی بڑی مہم پر دو تین یوم کے لئے باہر جا رہا تھا۔ ان مرہٹون کا یہ دستور تھا کہ مہینہ مین سات آٹھ مرتبہ ہمیشہ باہر جاتے اور جہان کہین موقع لگتا ڈاکہ مارتے اور لوٹ کھسوٹ کر اپنے اپنے گاؤن کو واپس آتے دو تین روز قیام کرتے اور پھر مہم پر روانہ ہو جاتے یہی اُن کی زندگی تھی یہی اُن کی دلچسپیونکا مجموعہ اور یہی اُنکی ثروت اور اقتدار کا تنہا ذریعہ!!

مرزا صاحب اور رستم خان دونون ملہار راؤ کی تقریر سنکر بہت دل گرفتہ ہوئے۔

رستم خان۔ "مرزا صاحب کیا بتاؤن عجیب خلجان ہے نہ روپیہ آتا ہے نہ کوئی خبر کیا کیا جائے؟"

مرزا صاحب۔ "بھائی عجیب مصیبت ہے کوئی تدبیر سمجھ مین نہین آتی مگر ایک تدبیر ہے اگر وہ چل گئی تو پرسون تک تمھارا روپیہ آجائیگا۔"

رستم خان۔ (حیرت زدہ ہوکر) بھئی وہ کونسی تدبیر ہے؟"

مرزا صاحب۔ (آہستہ لہجہ مین) آج مین بھاگنے کی کوشش کر رہا ہون اگر کامیاب ہوگیا تو مراد نگر پہونچکر کل ہی تمھارا روپیہ روانہ کردون گا اور پرسون تک تمھاری رہائی ہو جائے گی۔ اگر تدبیر نہ چلی تو تم بھی مارے جاؤگے اور مین بھی۔"

رستم خان۔ (کچھ تامل کے بعد) کیسے بھاگوگے کیا تدبیر سوچی ہے؟"

مرزا صاحب۔ "یہ نہ پوچھو کام بن جانے پر بتا دون گا۔"

(۶)

رات میں ساڑھے بارہ بجے کے قریب کوٹھری کا دروازہ نہایت آہستگی کے ساتھ کھلا اور ایک نوجوان فوجی وردی پہنے ہوئے اندر داخل ہوا - مردانہ لباس پہنے ہوئے یہ رتن تھی اور فوجی لباس میں ایک عجیب شان رعنائی کے ساتھ مرزا صاحب کے سامنے کھڑی تھی اسکو دیکھتے ہی دونون قیدیون کے دل مضطرب ہوکر اچھلنے لگے اس نے چلنے کا ارشاد کیا اور مرزا صاحب اپنے ساتھی سے رخصت ہوکر رتن کے ساتھ ہولئے - رات نہایت تاریک اور بھیانک تھی . ایسی تاریک کہ ہاتھ کو ہاتھ نہ نظر پڑتا تھا - کوٹھری کے آگے تقریباً بیس گز کے فاصلہ پر ایک کالا کتا لیٹا ہوا تھا ذرا خفیف سی آہٹ پر وقتاً فوقتاً بھونک کر تیرگی شب کو پاش پاش کر دیتا تھا اس نے ان دونون کو اپنی قریب آتے ہوئے دیکھا اور حسب معمول بھونکنا شروع کیا دونون ٹھٹک گئے اور راستہ کاٹ کر ضرورت سے زیادہ فصل طے کرنے کے بعد اس درہ سے گذر کر خوفناک جنگل کی تاریکی مین پناہ گزین ہوئے - وہان پہنچکر رتن نے مرزا سے کہا -

اب ہم تقریباً خطرہ سے باہر ہین یہ دو گھوڑے ہم دونون کو جلد اس علاقہ سے دور لیجا ئین گے - اس جنگل کا راستہ مجھے خوب معلوم ہے .... اب مین جلد جلد تمھین ایک اور راز بتاتے دیتی ہون جو اس پوری آبادی مین سوائے ملہار راؤ اور اس کے گھر والون کے اور کسی کو معلوم نہین ہے .... وہ یہ ہے کہ مین خود بھی مسلمان ہون سات برس ہوئے میرے باپ مہدی قلی خان کو ملہار راؤ نے لوٹا اور مارا اور مجھے پکڑ کر یہان لے آیا تھا اس مین شک نہین کہ اولاد نہ ہونے کی وجہ سے ملہار راؤ نے میرے ساتھ ہمیشہ سچی محبت کا برتاؤ کیا مگر مین یہان زیادہ دنون تک قیام کرنا نہین چاہتی "!

یہ کہکر دہ گھوڑے پر سوار ہوئی اور مرزا صاحب "کہ حیرت اور استعجاب کی وجہ سے

بدحواس ہو رہی تھے اُس کے پیچھے ہو لئے۔

دوسرے روز مرادنگر پہونچکر مرزا صاحب نے بیس ہزار روپیہ کا انتظام کیا اور یہ گرانقدر رقم ملہار راؤ کے پاس بھیجی، خود رتن کو لیکر دلی روانہ ہوگئے۔

اُن کی والدہ ماجدہ کہ دراصل مرض الموت مین گرفتار تھین اپنے چھیتے بیٹے کو دیکھکر نہایت خوش ہوئین، دوسرے روز اُنکی شادی رتن کے ساتھ بڑی دھوم دھام سے رچی۔ اور ماں نے دونوں کو اپنی بہترین دعاؤن سے مالا مال کیا۔

رتن نے تمام عمر اپنا یہ نام قائم رکھا کہ ملہار راؤ کے احسانات کی شکر گذاری کا یہی واحد ذریعہ تھا۔ (ماخوذ)

ضروری گزارش

آجکل اشتہار دینے کا رواج عام ہو رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ اکثر اشتہارات جھوٹے اور فریبی ہوتے ہین ایسے اشتہارات کی اشاعت افسوسناک ہے۔ اس لئے ہم نے طے کرلیا ہے کہ صرف معزز اور معتبر تاجر اور دوکانداروں کے اشتہارات شمع مین شائع کئے جائین۔ تاکہ ہمارے ناظرین دھوکہ اور نقصان سے محفوظ رہین۔ اور خوش معاملہ اور ایماندار تاجرون کے کاروباری تعلقات اچھے لوگوں سے پیدا ہوجائین لہذا اطلاعاً گزارش ہے کہ غیر معتبر اشتہارات کی اشاعت سے ہم کو قطعی معذور سمجھا جائے۔

منیجر رسالہ شمع حسن منزل پتھا گنج۔ آگرہ

"سینہ زوری"

از
(جناب مرزا حامد حسین صاحب ایم، اے، ال، ٹی، ال، ال، بی،)

سو خلزم، کے عملی حامی "داڑھی تنکا" باندھنے، اور "الٹا"... کوتوال کو ڈانٹنے، والے وہ بیچارے، جو راتوں میں پرانے مکانون کی مخدوش دیوارین دوبارہ مرمت ہونیکی غرض سے کھود ڈالتے، اور چند اینٹیں کھود کر الگ کر دیتے ہین، اور جو اپنی چیز رکھنا نہ جاننے والون کی ناحق صلواتین سنتے ہین، اپنے "ماں باپ" یا "داروغہ جی (تھانہ دار) صاحب سے اجازت عام لیکر جس کا پہلا حصہ "شاہ سے کہو جاگتے رہنا" زبان زد عوام ہے، دو تین مرتبہ میرا گھر دیکھ چکے ہین (پہلی مرتبہ ریل مین نظر عنایت ہوئی) جوتے، شیروانی، ٹوپی، اور کپڑون کی پیٹی (بکس) کے متعلق فیصلہ کیا، کہ یہ چیزین بہت پرانی ہوگئی ہین، ان کے استعمال سے سوسائٹی مین، میری کم وقعتی ہوگی، مجھکو ان کے بجائے نئی اشیاء فراہم کرنا چاہئے، انھون نے اس فیصلہ اور دوستانہ ہمدردی کو اتنا وقیع و ضروری خیال کیا، کہ مجھکو جگا کر، (گرمی مین چلتی ریل کی ٹھنڈک سے مین سوگیا تھا) اور اس رائے کو سنا کر اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش بھی نہ کی، اور غالباً اس خوف سے کہ ہر شہری مین ایک فطری بخل اور سیانا پن ہوتا ہے جس کے باعث وہ پرانی سے پرانی چیزین بھی اپنے کلیجے سے لگائے رکھتا ہے، اور نیز اس خیال سے کہ مبادا مین رضامند نہ ہوا، تو ان کی ہمدردی خالی جائے گی، اور دوستانہ مشورہ برباد ہوجائیگا، یہ سب چیزین لیکر چلدیئے، مین بقیہ سفر، مرزا غالب کی ہمنوائی مین یہ شعر پڑھکر ـــ

"نہ لٹتا دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا
رہا کھٹکا نہ چوری کا، دعا دیتا ہوں رہزن کو"

سرکاری بڑے گھر سے رہائی پانیوالوں کی صورت، گھر پہونچا۔ باپ نے "میرے بچے" کی یہ حالت دیکھی تو گھبرا گئے۔ میں نے ہنسکر کہا، "سب خیریت ہے، میری چیزیں ریل پر سے سوتے میں کوئی لیگیا۔ میں نے بھی ہمدردی کا بدلہ 'جزاء الاحسان' سے دیا، اور یہ کہکر ٹال دیا کہ "کوئی لیگیا" نام نہیں بتلایا، حالانکہ جانتا تھا کہ چور لیگیا، بلکہ صفائی اور برئیت کا پہلو بھی چھوڑا، اور یہ کہا کہ "سوتے میں" لیگیا، تاکہ لیجانے والا کلپٹومینیا (سوتے جاگتے چوری کرنیکی عادت کی بیماری) کا عذر پیش کرسکے یا یہ کہ سونا ایک ایسا اضطراری فعل ہے جس کے ساتھ ساتھ کوئی دوسرا اختیاری فعل نہیں صادر ہو سکتا۔

دوسری مرتبہ، میرے گھر، ان حضرات کی ایسی حالت میں ہمانی ہوئی، جبکہ، اُن کو واقعی ضرورت تھی، اور مجھ میں گنجائش۔ وہ حقدار تھے، اور میں ذمہ دار و دیندار۔ اپنی ضرورت سے زیادہ، میں نے کچھ "ٹھیکرے" جمع کر لئے تھے۔ (اب نہیں ہیں، "ٹھیکرے" کا لفظ، "برتنوں" کے لئے، خالی خولی شیخی میں، استعمال کر رہا ہوں۔) کھانا، جتنی بھوک تھی، اُس سے زیادہ پک گیا تھا۔ میلے کپڑوں کے لئے چودھری نے تکلیف نہیں کی تھی۔ (بکس میں کئی جوڑے دکپڑوں کے) بند تھے۔ مجھے بھی چودھری صاحب کی طرف سے قدرے استغنا تھی۔ اس حالت میں، کوئی بیچارہ، جس کا "دل کتنا ہے" لوگ برابر پوچھتے رہتے ہیں، ادھر سے آنکلا۔ میری غفلت، (چند روزہ زندگی کو سو کر کاٹ دینے کی کوشش،) پر، ایسی جرأت ہوئی؟ کہ مجھے تنبیہ کی چاشنی چکھانیکی ضرورت آ پڑی۔ عجب ننگا بھوکا چور تھا! کچھ عجلت تھی، اس لئے شوربا پھینکدیا۔ زیادہ بدمزہ، اور نمک پانی سے درست نہ ہوگا۔ گوشت کی بوٹیاں، اور باسی روٹیاں، مزہ لے لے کر باورچی خانے ہی میں کھائیں۔ اس کے بعد گھڑے کا آٹا، دالیں، کچھ برتن، میری ضرورت سے زیادہ، یعنی دو دو لوٹے، دو دو

پتیلیاں، کفگیر اور گھی کی دیگچی، ایک میلی چادر میں، اور انگنی کے تمام میلے کپڑے، دوسرے گٹھڑ میں، باندھ کر چلنا بنا؛ برتن قلعی گر کے یہاں، اور کپڑے دھوبی کے یہاں، مجھکو بھیجنا چاہیے تھے، یہ آجتک میری سمجھ میں نہیں آیا، کہ گھی کی دیگچی کہاں بھیجنی چاہئے تھی؛ طالبعلمی کا زمانہ تھا؛ ماں باپ" بھیا "کو، مسافرت کی تکلیف کی حالت میں فیس اور کتابوں کے لئے، برابر روپیہ بھیجتے رہتے تھے؛ اور یہ ضرورتیں کمبخت، باوجود ہر مہینہ کی مرتبہ سینما (بائسکوپ) دیکھنے کے، مستقلاً لگی رہتی تھیں، اور ہر خط لکھتے وقت، پڑھنے کا حرج و نقصان، اور فیل ہونے کا خوف، "چند اشد ضروری کتابیں خریدنے کے لئے، اس مہینہ میں زیادہ روپیہ" بھیجنے کا تقاضا کرنے پر مجبور رکھتا تھا؛ نماز کے لئے پانی گرم کرنے کے لئے اُٹھنے پر، نوکرنے "میاں کا سالن" کیا" سالن کی دیگچی" ہی ندارد پائی؛ جگا کر چوری کا حال بتایا؛ میری نواب آن دنوں کہیں ڈھونڈھے جاتا تو تھی نہیں؛ لیٹے ہی لیٹے اشیاء مسروقہ کی فہرست سنی؛ اور ہنس کر شیخ ناسخ کا شعر پڑھا ؎

مرے گھر سے چلا محروم جب چور

کہا میں نے رہا مجھ پر ترا قرض'

گذشتہ ہفتہ، پھر ان ارباب شب زندہ دار نے مہربانی کی، اور اس مرتبہ بغیر اطلاع قبل، (ملاقاتی کارڈ، ملنے کی بھی ٹھہرائی؛ غالباً قرض چکانے آئے ہوں؛ اس مرتبہ ستم ظریفی کے ساتھ ساتھ ڈھٹائی اور بے تکلفی مجھے قابل شکوہ وشکایت محسوس ہوئی؛ اس احساس کا سبب یوں سمجھئے کہ اب "ہوم ڈیپارٹمنٹ" منتظم ہاتھوں میں ہے؛ اور اشیاء و اسباب خانہ داری کی فراہمی کی ذمہ داری" اور اس ذمہ داری کے لئے فراہمی کسب زر کا بار اپنی قوت بازو پر ہے؛ اور مٹی کے ٹھیکرے سچ مچ سونے کے معلوم

ہوتے ہین کیونکہ اپنا کمایا ہوا پیسہ خرچ کرکے منگانا پڑتے ہین جس مین دوسرے کامون کا بھی
حرج ہوتا ہی، اور آرام کا وقت بھی صرف ہوتا ہی، ماں باپ کے ایثار و شفقت اور معمولی معمولی
چیزون کی قدر اب سمجھ مین آتی ہی؛ قصہ مختصر، چند روز ہوئے کہ اسٹڈی روم (نوشت و
خواند کے کمرہ) مین، جو لبسا اوقات بسبب کمی کے میرا بڈ روم (خوابگاہ) بھی بن جاتا ہی، سو رہا
تھا، بی گھرسیی مع ماہ بختو کے قریب ہی کوٹھری میں بچہ لیئے سو رہی تھیں؛ کہ کسی نے شانہ
ہلایا، (میرا!) میں کچھ سمجھا؛ اس موقع پر، جو معمولی تساہلی یا عجلت، اُٹھنے مین کی جاتی ہی،
اُس کے ساتھ آنکھین کھولیں تو لالٹین کی دُھندلی روشنی مین، ایک کے بجائے تین صورتین،
اور وہ بھی اجنبی اور عجیب و خوفناک دکھلائی دین؛ خراب کیسا، تین چہرونکی تیز نگاہیں اسطرح
میرے چہرہ پر جمی ہوئی ہین، کہ عالم بیداری باور کرائے دیتی ہین؛ ہاتھون میں لاٹھیاں،
(نیزبان لکھنؤ لکڑیان) کچھ چمکدار پھل؛ (مٹی کے، یا تازہ منڈی، سے آئے ہوئے نہیں،
بلکہ سان چڑھے ہوئے،) دو ایک ہاتھون مین موٹے دستے یا ڈنڈے سے، (لوہے یا
لکڑی کے) ایک یا دو منٹ تک سمجھ مین نہین آیا، کہ کیا معاملہ ہی؛ سمجھ مین آ ہی چلا تھا،
کہ ناخواندہ مہمان ہین، کہ موٹی بھدی بھاری آواز مین ایک طرف سے تقاضا ہوا، "مال اسباب
دلوادو جی!" مین پریشان اُٹھ بیٹھا، اور جلد سوچنے کی کوشش کی، کہ اس موقع پر کیا کرنا چاہئے، مین نے کہا
"بھائی یہان جو کچھ ہمارے پاس ہی، سامنے والے کمرہ مین رکھا ہی، لے جاؤ؛ زیادہ سامان
ہمارے پاس نہیں ہی؛ یہان آئے ہوئے ہمین پندرہ دن ہوئے، سب لکھنؤ مین ہی؛ چلو مین
خود اُس کمرہ مین چلکر سب چیزین تم کو اُٹھوا دون" خوف سے، یا احتیاط سے، بی "سنتی ہو"
کمرہ کا دروازہ اندر سے بند کرکے سوتی ہین؛ یہ بات اس وقت آڑے آئی؛ مین نے سامنے
والے کمرہ کا قفل بڑھکر کھولا، اور بہت ہی پھرتی سے "ان" کے کمرہ مین باہر سے، کہ ہی

قفل لگا کر کنجیون کا گچھا، پڑوس کے مکان مین، پھینک دیا ؛ اتنی دیر مین کچھہ اطمینان حاصل، اور حواس بجا ہوئے تو ؛ مین نے کہا، " دیکھو اس کوٹھری مین مال نہین ہی ؛ جو جان پر صدقہ کیا جاتا ہی ؛ بلکہ عزت ہی، جس پر سے جان بھی صدقہ کر دیجاتی ہی ؛ مال لینا ہو تو جو کچھہ ہمارے پاس ہی ؛ وہ اس کمرہ مین ہی ؛ جس کو مین نے ابھی کھولا ہی ؛ وہ سب لیلو ؛ اور کہو تو ؛ مین خود تمھارے ساتھہ چپکا چلکر گھر سے تھوڑی دور تک پہونچا آؤن ؛ لیکن یہ کمرہ ؛ جس مین، مین نے ابھی قفل ڈالا ہی، اندر سے بھی بند ہی، باہر سے بھی بند ہی ؛ کنجی دوسرے مکان مین ہی ؛ اور اندر ایک ڈرپوک غل مچانیوالی بڑھیا ماما بھی ہی ؛ اس کے توڑنے کھولنے کا ارادہ کروگے، تو اندر سے غل ہوگا ؛ محلہ مین جاگ ہوگی، اور پکڑے جاؤگے ؛ مین تم سے دغا نکرونگا ؛ جو کچھہ آج کی رات تمھاری قسمت کا ہی، وہ اس کمرہ مین وہ سامنے اُس طرف رکھا ہی، اور مین چُپ چاپ تمھارے حوالہ کرنے کو تیار رہون " ؛ اتنی لمبی تقریر، کچھہ زبردستی کی پیدا کردہ جرات، کچھہ خوف اور کچھہ گھبراہٹ مین، ایک سانس مین، پھولے ہوئے دم کے ساتھہ، کرگیا ؛ بارے وہ کچھہ سمجھے، کچھہ میری وحشت سے تلطف لیا، (ہوگا) کچھہ قناعت سے کام لیا، اور کچھہ اپنے خطرات کا خیال کیا ؛ دو آدمی مجھہ پر مسلط رہی ؛ ایک نے زور کر کے چُپکے چُپکے صندوق توڑے ؛ اور کچھہ کپڑے، کچھہ زیور، کچھہ برتن ؛ جو اُن کو پسند آئے، جمع کر کے دو بڑے بڑے گٹھر بنائے ؛ باہر چلنے کا قصد کیا، اور باہم سرگوشی کر کے، ایک مسلح میرے مقابل ٹھہرا رہا، اور دو گٹھر لیکر چلتے بنے ؛ ذرا دیر کے بعد کچھہ دور سے ایک سیٹی کی آواز آئی، اس پر میرے دوست نے مجھہ سے فرمائش کی کہ مہمان رخصت کرنے کا فرض ادا کرون اور اُن کو پہونچانے کے لئے، باہر کی گلی تک، جدھر وہ مجھے لیجائین، اون کے آگے آگے چُپ چاپ چلا چلون ؛ آپ جانئے، فرض تو، با دل خواستہ یا ناخواستہ، ادا کرنا ہی پڑتا ہی ؛ جبراً قہراً مین اون کے آگے ہولیا ؛ میرے مکان کے شمال

مین، ایک تنگ گلی دُور تک جا کر، دوسری تنگ گلیون سے مل گئی ہے ۔ اوس کے شروع پر پہنچکر انھون نے مجھ سے "اچھا سلام صاحب" کہا، اور سر پر پیر رکھکر نو کدم بھاگے، اور چند سکنڈ مین نظرون سے غائب ہو گئے ۔ "اندرون خانہ" کیا گذری، یہ پھر کبھی ۔

شیخ علی حزین کی تصویر

جو ابتک عام نگاہون سے پوشیدہ تھی

پہلی مرتبہ

شمع بابتہ ماہ جنوری ۲۶ء میں موجود ہے،

اسی نمبر مین

شیخ مرحوم کے مقبرہ کی بھی تصویر

اور

مسٹر دی، ان، مہتا، آئی، سی، ایس

اور

پروفیسر ظفر حسن صاحب ضابط

کے مضامین دیکھنے سے تعلق رکھتے ہین ۔

زوالِ مسلم

(از جناب مولوی کریم الرضا خانصاحب ایم، اے دعلیگ)

ہے زوالِ مہر اک تمہید ظلمت گستری — فطرت گردونِ گرداں ہے تغیر پروری
رفتنی ہے شوکت کسریٰ و شانِ قیصری — اک تغیر ہے فقط قیدِ حوادث سے بری

ہے کمال شے مگر فی الاصل آغازِ زوال
بدر ہی گھٹ گھٹ کے بنتا ہے گردوں پر ہلال

ہے زوالِ ملتِ بیضا بھی عبرت کا سبق — فاتحِ خیبر کا وارث بیچتا ہے دینِ حق
ہم میں ہمدردی کی اب باقی نہیں کوئی رمق — منتشر شیرازۂ ملت کے ہیں سارے ورق

منبع افلاس و ذلت، موردِ رنج و الم
کیا ہمارے ہی لئے قرآں میں ہے خیر الامم

مسلمِ ناداں کا شیوہ فرقہ آرائی ہے آج — دین کے پردے میں یہ دنیا کا سودائی ہے آج
اس پہ ادبار و فلاکت کی گھٹا چھائی ہے آج — اک زمانہ اس کی قسمت کا تماشائی ہے آج

ناز تھا دنیا کو جس پر وہ ذلیل و خوار ہے
جو مسیحائے جہاں تھا آج وہ بیمار ہے

جس نے دنیا کو جگایا تھا وہ محوِ خواب ہے — جو کبھی بحرِ کرم تھا آج وہ بے آب ہے
اس کے بازارِ عمل میں جنسِ حق نایاب ہے — "سازِ توحیدِ مسلماں سایلِ مضراب ہے"

حاکمِ فانی کی ہر اک بات ہے بانگِ الست
جو محی الدین وحدت تھا وہ ہے انساں پرست

نصف دنیا کا جو حاکم تھا وہ خود محکوم ہے — جس نے بنیادِ ستم ڈھائی تھی وہ مظلوم ہے
باعثِ تکوینِ عالم جو ترا معصوم ہے — کیا خدایا! یہ اسی کی امتِ مرحوم ہے

رحم کر مولا کہ رحم و عفو تیرا کام ہے
آج محصورِ مصائب مسلمِ بدنام ہے

"قرون وسطی مین خشکی کی راہ سے ہندوستان کی تجارت اور سفر کے ذرائع"

از

مسٹر حسن عابد جعفری (آکسن) بیرسٹر ایٹ لار - اڈیٹر شمع)

(گذشتہ سے پیوستہ)

سرائین اور چولٹریان اگرچہ شمالی ہندوستان کے مقابلہ مین کم تھین مگر پھر بھی جنوب مین اون کی تعداد کافی تھی، اور مخصوص طور پر مصروف مقامات پر تعمیر کی جاتی تھین، بابی راڑ ڈولل نے کالی کٹ کی سراؤن کا ذکر کیا ہے" جہان غذا اور قیام کی قیمت مقرر ہے" تھیونیر نے گول کنڈے، اورنگ آباد اور تینار کی سراؤن کا حال لکھا ہے" جو دو منزلہ ہین اور جن کے ایوان وسیع اور ٹھنڈے ہین"۔ "کوٹھریان غریب مسافرون کے لئے بنی ہوئی ہین۔ ان مسافرون کو شام کے وقت روٹی چاول اور ترکاریان تقسیم کی جاتی ہین، بت پرست جو دوسرون کے ہاتھ کی پکائی ہوئی چیز نہین کھاتے ہین، روٹی کے لئے آٹا اور گھی پاتے ہین"

باورے بھی اس آرام اور راحت کا ذکر کرتا ہی جو سلطنت گول کنڈہ مین مسافرون کو ملتا ہے" وہان ہر چار میل پر شاہی خرچ سے چھوٹے چھوٹے مکانات بنے ہوئے ہین اور پیاسے مسافرونکو دودھ اور کونگی (چاولون کے ساتھ جوش دیا ہوا پانی) ملتا ہے، اور ہر بارہ میل کے فاصلہ پر سرائین بنی ہوئی ہین جن سے آنے جانے والون کو بہت آرام ہے، اور یہ دستور ہے کہ جو پہلے وارد ہوتا ہے اسکی پہلے مدارات کی جاتی ہی خواہ وہ کسی طبقہ کا آدمی ہو"

عیسوی میں بھی پتہ چلتا ہی کہ ۱۳۵۳ء میں مسافروں کے آسائش کے لئے نومیل کا باغ لگایا گیا تھا۔ سرائیں، کنوئیں، تالاب وغیرہ بھی موقع موقع سے بنا دیئے گئے تھے۔

سترھویں صدی عیسوی کے آخر تک شمالی ہندوستان میں بکثرت سرائیں تھیں، اور اون کا انتظام بھی اچھا تھا۔ چنانچہ یورپ میں سیاح فنچ، منڈی، برنیر، منوچی اور دیگر اشخاص کی تحریرات شاہد ہیں۔ آگرہ۔ لاہور کی سڑک کی متعلق ڈتے نے کا ۱۶۳۱ء میں بیان ہی کہ ہر پانچ یا چھ کوس کے فاصلہ پر سرائے ہیں جو یا تو بادشاہ نے بنوائی ہیں یا رؤسا نے۔" منوچی جو ۱۶۵۵ء سے ۱۷۰۸ء یعنی پچاس سال سے زاید ہندوستان میں مقیم رہا ہی لکھتا ہی کہ مغل سلطنت میں ہر سڑک پر سرائیں تھیں جو قلعہ کی طرح مستحکم تھیں اور ان میں آٹھ سو سے لیکر ہزار آدمی تک مع اپنے گھوڑوں، اونٹوں، اور بیل گاڑیوں کے قیام کرسکتا تھا۔ آگرہ اور ڈھاکہ کے درمیان بہت زیادہ آمدورفت رہتی تھی۔ اس راہ میں گانوں اور سرائیں بکثرت تھی، اور کھانا بہت ارزان تھا، بعض سرائیں بہت خوبصورت اور بہت مضبوط تھیں۔ فنچ کا بیان ہی کہ چپر گھاٹ میں جو تجارتی حیثیت سے مشہور تھا "ہندوستان کی بہترین سرائیں ہیں جو محل معلوم ہوتی ہیں، اور انمین ایک ہزار آدمی ٹھہر سکتا ہی" فنچ کہتا ہی کہ ان خوبصورت سراؤں کے چاروں کونوں پر چار گنبد تھے۔ آمدورفت کے لئی دو شاندار پھاٹک تھی اور چاروں طرف فصیلیں بنی ہوئی تھیں۔" نورمحل سرائے آگرہ کے متعلق منڈی کا بیان ہی؛ کہ "وہ بہت خوبصورت ہی اسکو ملکہ نورمحل نے مسافروں کے قیام کے لئے تعمیر کیا تھا جسمین پانچسو گھوڑے، اور دو تین ہزار آدمی ٹھہر سکتے ہیں۔ یہ عمارت پتھر کی بنی ہوئی ہی مطلق لکڑی نہیں لگائی گئی ہی۔ کمرے محرابدار ہیں اور ہر ایک پر کئی کئی قبہ ہیں۔" اسیکا بیان پٹنہ کی سرائے کی متعلق ہی کہ "ایسی خوبصورت سرائے میں نے کہیں نہیں دیکھی اور نہ ہندوستان میں نظر آئی۔ اس میں دو صحن ہیں، ہر صحن میں نیچے گودام اور اوپر قیام کے کمرے اور دالان ہیں، صدر دروازہ بہت شاندار اور جانب پا

ہی ...... اس قسم کی سرائیں بڑے شہروں میں ہوتی ہیں لیکن اور قسم کی سرائیں ہر مقام پر موجود ہیں ، پادری نے "نہایت نفیس چوڑی سڑک میں جو شہر آنے جانے کی مقدم تھا بیگم کی تھی - برنیر جو مشرقی سراؤں کا بہت کم مداح ہے دہلی کی سرائے بیگم تعمیر کردہ دختر کلان شاہجہان کے بارے میں رقمطراز ہے کہ "کاروان سرا ایک بڑے مربع کی شکل ہے جسمیں ہمارے شاہی محل کی طرح وسیع دالان ہیں ، ان دالانوں کے اوپر چاروں طرف برآمدے ہیں جنمیں ہو کر نیچے کے حصہ کی طرح حجروں کے راستے ہیں یہاں مالدار ایرانی ازبک بہت شوق سے قیام کرتے ہیں - اور یہی حال باہر کے سوداگروں کا ہے جنکو عموماً خالی کمرے دیئے جاتے ہیں اور وہ نہایت حفاظت سے رہتے ہیں شب کی وقت پھاٹک بند ہو جاتا ہے ، اگر پیرس میں ایسی ہی ایک کوئی عمارتیں بنا دی جائیں تو نو واردوں کو محفوظ کیا جائیگا - کہ تلاش کرنے میں جو دقتیں ان کو پیش آتی ہیں وہ رفع ہو جائیں ...... ایسی عمارتوں میں پردیسی سوداگر اپنے گودام بنا لیا کریں گے اور بہ کثرت قیام کریں گے۔"

بیگم سرائے ہندوستان کی نہایت عالیشان سراؤں میں شمار ہوتی تھی - اور اسی وجہ سے فرانسیسی سیاح نے اسکی بے حد تعریف کی ہے ، عام طور پر سرائیں اس قدر عالیشان اور آرام دہ نہیں ہو سکتی تھیں لیکن وہ کافی طور پر آرام دہ اور محفوظ تھیں جہاں تھکے ماندے سوداگر اور مسافر آرام پاتے تھے ۔

معمولی سراؤں کے متعلق ذیل میں ایک انگریز عالم کی رائے بہت زیادہ قابل قبول ہے - یہ شخص سنہ ۱۶۱۳ء میں ہندوستان میں موجود تھا ، اس کا بیان ہے کہ یہ سرائیں مسافروں کے قیام کے لئے بنی ہیں - اور کشادہ ہیں ، ہندوستانی اور غیر ملکی مسافروں کے لئے یہاں انتظام ہے چاروں طرف وسیع گودام ہیں عموماً ایک منزلہ ہوتی ہیں ، اوپر دالانوں کی شکل میں چار چوک ہوتے ہیں ،

ان کے بیچ میں ، ہاتھیوں اور اونٹوں کے دانہ پانی کی جگہیں ہیں۔ درمیان میں وسیع صحن ہے۔
سوداگر، شرفا اور امرا اپنے خیموں اور گاڑیوں میں شب باش ہوتے ہیں۔ اگر ان میں سے ان کے پاس
کوئی چیز نہیں ہوتی ہے تو سرائے ان میں بہترین صورت قیام نکال لیتے ہیں۔ کھانے پینے کا سامان
ان کے ساتھ ہوتا ہے یا شہر میں خرید تے ہیں۔"

براہ خشکی باربرداری کی اصل اور اس کی حد

مشینوں کے استعمال سے قبل بیل گاڑیاں اور سامان لادنے کے جانور بالخصوص بیل اور
اونٹ ہندوستان میں باربرداری کا ذریعہ تھے، یہ بڑی تعداد میں بڑی مسافتیں طے کرتے تھے،
اکثر دس اور بیس ہزار کے قافلے یا کاروان بنجاروں کے ساتھ بنگال سے آگرہ اور آگرہ سے
سورت جاتے ہوئے نظر آتے تھے۔ بنجارے لوگ خانہ بدوش تھے جو ہمیشہ مع بیوی بچوں
اور سامان خانہ داری کے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے رہتے تھے، ان کے بیل ذاتی ہوتے
تھے، اور بعض کے پاس سو سو بیل ہوتے تھے، ان کا ایک حاکم بھی ہوتا تھا جو بنجارہ ہوتا تھا، صرف
رعایا کو سامان خورد و نوش نہیں بلکہ اکثر افواج کو سامان رسد کا پہونچانا انہیں کے سپرد ہوا کرتا تھا،
انہیں سے بعض بنجارے تاجر بھی ہوتے تھے جو غلہ کو ارزاں خریدتے اور گراں فروخت کرکے منافع
حاصل کرتے تھے۔ غرضکہ ریل کی ابتدا سے قبل یہ فرقہ معاشرتی نظام کے لئے نہایت ضروری تھا
اور بعض مقامات پر باربرداری کے لئے اس کا وجود ناگزیر تھا۔

منڈی نے مندرجہ ذیل دلچسپ سطور بنجاروں کے بارے میں لکھی ہیں "بنجاری بیوی
بچوں اور گھر بار کو لیکر ہمیشہ ایک مقام سے دوسرے مقام پر منتقل ہوتی رہتے ہیں، بیل ان کے

ذاتی ہوتے ہین بعض اوقات سوداگر اُن کو کرایہ پر دے لیتے ہین، مگر عموماً یہ خود سوداگر ہوا کرتے ہین۔ اور ارزان مقامات پر غلہ خرید کر گران مقامات پر فروخت کرتے ہین، اور پھر نمک، شکر، گھی وغیرہ لاد کر ایسے مقامات پر چلے جاتے ہین جہان ان کو منافع پر فروخت کر سکین"۔ ان بنجارون کے متعلق جنھون نے اپنے آبائی پیشہ کو ریل نکلنے کے بعد بھی عرصہ تک جاری رکھا، میلکوم کا بیان ہے کہ "یہ لوگ ڈیرون مین زندگیان بسر کرتے ہین، اور جہان ڈیرہ نصب کر لیتے ہین وہی اُن کا اور اُن کے خاندان کا گھر بن جاتا ہے، چونکہ ان کا پیشہ تجارت اور افواج کو سامان رسد پہونچانا ہوتا ہے اس لئے ایک ملک سے دوسرے ملک مین ان کی آمد و رفت رہتی ہے اور جس جگہہ گرانی ہوتی ہے وہان ان کا وجود بہ کثرت ہوتا ہے، اور جہان ارزانی ہوتی ہے وہان خال خال نظر آتے ہین"۔

جانورون اور گاڑیون کے ذریعہ سے قرون وسطیٰ مین جس حد تک باربرداری ہوتی تھی اُسکا اندازہ ذیل کی تحریر سے ہو سکتا ہے "مین نے برہان پور کے قریب ایک دن مین دس دس ہزار بیل مال سے لدے ہوئے دیکھے ہین۔ اور عام طور پر ان سے کم تعداد بھی نظر آئی ہے"۔ ڈیلاوالے کو ایک قافلہ کے ہمراہ سفر کرنیکا اتفاق ہوا جو "اتنا بڑا تھا اور اُس کے ہمراہ اتنی گاڑیان تھین کہ جب اُس کا کسی تنگ مقام سے گذر ہوتا تھا تو ہم لوگون کو روم اور نیپلز کے مذہبی میلون کی طرح یہان بھی راستہ پانے کے لئے بہت دیر دیر تک انتظار کرنا پڑتا تھا"۔ دریائے گنگا پر رام پور اپھوئی کے قریب منڈی نے ایک ٹانڈا یعنی بیلون کا کیمپ دیکھا جس کے "کل بیلون پر گیہون، اور چاول وغیرہ لدے ہوئے تھے اور اُن کی تعداد چودہ ہزار تھی"۔ ایک بیل پر چار من بوجھ ہوتا تھا یعنی مجموعی وزن چھپن[56] ہزار من تھا۔ منڈی نے اور بھی بہ کثرت بیل آتے ہوئے دیکھے وہ بھی پورب کی طرف سے آگرہ کو جا رہے تھے۔ آگرہ منڈی تھا جہان سے غلہ دوسرے مقامات کو جاتا تھا۔

اس واقعہ کے دو دن کے بعد منڈی نے شہزاد پور مین ایک اور ٹانڈا دیکھا وہ شکر سے لدا ہوا تھا،

اور بیلوں کی تعداد بیس ہزار تھی۔ فی بیل ڈھائی من شکر کا بار تھا یعنی مجموعی وزن پچاس ہزار
من تھا۔ منڈی نے بانس کی بنی ہوئی ڈولیوں کا ذکر کیا ہے جنمیں کہار چینی اور دیگر نازک اقسام
کا سامان اور پانی پچیس اور تیس میل روزانہ کی رفتار سے لے جاتے تھے۔ ٹے ورنیر کا بیان ہے۔
" ایک بیل پر تین چار من کا بوجھ ہوتا ہے، اور دس دس بارہ بارہ ہزار بیلوں کے کارواں کو دیکھکر
حیرت ہوتی ہے جو چاول، غلہ، اور نمک ہی لدے ہوتے ہیں .... چاول وہاں لیجاتے
ہیں جہاں صرف دیگر قسم کا غلہ ہوتا ہے اور غلہ وہاں پہونچاتے ہیں جہاں صرف چاول کی پیداوار
ہوتی ہے اور نمک وہاں لیجاتے ہیں جہاں وہ ناپید ہوتا ہے "تھیونو نے بھی اورنگ آباد کے قریب
ایک کارواں کپڑوں سے لدا ہوا دیکھا تھا جسمیں ایک ہزار بیل تھے اور وہ آگرہ سے آرہا تھا۔

راجپوتانہ اور وسطی غربی ایشیا میں باربرداری کا کام عموماً اونٹوں سے لیا جاتا تھا۔
اندرون ملک میں وہ باربرداری کے لحاظ سے بیلوں کی طرح مشہور نہیں ہوئے۔ ٹے ورنیر کی شہادت ہے کہ
بیلوں کی طرح اونٹ باربرداری کے کام میں نہیں آتے تھے، اس نے بنجاروں کے پاس اونٹ
دیکھے تھے جن پر امرا کا اسباب لدا ہوا تھا۔ فوجی باربرداری میں بھی اونٹ بکثرت کام آتا تھا۔

ہندوستان کے بعید ترین مقامات ارزنگ ل سے بھی سوداگر جکڑیا کے مشہور تجارتی
مقام لوگر کو تجارتی اغراض سے جاتے تھے۔ یہاں سے ہر قسم کا کپڑا لیجاتے تھے، اور وہاں سے
ریشم، سرخ چمڑہ، غلام اور گھوڑے لاتے تھے۔ ارڈ نے آگرہ سے کمبالو (واقع پیکنگ) کو ہر سال
قافلے جاتے دیکھے تھے۔ رچرڈ اسٹیل (۱۶۱۵ء) کے بیان کے مطابق ہر سال بارہ چودہ ہزار
لدے ہوئے اونٹ قندہار کی راہ سے ایران کو جاتے تھے۔ اور خشکی کی راہ سے مصالحہ کی تجارت
سندھ اور ایران کے درمیان لاہور کے راستہ سے تھی۔ برنیر کی شہادت کے بموجب " کشمیر
اور پٹنہ سے تبت اور چین کو قافلے جاتے تھے، جو مشک، چینی لکڑی، رہباب، بلور اور ادن

وغیرہ لاتے تھے، خلاصۃ التواریخ میں ہے کہ دیا رتہر جو پرشہر ہرائچ میں بکثرت مال آتا تھا اور لوگ شمالی پہاڑوں سے اپنی پشت پر یا بکروں، اور پہاڑی ٹٹوؤں پر لاد کر لاتے ہیں بعض اوقات بڑا ہجوم ہو جاتا ہے۔ ہر جانب سے سوداگر آتے ہیں اور یہاں سے مال خرید کر کے منافع حاصل کرتے ہیں۔"

جن کارروانوں میں جانور اور گاڑیاں شامل ہوتے تھے، ان میں گاڑیوں کی تعداد دو ڈھائی سو سے زیادہ نہ ہوتی تھی۔ ۱۶۱۹ء میں تھیسرا ٹنر و کٹ مٹن سورت سے لاہور کو ایک بڑے کارروان کے ساتھ روانہ ہوا جس میں چار سو اونٹ، سو گھوڑے اور سو مال کی گاڑیاں، اور بہت سے غربا پیدل تھے، منڈی نے آگرہ سے سورت کو جس کارروان کے ہمراہ سفر کیا اس میں دو سو اٹھہ اونٹ، اور ایک سو نو مال کی گاڑیاں تھیں جن میں تیل اور شورا تھا، گاڑیوں میں دو بیل جتے ہوئے تھے؛ اور بھاری گاڑیوں میں آٹھ، بارہ اور بعض اوقات سولہ اور بیس بیل جوتے جاتے تھے۔"

کارروان کے ذریعہ سے باربرداری کے متعلق فرایر کا بیان ہے کہ "ایران میں اس کے برعکس حالت ہے، وہاں نہ بیل گاڑیاں ہیں اور نہ سواری کی گاڑیاں ہیں، وہاں راستہ بتانے والا بھی مشکل سے نظر آتا ہے۔ یہاں پیادوں، اونٹوں اور بھینسوں سے جتی ہوئی بھاری گاڑیوں سے سڑکیں بھری ہوئی ملتی ہیں۔"

بنجارے، قافلے، اور کارروان مسلح ہو کر سفر کرتے تھے، اور بعض اوقات مسلح محافظ بھی ایسے راستہ پر ان کے ساتھ ہوتے تھے جہاں چوروں اور ڈاکوؤں کا خوف ہوتا تھا، چپراسی یا سپاہی ہر وقت چار پانچ روپیہ ماہوار پر کارروان کے ہمراہ جانے پر تیار ہو جاتے تھے، بعض مقامات پر چوری اور ڈاکوؤں کی ایسی سنگین وارداتیں بکثرت ہوتی تھیں جو باوجود سخت احتیاطوں کے بھی

نہ رک سکتی تھین، اور ان کے باعث ملکی تجارت اور آمد و رفت مین سخت رخنہ اندازی ہو جاتی تھی۔ ان باتون کے علاوہ ملک کے مختلف مرکزون پر چنگی اور محاصل کی زیادتی تجارت مین خلل ڈالتی تھی۔ تمغہ یعنی ملکی محصول اور جزیہ (ہندون پر ٹیکس) کو موقوف کر کے اکبر نے سنہ ۱۵۶۳ء مین ملکی تجارت کے قالب مین نئی روح پھونک دی تھی لیکن چنگی جو ملک کے مختلف حصون مین لی جاتی تھی وہ عہد وسطیٰ مین عام طور پر تجارت مین خلل انداز ہوتی رہی

چند یورپین سیاحون کی تحریرات سے ہم سترھوین صدی عیسوی مین دوران سفر و کرایہ کے متعلق مندرجہ ذیل دلچسپ معلومات حاصل کرتے ہین:-

"سلطنت مغلیہ مین درآمد مال کے لئے آگرہ اور سورت کے درمیان مین دو مخصوص سڑکین تھین، ایک مشرقی جو گوالیار، سرونج اور برہانپور ہو کر گئی تھی۔ اور دوسری جو اجمیر پالی (مغربی راجپوتانہ کا مشہور تجارتی مقام) اور احمد آباد سے ہو کر گذرتی تھی۔ برنیر کے زمانہ مین سورت۔ احمد آباد اور آگرہ والی سڑک گوالیار اور برہانپور والی براہ راست سڑک سے بہتر حالت مین تھی لیکن حملون کی وجہ سے زیادہ خطرناک تھی۔ سنہ ۱۶۳۱ء مین منڈی نے براہ برہانپور سورت سے آگرہ کا سفر کیا یعنی تین سو چھیانوے کوس کی مسافت ترپن (۵۳) دن مین طے کی اور راستہ مین تمام ضروری باتون کو بغور دیکھتا ہوا آیا۔ اگر یہ سفر مسلسل جاری رکھا جاتا۔ تو چالیس (۴۰) دن مین پورا ہو جاتا۔

برنیر نے لکھا ہے کہ سورت سے دہلی مین شراب چھیالیس (۴۶) دن مین پہونچی تھی۔ ٹے ورنیر کا بیان ہے کہ سواری کے ذریعہ سے آگرہ اور پٹنہ کی مسافت پینتیس (۳۵) یا چالیس (۴۰) دن مین ختم ہوتی ہے۔ اور پٹنہ سے آگرہ جو ساڑھے پانچسو میل کا فاصلہ تھا سنہ ۱۶۲۰ء لغایت سنہ ۱۶۲۱ء مین آگرہ سے پٹنہ کو گیا تھا۔ اس کے حوالہ سے ہم کہہ سکتے ہین کہ ہر دو مقامات کے درمیان

خشکی کے ذریعہ سے باربرداری کا کرایہ ڈاک اور راستہ کے دیگر نقصانات کو شامل کر کے فی من دس ڈھائی ساٹھ پاؤنڈ) سوا اور ڈھائی روپیہ کے درمیان ہوتا تھا۔ ملکی تجارت اور آمدورفت کی جو آسانیاں ہندوستان کے دور وسطیٰ میں تھیں یعنی یہ کہ دہلی کا بازار دنیا کی منڈیوں کے مال سے بھرا ہوا رہتا تھا، اس کی بنا پر ہم کو یہ کہنے میں تامل نہیں ہے کہ اس زمانہ کے وسائل ضرورت زمانہ کے لحاظ سے کافی تھی، تجارتی مصروفیت اور چہل پہل جو دلی کے بازاروں میں تھی اس کے متعلق خلاصۃ التواریخ (۱۶۹۵ء) میں ہم کو یہ دلچسپ حوالہ نظر آتا ہے۔

"اس بازار میں دنیا کے ہر شہر اور بندرگاہ کی قیمتی اور نایاب اشیاء مل سکتی ہیں اور ایک جگہ لاکر فروخت کی جاتی ہیں بدخشان کا لعل، چمکدار موتی اور پکھراج، اور عمان کے موتی، اور اور دیگر اقسام کے اعلیٰ نمونوں کے جواہرات ایک جگہ ملتے ہیں۔ دوسری جگہ ہر قسم کا پارچہ سامان سوداگری، ہتھیار، کھانے پینے کی اشیاء، خوشبویات، اور دیگر اشیاء ملتی ہیں، ایک اور جگہ پر خشک اور تر میوہ ہر ملک کا فروخت ہوتا ہے، اور دوسری جگہ ہاتھی، بادرفتار گھوڑے، تیز قدم اونٹ اور دیگر ہزاروں جانور ملتے ہیں......... ہر روز خرید و فروخت کی چہل پہل رہتی ہے اور خریداروں اور فروخت کرنے والوں کی تعداد بے شمار ہوتی ہے۔ یہ کیفیت ہے کہ ایک دن میں شاہی سامان جو ایک سلطنت کے لئے کافی ہو مل سکتا ہے اور ہزار پاہیوں کا سامان ایک گھنٹہ کے اندر فراہم ہو سکتا ہے۔"

سفر کے ذریعے اور طریقے

تقریباً پچاس برس پہلے سوائے مذہبی اغراض کے دور کا سفر ہندوستانیوں میں مفقود تھا، لوگ عموماً اپنے گھروں کے قریب رہتے تھے اور ذریعۂ معاش زراعت یا کوئی چھوٹی موٹی دستکاری

ہوا کرتا تھا۔ ملازمت یا نوکری کے لئے سفر اختیار کرنا شاذ ہی کسی کو نصیب ہوتا ہو۔ اور جب کوئی ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتا تھا تو پیدل یا بیلوں پر سوار ہو کر جاتا تھا۔ یا اگر کشتی کا راستہ نہ ہوتا تھا تو بیل گاڑی یا دوسری قسم کی کوئی اور سواری استعمال ہوتی تھی مختلف اقسام کی ڈولیاں، چوڈولیاں، اور پالکیاں وغیرہ رائج تھیں جو سفر میں کام آتی تھیں۔ سنسکرت کی کتاب یوکتی کلپتارو مصنفہ راجہ بھوج میں جس کا زمانہ تصنیف گیارہویں صدی عیسوی ہے مختلف اقسام کی ڈولیوں کا تذکرہ ہے مثلاً ڈولا، چتر ڈول، اشتا ڈول، اور پریانکا۔ ان پالکیوں کے مختلف سائز ہوتے تھے اور نام بھی مختلف ہوتے تھے۔ مثلاً سجایا، ہنگلا، کرورا، انشیسا، متھوری، ہیرا، انیما وغیرہ وغیرہ بعض اشتا ڈول ڈولیاں آٹھ کیوبٹ فیٹ لانبی آٹھ کیوبٹ فیٹ چوڑی اور چھ کیوبٹ فیٹ اونچی ہوتی تھیں۔ اور ان کو آٹھ آدمی اٹھاتے تھے۔

ہندوستانی گاڑیاں جن سے موجودہ یکوں اور تانگوں کی ابتداء ہوئی ہے اور ہم جن کا ذکر پہلے کر چکے ہیں۔ بیلوں کے ذریعہ سے کھینچی جاتی تھیں۔ جو گھوڑوں کی طرح تیز جاتے تھے۔ اور ایک دن میں بارہ یا پندرہ لیگ کی مسافت طے کر لیتے تھے۔

ڈیلا والے کا بیان ہے کہ ہندوستان میں گاڑیاں بکثرت تھیں .... جن میں بیٹھ کر لوگ نہ صرف شہر میں پھرتے تھے بلکہ سفر بھی کرتے ہیں۔ اسٹے ورنیر کا بیان ہے کہ دو بیلوں کی گاڑی ایک روپیہ یومیہ میں کرایہ پر ملتی تھی چنانچہ سورت سے آگرہ کے سفر میں جو پینتیس چالیس دن کا تھا، چالیس پینتالیس روپیہ صرف ہوتے تھے۔ سورت سے گولکنڈہ کا بھی یہی فصل ہے۔ اور اسی طریق پر کل ملک میں سفر کا قاعدہ ہے۔

تھیو ونو کا بیان ہے کہ ہندوستانی گاڑی کا یومیہ کرایہ تقریباً ایک روپیہ ہے۔

انگریزی بگھیون اور گھوڑون کا سنہ ۱۸۰۱ء مین کرایہ حسب ذیل تھا جیسا کہ مسٹر ہکیسٹر ایک کلکتہ کے سوداگر کے اشتہار سے ظاہر ہوتا ہے۔

	یومیہ	ماہانہ
چوکڑی مع بگھی	[illegible]	[illegible]
جوڑی مع پالکی گاڑی	[illegible]	[illegible]
جوڑی	[illegible]	[illegible]
بگھی اور گھوڑا	[illegible]	[illegible]

پالکیان، ڈولیان اور دیگر اقسام کی پالکیان نہ صرف شہر مین بلکہ دُور کے سفرون مین بھی استعمال ہوتی تھین، چنانچہ ڈیلا ویلے اس بیان کا شاہد ہے۔ یوروپین لوگون کے سفر کے لئے جو پالکیان استعمال ہوتی تھین وہ غالباً وہی تھین جنکو ابوالفضل کے زمانہ مین سکھاسن کہتے تھے، اور ان مین اُٹھنے بیٹھنے لیٹنے اور سونیکی کافی گنجایش ہوتی تھی، اُنکی ساخت آجکل کی پالکیون سے مختلف تھی اور تمام جہام سے مشابہ تھین، عموماً چار آدمی اور لمبے سفر مین آٹھ اور بارہ آدمی باری باری سے اسکو اٹھانے کے کام آتے تھے، آجکل کی طرح جب بھی کہار ہی پالکیان اٹھاتے تھے۔ یہ لوگ ایسے سبک رفتار ہوتے تھے کہ پالکی مین بیٹھنے والے کو جنبش نہین ہوتی تھی، اور تیرہ چودہ لیگ روز سفر کرسکتے تھے، اور اگر سفر لمبا ہو یعنی ساٹھ یوم سے کم کا نہ ہو تو چار اور پانچ روپیہ ماہوار خشک پر ایک کہار مل جاتا تھا۔ گاڑیون کی بہ نسبت پالکی کا سفر گران تھا اور آرام دہ تھا، اور وہی لوگ اس مین سفر کرتے تھے جو مالدار ہوتے تھے۔ ریل کی اجرا سے قبل یوروپین اور دیگر لوگون کے پاس کہار لوگ مستقل طور پر ملازم رہا کرتے تھے، اُوریا قوم کے پالکی بردار اٹھارہوین صدی کے نصف آخری حصہ مین کافی روپیہ کمایا کرتے تھے، اور اس "تجارت" کے ذریعہ سے سال مین بعض دفعہ تین تین لاکھ روپیہ کما کر لیجاتے تھے، فرض کیجئے کہ ایک کہار کی سالانہ تنخواہ کا اوسط ۵۰ ہے، اور اگر وہ

تھے روپیہ سالانہ کی بچت کرتا ہی تو کلکتہ کے دس ہزار کہار (اس تعداد سے کم کہار کلکتہ مین نہ تھی) ہر سال تین لاکھ روپیہ بچا کر اپنے گھرون کو لیجا سکتے تھی۔ اور اگر ہم یہ فرض کرین کہ تین پالکی آٹھ کہار ملازم ہوتے تھے اور اٹھاروین صدی کے آخر مین کلکتہ مین بارہ سو پالکیان تھین، تو ہمارا اندازہ غلط نہ ہوگا۔ ۱۷۹۶ء مین پالکی ڈاک کی ذریعہ سے سفر کا کرایہ پوسٹ ماسٹر جنرل کی اعلان مین حسب ذیل ہی۔

کلکتہ سی بنارس تک	۵۰۰ صما
کلکتہ سی پٹنہ تک	۴۰۰ للعما

اور ان مقامات سی درمیانی مقامات کا کرایہ ایک روپیہ دو آنہ میل یا دو روپیہ چار آنہ فی کوس تھا۔" ذی مرتبہ مستورات بھی پالکیون اور چوڈولون مین عام طور پر سفر کرتی تھین اور کبھی کبھی مکدمبر مین بھی بیٹھتی تھین جو ہاتھیون کی پشت پر کسا جاتا تھا۔ بادشاہون اور راجاؤن کی سواری خوشنما تھی جو ہودہ کی صورت کا ہوتا تھا اور ہاتھی کی پشت پر رکھا جاتا تھا۔ برنیہ کے لکھنے کے بموجب "معظم تخت رواں، یا سنگھاسن مین جو آدمیون کے کندھون پر رہتا تھا۔ عام طور پر سفر کرتا تھا۔"

راجپوتانہ مین لوگ اونٹون پر سوار ہوتے تھے جنکی رفتار ستر کوس روزانہ ہوتی تھی، جیسا کہ پہلی ذکر ہوچکا ہی گھوڑے سواری، یا گاڑیون مین بہت کم کام آتی تھے۔ ٹے ورنیر کا بیان ہی کہ گولکنڈہ اور کیپ کامرن کے درمیان گاڑیان نہین چلتی تھین صرف بیل، اور باربرداری کے گھوڑے انسان کی سواری اور سوداگری مال کے لانے لیجانے کے کام مین آتے تھے۔ اور گاڑیون کی غیر موجودگی کے سبب وہان بڑی بڑی پالکیان ہوتی تھین جو ہندوستان کے دوسرے حصون مین نظر نہین آتی ہین۔ ان کی رفتار تیز، وزن ہلکا، اور خرچ کم ہوتا تھا۔"

قرونِ وسطیٰ کی سواریون مین ہندو جاتری دور دور کا سفر کرتے تھے۔ اس زمانہ مین یہ معلوم کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ سیکڑون بلکہ ہزارون مرد عورت اور بچے تمام ہندوستان مین پھیلے ہوئے تیرتھ گاہون تک کس طرح پہنچتے تھے۔

ٹے ورنیر کا بیان ہے کہ "یہ زیارتین یورپ کی طرح ایک دو آدمی نہین کرتے ہین بلکہ پورا قصبہ ارکئی کئی گانون کے آدمی مل کر روانہ ہوتے ہین تاکہ ایک کا دوسرے سے ساتھ ہے۔ ہر شخص حسب حیثیت سفر کرتا ہے۔ کوئی پالکی اور ڈولی مین تو کوئی بیل کی پشت پر، یا سواری میز غربا پیدل چلتے ہین، ماون کی گود مین بچے اور باپ کے سر پر برتن ہوتے ہین"۔ پٹنہ سے آگرہ کو واپسی کے وقت ۱۶۳۲ء مین پیٹر منڈی کو رام پور اپھوئی کے قریب ایک "رنگ" (یعنی سانگ) ملا تھا جسمین دو ہزار آدمی تروینی اور کاشی کو جا رہے تھے اور کاٹھیاواڑ موجودہ صوبہ بمبئی سے آ رہے تھے۔ دوسرے دن ہستا گانون کے قریب ایک اور سانگ ملا۔ پٹنہ سے روانگی کے بعد منڈی کو کم از کم ایک لاکھ جاتری راستہ مین ملا جو ہندوستان کی مختلف مقامات سے تروینی اور کاشی کو جا رہا تھا۔ وغیرہ وغیرہ۔ ان واقعات سے یہ مفید نتیجہ مرتب ہوتا ہے کہ قرون وسطیٰ مین اگرچہ آجکل کی سی سہولتین نہ تھین لیکن تیرتھ جاترا کے لئے لوگ دور دراز کے سفر بہ کثرت اختیار کرتے تھے

(مترجمہ) نقل (باقی)

اقوالِ زرّیں

(ای، ای اسپیٹ)

مترجمہ

(جناب عزیز احمد خان صاحب بی اے علیگ)

(۱)

ادب (لٹریچر) کی قدر نہ کرنا انسانی جوہر کی تذلیل ہے۔

(۲)

جسوقت چاند نکل آئے اور آفتاب ابھی افق مغرب ہی پر جلوہ افگن ہو تم اپنے گرد نظر ڈالو کہ اور بھی زیادہ حسین و دلربا منظر موجود ہونگے۔

(۳)

جب کبھی دو آدمی یکجا ہونگے اُن کا نگران کوئی نہ کوئی ضرور ہوگا۔

(۴)

اُدھر آفتاب نے باغ کی مشرقی دیوار پر سے جھانکا اُدھر لالہ و گل شبنم سے مُنہ دھوکر اور سنہری غازہ ملکر آموجود ہوئے۔ اس وقت باغ کسی بشاش ماں کے دل کی طرح شگفتہ ہوجاتا ہے۔

(۵)

ہر تصویر اپنے مصور کا عکس ہے۔

(۶)

حالانکہ سالمِ ہم سے قریب بلکہ بالکل قریب ہے لیکن اپنی خودی کا غبار ہمیں وہ ہمیں سجھائی نہیں دیتا۔

(۷)

دنیا جسقدر تیز ہوگی اُسیقدر جلد کند ہو جائیگی۔

(۸)

بے خبری سرِ ازلی کا سایہ ہے۔

(۹)

انسان کا نہایت قدیم اور لا علاج مرض اسکا ایسی چیزون کے ساتھ ہتک آمیز برتاؤ کرنا ہے جو اس سے زیادہ باعظمت ہین۔

(۱۰)

تنہائی کا غلبہ صرف اس وقت ہوتا ہے جب ہم یہ فراموش کر جاتے ہین کہ ہر خیال اور ہر احساس کے دو پہلو ہین۔

(۱۱)

کسی کی روح کا اندازہ اس کے بدن کی درازی سے نہ کرنا چاہئیے بلکہ درحقیقت خود اس شخص کا اندازہ اسکی رُوح سے کرنا چاہئیے۔

(۱۲)

بعض کی عظمت ان کی نصب العین کی وجہ سے ہے جسکی تکمیل مین وہ کوشان ہین، اور بعض گلہائے سرراہ کے مانند دلکش ہین۔

(۱۳)

ہر دوزخ جس کا تصور انسان کے دائرۂ تخیل مین آسکتا ہے عکس ہے اسی کے دل و دماغ کا جو رشک، حقارت، اور خواہشات بد کے پھندون مین پیچ و تاب کھاتا ہو۔

(۱۴)

ماضی کی دولت کا اندازہ حال کی روشنی ہی میں کیا جاسکتا ہے۔

(۱۵)

اُنھوں نے اپنی عقل و دانش کے عین کمال میں تیر امسخر کیا لیکن تیری سادگی کی روشنی میں ان کے چراغ گل ہو گئے۔

(۱۶)

پھول ہوں یا جواہرات — داد و دہش نہیں بلکہ اس کا احساس ہے جو دل پر نقش ہو جاتا ہے۔

(۱۷)

ان تاریکیوں میں سے جو تجھ پر چھائی ہوئی ہیں بعض اس لئے ہیں کہ تجھے دوسروں کی نظروں سے پوشیدہ رکھیں اور بعض اس حقیقت کو چھپانے کے لئے ہیں جن سے تجھے آگاہ کرنا منظور نہیں۔

(۱۸)

کوئی شخص ایسی آنکھوں سے جن کو مایوسی نے دھندلا کر دیا ہے کائنات کی حقیقت کا نظارہ کر سکتا ہے اور نہ ایسی آنکھوں سے جو گھمنڈ میں سرشار ہوں پھر بھی ان مناظر کی تجلیاں کسقدر بیش بہا ہیں۔

(۱۹)

علو لذت کا معیار یہ ہے کہ چار کو چکھنے سے اس تیزی کے رنگ کا پتہ لگا لیا جائے جس نے اس کی پتیوں کا طواف کیا تھا۔

غزل

(از جناب مولوی سبطین احمد صاحب ایم، اے، ال، ٹی، بدایونی)

فروغ خورشید مٹ گیا ہی، تجلیاں مہ کی گھٹ گئی ہین
سیاہ بالوں کی بدلیاں جب تمھاری چہرہ سی ہٹ گئی ہین

وہاں تجلی نظر کی دشمن، یہاں ادب ولولوں کو مانع
اٹھی ہیں قدموں سے جو نگاہین وہ دامنوں سے لپٹ گئی ہین

سنا ہی کل دیکھتے رہی تم چمن میں کچھہ ناشگفتہ کلیاں
یہاں بھی تھین دلمین حسرتین کچھہ جو لب تک آکر پلٹ گئی ہین

لحد مین جا سوئے یا الٰہی عزیز دغمخوار کیسے کیسے
کہ جب کبھی یاد آگئے ہین تو پہر دن نیندیں اچٹ گئی ہین

یہ زندگی زندگی نہ سمجھو کہ زندگی سے مراد ہین بس
وہ عمر رفتہ کی چند گھڑیاں جو ان کی صحبت مین کٹ گئی ہین

بھلا ہو کوئی خدا کا بندہ ہماری یہ کشتیاں ترا دے
بھنور سے جو بچکے آگئی تھین، قریب ساحل الٹ گئی ہین

کامیابی کا راز

(از جناب سید غلام حسن رضا صاحب رضوی بی، اے، دہلیگ)

ہم نے انتظام کیا ہے کہ ہمیشہ اس قسم کے سچے حالات زندگی کی اشاعت شمع کے ذریعہ سے کریں تاکہ نوجوانوں کو زندہ مثالوں سے سبق حاصل ہو۔ اور وہ خام خیالیاں جو ان کے دماغ میں پیدا ہو کر تمام عمر کو برباد کر دیتی ہیں نہ پیدا ہونے پائیں۔ اور ان بیش قیمت مثالوں سے ان کو وہ سبق حاصل ہو جو کتابوں کے مطالعہ سے عموماً حاصل نہیں ہوتا۔ امریکہ میں جو حیرت انگیز تبدیلیاں ہو رہی ہیں ان کا راز معلوم کرنا ضروری ہے۔ ہر شخص جو دنیا میں کامیاب ہونا چاہتا ہے وہ اپنی حالت کو سنبھالنے اور اپنی ترقی کے لئے باصول کوشش کرتا ہے یقین ہے کہ یہ سلسلہ شمع میں مقبول ہوگا۔ چونکہ اس کا تعلق ذہن کو ترقی دینے اور طبیعت کو ابھارنے سے ہے اس لئے ہمارے رسالہ کے ضروری مقاصد میں اس کا شمار ہے۔ اس سلسلہ کے جملہ حقوق محفوظ ہیں۔ "مدیران شمع"

مسٹر والگرین امریکہ کے ایک قصبہ میں دوا فروش کے دوکان پر ملازم تھے۔ کچھ عرصہ تک یہاں کام کرتے رہے، مگر قصبہ کی زندگی اور مختصر دوکان کی ملازمت انکی ضروریات زندگی کے لئے بھی کافی نہ تھی۔ مجبوراً شکاگو کا رخ کیا۔ جو امریکہ کا بڑا شہر ہے۔ ابتدا میں ایک معمولی دوا فروش کے یہاں چھوٹی سی نوکری مل گئی۔ اور کچھ عرصہ تک ان کی یہ حالت رہی کہ جدھر زیادہ آمدنی کی صورت نظر آتی تھی ادھر ہی کا رخ کرتے تھے۔

اسی زمانہ میں ان کو بخار آنے لگا۔ اور امراض بھی پیدا ہو گئے۔ بخار اور امراض سے تو

نجات مل گئی مگر ان کا اثر ابتک موجود ہے اور مسٹر وال گرین برسون کے بعد بھی زیادہ محنت نہین کر سکتے ہین غرض کہ اس بے اصول طرز زندگی مین عمر کی ۲۵ منزلین طے ہوگئین، اور وال گرین دن ورات اسی فکر مین رہے کہ کوئی موقع ترقی کرنیکا ہاتھہ آئے، اتفاق سے اُس زمانہ مین وہ جس دوافروش کے یہان ملازم تھے اُس نے بوجہہ ضعیفی اپنی دوکان کو فروخت کرنا چاہا اور مسٹر وال گرین اُسکو خرید بیٹھے، دوکاندار کی شرافت سے خریداری کا مرحلہ اس طرح طے ہوگیا کہ خریدار بالاقساط قیمت کو ادا کردے اگرچہ دوکان مین ادویہ زیادہ نہ تھین مگر چار سال کی طویل مدت مین کل قیمت ادا ہو سکی جس دن کہ رقم قرضہ کی اخیر قسط ادا ہوئی وال گرین نے اطمینان کا سانس لیا۔ مگر کچھہ سوچکر اُنکی ہمت ٹوٹ گئی۔ چار سال کی شبانہ روز محنت کے بعد وہ اس مختصر سی دوکان کے مالک ہوئے اور وہ دوکان بھی ادویہ کی! اس شہر مین اس قسم کی تجارت کے لئے نہایت عمدہ عمدہ اور مشہور دکانین اس کثرت سے موجود تھین کہ مسٹر وال گرین کو اپنی حماقت پر تاسف ہوا، اور چار سال کی محنت برباد ہونیکا بہت افسوس ہوا، کیونکہ اُن کے خیال کے مطابق اس کاروبار مین ترقی کی مطلق گنجایش نہ تھی، اُن کا دستور تھا کہ صبح و شام ایسے مقامات پر پہونچتے جہان مختلف پیشہ کے آدمیون سے

روٹیاں کمانے کیلئے دنیا مین نئے راستے محدود نہین

ہر شخص جو کسی کام سے لگ جائے اُسکو ہمت اور استقلال سے اسی کو جاری رکھنا چاہیئے، وہی کام ایک دن آدمی کا مستقل اور کامیاب ذریعہ بن جائیگا، جو لوگ یہ خیال کرتے ہین کہ ہمارے کامون مین اب کچھہ نہین رکھا ہے، احمق ہین اور سخت احمق ہین، خود ہمارا کاروبار اُن کے خیال کی تردید کرتا ہے، دوافروشی مین سخت مقابلہ کرنا پڑتا ہے کیونکہ اس کی دوکانین امریکہ مین بکثرت ہین لیکن ہم محض دوافروشی کے ذریعہ سے کثیر منافع حاصل کر رہے ہین، ہمارے ہمخیال ہزارون آدمی اپنے اپنے کامون سے خوب فائدہ اٹھا رہے ہین، یہ محض اتفاق ہے کہ دنیا مین کبھی کوئی نئی چیز آجائے اور موٹر وغیرہ کی تجارت کی طرح اسمین یکایک بہت فائدہ حاصل ہو لیکن انسان کی بڑی تعداد کو پرانے کاروبار پر ہی قناعت کرنی ہوگی۔ میرا عقیدہ ہے کہ معمولی آدمی کو ترقی کرنے اور کم نقصان اٹھانے کے مواقع زیادہ ہین۔ کیونکہ اپنی سمجھی ہوئی پرانی تجارت پر انسان کو زیادہ قابو ہوتا ہے، اگرچہ اس کاروبار مین بکثرت مقابلہ کیون نہ ہو،

ملاقات ہوتی، غرض یہ ہوتی تھی کہ اُنکی باتین سنکر اور حالات معلوم کرکے کوئی ایسی ترکیب ہاتھ آئے جس سے آمدنی کو فروغ اور تجارت مین کامیابی نصیب ہو۔ اسی سلسلہ مین اُن کی ملاقات غلّہ کے ایک آڑھتیے سے ہوگئی اور شام کا وقت اُس کے پاس گذرنے لگا جہان اس کام کے کرنے والون کا مجمع رہا کرتا تھا۔ عرصہ تک یہ سوسائٹی ان کو ملتی رہی اور وہان غلّہ کے تاجرون کی بدنصیبی اور کامیابی کے حالات سُننے مین آتے رہے۔ اور دوکان ایک ملازم کی سپردگی مین رہی، ان لوگون سے میل جول نے ان کے دماغ مین یہ خیال پیدا کر دیا کہ لوگ نفع بھی حاصل کرتے ہین اور نقصان بھی اُٹھاتے ہین اور عام طور پر ہر شخص اسی فکر مین رہتا ہے کہ کس طرح یکایک دولتمند ہو جائے۔ مگر وہی لوگ خوش اور کامیاب نظر آتے جو اپنی کامون مین ہمہ تن مصروف تھے اور اپنی تجارت کی ادھیڑ بُن مین لگے ہوئے تھے۔ ان حالات کو دیکھکر اُنکی طبیعت پر اثر پیدا ہوا اور ایک روز اُنکی ملاقات ایک ایسے شخص سے ہوئی جسکو اس کی حیثیت سے زیادہ تجارت مین نقصان ہو گیا تھا۔ اس گفتگو کے بعد اُن کا دماغ مین چکر آنے لگا اور وہ نصف گھنٹہ تک کرسی پر خاموش بیٹھے ہوئے کچھ سوچا کئے۔ اور جب کرسی پر سے اُٹھے تو حقیقت کا انکشاف ہو چکا تھا اور وہ اپنی رائے قایم کر چکے تھے۔ مسٹر وال گرین اس واقعہ کا بیان اس طرح کرتے ہین کہ

"یہ محض اتفاق ہے کہ مین دوا فروش ہون۔ اگر مین بنک کا کام کرتا تو بھی اس سے زیادہ مناسبت ہوتی، مگر چونکہ اتفاق کے ہاتھون مین ایک پیشہ اختیار کرکے اُس مین چند سال گذار چکا تھا اس لئے اُس سے دستکش ہونا عقل کے بالکل خلاف ہوتا۔ مین نے نصف گھنٹہ کامل غور کرنے کے بعد یہہ رائے قایم کی کہ جو کام کر رہا ہون اور جس سے مجھے واقفیت بھی ہے اُس مین محنت کرکے مجھکو کامیابی حاصل کرنی چاہئے۔" اس اصول کو انھون نے مندرجہ ذیل الفاظ مین ادا کیا ہے:

"جو شخص جس تجارت مین داخل ہو چکا ہے، اُسی مین کامیابی کی بہترین صورتین پیدا ہو سکتی ہین۔ خواہ وہ اس پیشہ مین کتنا ہی نیچے کیون نہ ہو لیکن اگر وہ معمولی دل و دماغ کا انسان ہے تو یقینی طور پر ایک دن

چوٹی پر پہونچ جائے گا۔ اور کسی نئے کام کی بہ نسبت اُسکی ترقی کی رفتار بہت تیز ہوگی۔ اگر کسی شخص نے ایک پیشہ یا علم چند سال مین حاصل کیا ہی، تو دوسرے نئے کام کے بہ نسبت وہ پہلی کام یا علم مین اُتنے ہی سال آگے رہیگا۔ اور اُن لوگون سے بھی اُتنا ہی عرصہ آگے رہیگا جو اس کام کو اس کے بعد شروع کرین گے۔ جسوقت یہ خیال جو بجاے خود بہت معمولی ہی مگر سچائی اور واقفیت مین اپنا نظیر نہین رکھتا ہی میرے ذہن مین آگیا۔ تو سوائے اس کے کوئی چارہ کار نہ رہا کہ تمام توجہ اپنی دوکان پر صرف کرون مجھکو اسوقت اندازہ ہوا کہ مین نے اپنا کیسا قیمتی وقت ضایع کر دیا تھا، اور دوسرون سے میل جول پیدا کر کے ترقی اور کامیابی کے راز معلوم کرنے کی فکر کیسی لغو تھی! مین نے عہد کیا کہ اپنی پیشہ کو کامیاب بناؤن گا اور اپنی ساری عمر اسمین کوشش صرف کرون گا۔"

یہ واقعہ پندرہ برس کا ہی، اور آج مسٹر ڈال گرین تو تین دوا فروشی کی دوکانون کے مالک ہین اور امریکہ سے ملک مین کامیاب تاجر اور متمول آدمی شمار ہوتے ہین۔

یہ فیصلہ کرنے کے بعد ڈال گرین نے گردش تقدیر کی زنگ خوردہ سامانی کو اپنی قابو مین لینے کی فکر شروع کر دی اور اپنی تجارت کو فروغ دینے اور اسمین کامیابی حاصل کرنے کے لئے ایسے شد و مد کے ساتھ توجہ کی جو اُنکی زندگی مین پہلی مثال تھی اور یہ دستور العمل بنا لیا کہ "جو شخص دوا فروش ہی اُس کی کامیابی کا بہترین ذریعہ صرف دوا فروشی ہو سکتی ہی۔"

دوکان پر پہونچکر اُنھون نے سب سے پہلے یہ محسوس کیا کہ جس قاعدے اور ترکیب سے وہان دوائین رکھی ہوئی تھین وہ دلفریب نہ تھا۔ ملازم کو ساتھ لیکر کُل دوکان کی صفائی شروع کر دی اور گرد و غبار کو صاف کر کے ادویہ کو ٹھکانے اور طریقہ سے رکھا، دوکان کے سامان کی جگہ بدلی۔ اور تھوڑی سی توجہ سے پوری دوکان کو چمکا دیا۔ اس سے فارغ ہو کر دونون نے تجارت کو فروغ دینے کی وہ کوشش شروع کر دی جو کھلاڑی فٹ بال اور ہاکی کے میچ جیتنے کے لئے کرتے ہین۔

دوکان کے پاس کے رہنے والے ایتک ڈال گرین کی ایک ترکیب کا ذکر کرتے ہیں اور وہ خود بھی اس واقعہ کو مسکرا کر بیان کرتے ہیں یعنی دوکان سے قریب رہنے والے جب ٹیلیفون کے ذریعہ سے دوا منگاتے تھے تو جس عرصہ میں ڈال گرین ان لوگوں کو ٹیلیفون پر باتوں میں لگائے رکھتے تھے اسی عرصہ میں دوکان کا منشی فلو ہوشیار کو دوا اسی کے ہاں ان کے مکان پر پہونچا دیا کرتا تھا۔ لوگوں کو دوکان کی خوش انتظامی پر حیرت ہوتی تھی اور وہ لوگ اس کا ذکر اپنے احباب اور رشتہ داروں سے کیا کرتے تھے۔ اس ایک معمولی ترکیب سے قرب وجوار میں مسٹر ڈال گرین اور ان کے دواخانہ کی اچھی شہرت ہوگئی، اور دواؤں کی بکری میں کافی اضافہ ہونے لگا۔ لیکن مسٹر ڈال گرین نے ترکیبوں اور کوششوں میں مطلق کوتاہی نہ کی۔ اور تجارت کو بڑھانے میں آئے دن نئی ترکیبیں اختراع کرتے رہے۔

ایک دن ان کا ایک پہلا آقا جو پاس ہی دوا فروشی کا کام کرتا تھا ان کی دوکان میں آیا۔ اس کے کانوں میں کچھ عرصہ سے ڈال گرین کی بسرعت تکمیل آرڈر اور دوا کی خوبیوں کی تعریفوں کی صدائیں آرہی تھیں پہلے تو دو ایک بار دوکان کے سامنے سے گذرا تاکہ دوکان کی رونق اور سنی سنائی تعریفوں کا کچھ اندازہ کرسکے۔ اس کے بعد وہ خود دوکان میں آگیا اور کہنے لگا "میں چاہتا ہوں کہ تم میری دوکان خرید لو۔ دو چار دنوں میں تمہاری حالت بڑھ جائیگی۔ اور مجھے یقین ہے کہ میری دوکان سے تم کو فائدہ پہونچے گا کیونکہ میں نے اسی کے ذریعہ سے کافی روپیہ کمایا ہے۔ اب میں گوشہ نشین ہونا چاہتا ہوں۔ میں نے تم کو اس لئے منتخب کیا ہے کہ میں جانتا ہوں تم میری دوکان سے اچھی طرح فائدہ حاصل کرسکو گے۔"

ان کا بیان ہے کہ اس گفتگو سے مجھے سخت حیرت ہوئی۔ مگر میں نے وہ دوکان پندرہ ہزار روپیہ نقد، اور دس ہزار روپیہ سالانہ علاوہ سود کی اقساط سے خرید کرلی۔ لہذا ادائیگی کے لئے مجھے روپیہ قرض لینا پڑا۔ اور اب وہ زمانہ نہ تھا کہ میں قرضہ کے لئے سرگرداں پھرتا اور روپیہ دینے والے مجھ سے بہانے کریں، زر قرضہ باسانی حاصل ہوگیا۔ اور اب مجھے اپنی پہلی رائے کہ شکاگو میں دوا فروشی کی دوکانیں بہت ہیں اور

یہاں ترقی کرنا ناممکن ہے" قطعی یاد نہ رہی آج میرا یہ خیال ہے کہ شکاگو میں ڈال گرین کی دوا فروشی کی دکانیں ابھی کافی تعداد میں نہیں ہیں۔ اور ان کی تعداد میں اضافہ کی گنجایش ہے، دوسری دوکان سنبھالنے کے بعد مجھے یہ سبق حاصل ہوا کہ تیسری دوکان بھی کھولنی چاہیے، اگر تیسری دوکان کے کھولنے کا فیصلہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے، میری پہلی دوکان کے سامنے کی دوکان خالی ہوئی۔ اور میرے کانوں میں آوازیں آئیں کہ بعض لوگ اسمیں دوا فروشی کی دوکان قایم کرنا چاہتے ہیں۔ روزانہ دو ایک آدمی مجھ سے اس کا ذکر کرتے تھے اور میں صحیح طور پر کہتا ہوں کہ اس قسم کی اطلاعات سے مجھے سخت تکلیف ہوتی تھی، اور خیال ہوتا تھا کہ یہ تیسری دوکان مجھکو لے لینی چاہیے۔ مگر بدقسمتی سے میرے پاس ایک پیسہ بھی نہ تھا، دونوں دکانوں سے جو کچھ یافت ہوتی تھی وہ دوسری دوکان کی اقساط کی ادائیگی میں جاتی تھی لیکن اس خوف سے کہ میرا دا تجارت کو نقصان پہونچ جائے میں نے تھوڑے فاصلہ پر تیسری دوکان کھول دی، ایک طرح پر تو یہ طریقہ خطرناک تھا کیونکہ مجھپر قرض کا بار اور زیادہ ہوگیا، لیکن مجھکو تینوں دوکانوں کے لئے مال نہ خریدنا پڑا، اسمیں اپنی پہلی دوکان سے حسب ضرورت بقیہ دونوں دوکانوں پر سامان بھیج دیا کرتا تھا،

میری دوکان کے سامنے دوا فروشی کی دوکان قایم ہوجانیکا خطرہ بھی رفع ہوگیا اور اس جگہ دوا فروشی کی دوکان کی بجائے قہوہ خانہ کھل گیا۔ اور اس طرح پر مقابلہ کے نقصان سے میں نے اپنے آپکو محفوظ کرلیا۔

اب میری آمدنی اور بڑھ گئی۔ اور میں دوکانوں کو قائم رکھنے کے شغل میں جو دلچسپی کا سامان فراہم ہوگیا وہ الگ تھا، چونکہ آمدنی زیادہ ہوگئی تھی اس لئے تجارت کو پھیلانے کے مواقع سہل ہوگئے اور تیسری دوکان کی کامیابی کو دیکھتے ہوئے جو کچھ روپیہ میرے ہاتھ لگا میں نے اس سے ایک اور دوکان کی ابتدا کردی، اور اسکی کامیاب حالت دیکھکر ایک اور دوکان کھولدی۔

سنہ ۱۹۱۲ء میں میری صرف دو دوکانیں تھیں، سنہ ۱۹۱۳ء کے آخر میں پانچ تھیں، اور سنہ ۱۹۱۹ء

اور سنہ ۱۹۲۴ء میں نو سے تعداد رہی۔

میں ان کی تعداد تھی، سنہ ۱۹۱۹ء میں چودہ، سنہ ۱۹۲۰ء میں تیئیس، سنہ ۱۹۲۲ء میں انتیس، سنہ ۱۹۲۴ء میں اُنچاس۔ اس زمانہ میں بہ سرعت ترقی کرنے کے اعتبار سے ڈال گرین کی دوکانوں کا جواب دنیا میں نہیں ہے۔ ہر سال منافع کی تعداد دوگنی ہوجاتی ہے۔ اور یہی حال نکری کا ہے، قابل توجہ یہ بات ہے کہ روپیہ پیسہ کے متعلق اس کاروبار کے اصول بالکل صحیح رکھے گئے ہیں اور صحیح اصول پر ہی دوکانوں کی ابتدا رکھی جاتی ہے۔ اگرچہ گھاس کی طرح دوکانیں پھیلتی ہیں مگر انمیں گھاس کی سی کمزوری اور ناپائیداری نہیں ہے۔

اب ڈال گرین کے دفتر میں بیٹھکر ان کی ابتدائی جدوجہد اور مایوسیوں کا اندازہ بھی نہیں ہو سکتا ہے۔ اور یہ مشکل یقین آتا ہے کہ ۲۳ برس کی عمر کا آدمی اپنے کاروبار میں ایسی حیرت انگیز ترقی کر سکتا ہے۔ اس دفتر میں امن اور خوشحالی کے آثار ہیں، مگر ترقی کی جدوجہد اور کامیابی کا جوش گرد و پیش موجود ہے اس کمرہ میں جو سامان ہے قیمتی ہے اور آرام دہ ہے۔ مگر تکلف سے خالی ہے اور مالک دفتر مصروف اور ہنگامہ خیز زندگی کا عادی ہے۔

مسٹر ڈال گرین کا مقولہ ہے کہ میری کامیابی اس لئے ہوئی تھی کہ مجھے اپنے کاروبار سے دلچسپی نہ تھی۔ اور جو کام کرتا تھا اس میں جی لگاتا تھا، جو لوگ اپنے کاروبار میں ترقی نہیں کرتے ہیں یا جنکی ترقی محدود ہو کر رہ گئی ہے انکی میری سی سابقہ حالت ہے اور وہ اس خواب میں پڑے ہوئے ہیں کہ کوئی عمدہ موقع نکل آئے تو ترقی حاصل ہو۔ میں اب بھی ایک شخص سے ملتا رہتا ہوں جسکی دوکان میری پہلی دوکان کی برابر تھی اور وہ میرا ہمعصر تھا، ہم اور وہ ہم خیال تھے۔ فرق یہ تھا کہ میری دوکان دوا فروشی کی تھی اور اسکی دوکان خوردنی سامان کی تھی۔ میری طرح اسکو بھی عمدہ موقع کی تلاش رہتی تھی اور جب وہ مل جاتا تھا تو پہلے کام کو چھوڑ کر نیا کام شروع کر دیتا تھا۔ مگر کچھ عرصہ کے بعد اس میں بھی زیادہ فائدہ نہ معلوم ہوتا تھا اور وہ کوئی تیسرا کام شروع کر دیتا تھا، ایک مرتبہ ایک اور نیا

کام اُس کے ہاتھ آگیا اور وہ کچھ چیزیں میرے ہاتھ فروخت کرنے کے لئے آیا۔ میں واقف تھا کہ وہ نئی کام کے ساتھ تبدیل مقام بھی کرنیکا عادی تھا۔ اس لئے میں نے سوال کیا کہ تم اپنا پہلا کام یعنی خوردنی سامان کی تجارت کو کیوں نہیں شروع کرتے ہو؟ اُس نے جواب دیا "بھلا اس میں اب کیا دھرا ہی؟ چکاگو میں بہت دوکانیں کھل گئی ہیں اور بعض آدمیوں نے تو خود کئی کئی دوکانیں قایم کرلی ہیں۔ میری مختصر سی دوکان میں فائدہ کی کیا امید ہوسکتی ہی؟"

میں نے کہا "تم ٹھیک سنی! اگر تم کو اوروں پر یہ فوقیت ہی کہ تمھارا تجربہ بڑھا ہوا ہی اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ لوگوں نے اپنی کئی کئی دوکانیں بھی قایم کرلی ہیں اور اس تجارت کو کرنیوالے بھی بہت پیدا ہوگئی ہیں مگر جہاں تمھاری پہلی دوکان تھی وہاں اب ایک شخص یہی کام کررہا ہی اور کما رہا ہی، غالباً بارہ ہزار روپیہ میں اپنا کاروبار فروخت کردے گا۔ چند ہی روز ہوئے کہ وہ مجھ سے کہہ رہا تھا کہ ضعیفی کے سبب سے اب میں خانہ نشین ہونا چاہتا ہوں۔ اس موقع کو غنیمت سمجھو اور دوکان خرید لو۔" اُس کا جواب تھا کہ "میرے پاس کافی روپیہ ہی اور میں اس کاروبار کو خرید سکتا ہی، مگر ذرا سی دوکان میں تجارت کرنا میرے قابو کا کام نہیں ہی۔"

مجھے یہ جواب ناگوار گذرا، مگر میں نے اُس کو سمجھایا کہ "دیکھو جس شخص نے تم سے کاروبار خریدا تھا تم اُس سے بہتر تاجر تھے۔" اُس نے اقرار کیا، میں نے کہا "تم کو معلوم ہی کہ اب وہ چار دوکانوں کا مالک ہی، اور وہ چاروں دوکانیں یہیں موجود ہیں، اور اب وہ کم از کم تیس لاکھ روپیہ کی حیثیت کا آدمی ہو۔"

جواب ملا کہ "وہ خوش نصیب تھا!"

میں نے کہا "تم بھی ایسے ہی خوش نصیب ہوتے بشرطیکہ تم محنت اور شوق کے ساتھ کام کئے جاتے۔

میرا عقیدہ ہے کہ تم مجھ سے بہتر تاجر تھے، تمکو دیکھو اور میری ترقی کو دیکھو، کوئی وجہ نہ تھی کہ تم مجھ سے زیادہ ترقی نہ کرتے کیونکہ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ لوگ خوردنی سامان کو دواؤن سے زیادہ خرید کرتے ہین"۔

اُس کو بھی جوش آگیا اور کہنے لگا "بس اب اس خرافات کو بند کرو، تم بہت ہی خوش نصیب تھے"

ظاہر ہے کہ ایسے آدمی سے بحث کرنا بالکل عبث ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ میری طرح ہر شخص کے راستہ مین ترقی اور کامیابی کے راز موجود ہین شرط یہ ہے کہ آدمی معمولی قابلیت اور معمولی ذہنیت کا ہو۔ اس زمانہ مین بھی جبکہ ہر قسم کے کاروبار مین ہزارون آدمی گھسے ہوئے ہین، ترقیون کے مواقع بہ کثرت موجود ہین، مگر مین پھر کہونگا کہ ترقی اسیوقت ممکن ہے جبکہ آدمی کا چال چلن درست ہو اور عادتین خراب نہ ہون، ورنہ کیا یہ ممکن ہے کہ انسان کوشش کرے اور اپنے مقصد مین کامیاب نہ ہو؟ قاعدہ ہے کہ نگاہ ڈالو تو طرح طرح کی دلفریب تجارتین سامنے آئین گی، لیکن اگر تم یہ کہہ سکتے ہو کہ "جو کام مین کر رہا ہون اُس سے واقف ہون" تو تمھارا فرض ہے کہ تم اُسی کام مین اور زیادہ توجہ کرو، اور اُس کے اندر گھس جاؤ، یقینی طور پر کامیاب ہوگے۔ لیکن دنیا عجیب مقام ہے دوسرون کی تجارتین ہمیشہ بھلی معلوم ہوتی ہین۔

مین نے اپنی تجارت کے علاوہ کہین سے بھی ایک پیسہ نہین کمایا، مگر مین نے بہت سے شرطیہ کمانیوالون کو نیچا دکھا دیا ہے کیونکہ میرا اصول یہ ہے کہ "اپنی تمام توجہ ایک کام مین لگا دو، اور اُسی کو اپنا ایک ذریعہ آمدنی قرار دے لو"، تو یقین ہے بلکہ عین الیقین ہے کہ مختلف کاروبار کی مجموعی آمدنی تمھارے اُس ایک کام کی آمدنی سے کم رہیگی، مین اگر مختلف قسم کے کاروبار چھیڑ لیتا تو مجھے آمدنی ضرور ہوتی، مگر میری اصل آمدنی جو کہ اخیر مین کئی آمدنیون کے ذرائع کے مجموعہ سے زیادہ ہوتی۔ کم ہو جاتی۔

جو لوگ اپنی توجہ کو کئی جگہہ تقسیم کر دیتے ہین تکلیف اُٹھاتے ہین اور کئی کئی چیزون مین اُن کو اپنی توجہ لگانی پڑتی ہی، حالانکہ اگر وہ صرف ایک کام کرتے تو رفتہ رفتہ اُس پر کامل دسترس حاصل ہوجاتی اور کامل توجہ ایک طرف لگی رہتی اور اسی ایک کام سے آمدنی بھی بڑھتی رہتی۔ یہانتک کہ وہی ایک کام پھیل کر آمدنی کا نہایت کامیاب اور مستقل ذریعہ بن جاتا۔

مسٹر وال گرین نے جب اپنی تجارت کو پھیلانا شروع کیا تو انھون نے یہ اصول اچھی طرح ذہن نشین کرلیا تھا کہ ہر جدید دوکان کی کامیابی اُس کی کثرت فروخت پر منحصر ہی۔ چنانچہ انھون نے ہر جدید دوکان قایم کرکے یہی کوشش کی کہ وہان مال بہ کثرت فروخت ہو اور اس طرح اُن کی آمدنی مین اضافہ ہو۔ انھون نے دوکانون کا مسئلہ اپنا ذاتی مسلہ سمجھ لیا تھا اور اُن کی بقا اور سرسبزی مین ایسی ہی کوشش کرتے تھے جیسی کہ اپنی جسم اور اپنی تندرستی کے تحفظ مین ایک سمجھدار آدمی کو کرنی چاہئے۔ چنانچہ وہ معمولی معمولی مواقع سے بھی فائدہ اُٹھاتے تھے۔

سنہ ۱۹۱۴ء مین اُن کی ایک دوکان کی سالانہ بکری پچھتر ہزار روپیہ تھی، سنہ ۱۹۱۶ء مین نوّے ہزار ہوگئی، سنہ ۱۹۱۸ء مین ایک لاکھ انتیس ہزار تھی، اور سنہ ۱۹۲۰ء مین دو لاکھ گیارہ ہزار روپیہ تک پہونچ گئی تھی، مگر مسٹر وال گرین اس ترقی سے مطمئن نہ تھی، اس لئے سنہ ۱۹۲۱ء سے انھون نے اخبارون مین اشتہار دینا شروع کیا، مگر اُن دوا فروشون کو جن کی بکری محض مقامی ہوا کرتی ہی اشتہارات سے کیا واسطہ؟ اکثر لوگون نے اعتراض کیا مگر وہ اپنی رائے پر پابند رہی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سنہ ۱۹۲۲ء مین ہر ایک دوکان کی فروخت کا اوسط ڈہائی لاکھ روپیہ اور سنہ ۱۹۲۴ء مین سوا تین لاکھ روپیہ سالانہ تھا! اسی اثنا مین اُن کی دوکانون کی تعداد دونی ہوگئی تھی یعنی آمدنی کا اوسط چوگنا ہوگیا تھا، اور یہ ترقی صرف چار برس کی محنت اور توجہ کا نتیجہ تھی۔

مسٹر وال گرین نے یہ بھی بیان کیا کہ "مین صرف روپیہ پیدا کرنے کی خاطر اپنی کاروبار کو وسعت نہین دیتا ہون جو لوگ میرے سکھائے ہوئے ہین اور جن پر مین وقت اور محنت صرف کر چکا ہون ان کو بھی قدرتی طور پر ذاتی ترقیون کی خواہش ہوتی ہی، اگر مین صرف ایک معیار پر اپنی کاروبار کو پہونچا کر اس کی ترقی روک دون تو یہ لوگ بھی کچھ عرصہ کے بعد اپنی ترقی کی خواہش مین میرے کاروبار کو چھوڑ کر دوسری جگہہ چلے جائین گے۔ اور جو نقصان میرے کاروبار کو پہونچیگا وہ ظاہر ہی غرضکہ میرے کاروبار کی ترقی کے ساتھ میرے ملازمین کی بھی ترقی ہوتی رہتی ہی، اور نوجوانون کو میرے ہی یہان ترقیان کرنے کے مواقع ملتے رہتے ہین۔

میری ترقیون کا یہ قاعدہ رہا ہی کہ پہلے مین نے ایک حد مقرر کر لی۔ اور جب اس مین کامیاب ہوگیا تو اور مشکل حد قایم کی، غرضکہ دشواریون کو فتح کرنا میرا نصب العین ہی اور یہی میری ترقیون کا راز ہی۔ یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ مین سخت جفاکش آدمی ہون، مین بہت کافی آرام لیتا ہون، میری نشستین طولانی نہین ہوتی ہین، اور مین لمبی چھٹیان لیکر قطعی کاروبار سے علیحدہ ہوجایا کرتا ہون اور اس طرح اپنی جسم اور دماغ کو پورا آرام پہونچاتا ہون کیونکہ ۱۸۹۸ء کے بخار کے بعد بہت کمزور ہو گیا ہون اور زیادہ محنت کا متحمل نہین ہو سکتا ہون" فقط

معلومات

از

(جناب مولوی محمد حسین صاحب حسان ندوی)

سونا کہان جاتا ہے؟

ایک تجارتی رسالہ نے سونے کے متعلق زبردست اعداد و شمار شائع کئے ہین، نیز یہ کہ امریکہ کے انکشاف سے ابتک کس قدر سونا کانون سے برآمد ہوا ہے، چنانچہ اس تحریر کے بموجب اس وقت تمام دنیا کے بازارون مین ۲۰۰۰ ملیون سونا موجود ہے حالانکہ اس وقت سے ابتک کانون سے ۴۰۰۰ ملیون پونڈ سونا نکل چکا ہے یہ امر تعجب انگیز ہے کہ آخر اسقدر کثیر المقدار سونا کہان چلا گیا۔

اس سوال نے آجکل زبردست اہمیت حاصل کر لی ہے، اور خطرہ محسوس کیا جارہا ہے کہ آیندہ کانون سے سونے کی برآمد روز بروز کم ہوتی جائیگی چنانچہ اس کا اندازہ سنہ ۱۹۱۵ء اور سنہ ۱۹۲۵ء کے اعداد و شمار سے کیا جاسکتا ہے۔ جو ناظرین کی دلچسپی کے لئے ذیل مین درج کیا جاتا ہے۔

	سنہ ۱۹۱۵ء	سنہ ۱۹۲۵ء
جنوبی افریقہ	۱۸۸۰۳۲۰۰۰	۱۹۷۹۲۵۰۰۰ ڈالر
ولایات متحدہ	۱۰۱۰۳۶۰۰۰	۵۰۵۷۰۰۰۰ "

	سنہ ۱۹۱۵ء	سنہ ۱۹۲۵ء
کنیڈا	۱۸۹۷۸۰۰۰	۳۱۵۳۰۲۰۰۰ ڈالر
آسٹریلیا	۳۹۹۸۸۰۰۰	۱۲۸۹۳۰۰۰ ڈالر
میکسیکو	۹۵۵۹۰۰۰	۱۶۳۸۰۰۰۰ "
روڈیشیا	۱۸۹۱۵۰۰۰	۱۳۰۰۲۰۰۰ "
ٹرانسوال اور سائبیریا	۲۶۳۲۲۳۰۰۰	۱۳۰۰۲۰۰۰ "
برطانوی ہند	۱۲۷۳۹۰۰۰	۸۱۹۳۰۰۰ "
دیگر ممالک	۳۷۳۴۵۰۰۰	۴۲۷۰۱۰۰۰ "
میزان	۳۷۰۰۲۶۰۰۰	۳۸۹۱۷۰۰۰۰ "

ان اعداد وشمار سے ظاہر ہے کہ سنہ ۱۹۲۳ء میں جو سونا برآمد ہوا ہے سنہ ۱۹۱۵ء کے مقابلہ میں ۸۰ ملیون ڈالر کم ہے یعنی ۱۶ ملیون انگریزی پونڈ سے زیادہ۔

جنگ عظیم کے زمانہ میں مالی تجربات نے آشکارا کر دیا ہے کہ قوموں کے مالی نظام کو استوار رکھنے کے لئے سونا ایک زبردست ترین بنیاد ہے، اور اب تو ہر ملک اور ہر قوم نے تہیہ کر لیا ہے کہ سونے کی نہایت کثیر مقدار خزانوں میں محفوظ رکھیں تا کہ جاری شدہ نوٹوں کے لئے ضمانت ہو۔

اسی لئے جس وقت سونے کی کانیں ٹوٹنے کے قریب ہونگی سونے کی مقدار روز بروز کم ہو کر بہت کم ہو جائیگی۔ یقیناً یورپین قومیں سونا ملک میں واپس لانے کے لئے مضطرب ہونگی چنانچہ جنگ عظیم کے زمانہ میں ہی ہوا کہ باہر کے لئے سونے کی برآمد روک دی تھی، لیکن اس کے

بعد پہلی حالت پھر عود کرآئی اور اب ہر ملک سونے کی مقاومت کر رہا ہی۔ لیکن عجیب بات یہ ہی کہ بڑی سے بڑی قوم اور بڑے سے بڑے ملک کی پاس باوجود اسقدر آسانیون کے خزانہ مین سونیکی مقدار روز بروز کم ہو رہی ہی۔

ایک ماہر اقتصادیات سخت بحث و تحقیق کے بعد اس نتیجہ پر پہونچا ہی کہ ہندوستانی گھرون مین سونا محفوظ رکھتے ہین۔ یا تو عورتون کے لئے زیورات بنواتے ہین یا تنگی ترشی اور مصیبت کے خوف سے زمین مین گاڑ دیتے ہین۔ گڑے ہوئے سونے کا عدم وجود برابر ہی کیونکہ تجارت کو اس سے کوئی فائدہ نہین اس کے علاوہ اس طریقہ سے وہ پورے طور پر محفوظ بھی نہین رہتا۔ بسا اوقات مالک مرجاتا ہی اس کے ساتھ اس کا راز بھی چلا جاتا ہی اور سونا مٹی کے نیچے دبا رہ جاتا ہی گویا کان سے نکلا ہی نہ تھا۔

اس کمی کے ذمہ دار صرف ہندوستانی ہی نہین ہین، کیونکہ آجکل کی مصنوعات مین سونے سے بہت کام لیا جاتا ہی۔ چنانچہ اس زمانہ مین دانتون کے لئے سونے کے خول بنوانے کا رواج عام ہو گیا ہی۔ بہت لوگ مرجاتے ہین اور سونا اُن کے منہ مین رہ جاتا ہی، یہ مقدار اگرچہ قلیل اور ناقابل ذکر ہی لیکن صدیون اور قرنون کے گذر جانیکے بعد یہی قلیل مقدار حساب لگانے پر حیرت مین ڈالدے گی۔

(بقیہ)

آب حیات کی تلاش

(از مسٹر جے ، آر ، رائے)

الفاظ "آب حیات" کے پس پشت ایک خیال ایک کہنہ سال عقیدہ اور انسان کی فطری تمنا مضمر ہے، آدمی ساٹھ، ستر یا اسی نوے سال تک زندہ رہنے پر قانع نہیں، وہ عمر نوح حاصل کرنے کے درپے ہے، اسی فطری تمنا سے یہ خیال وجود پذیر ہوا ہے اور یہ ایک قوم یا زمانہ یا ملک تک محدود نہیں ہے، بلکہ ہر مذہب و قوم کے درمیان اسے قبولیت عامہ کا شرف حاصل ہوتا آیا ہے اور اسے پورا کرنے کی کوشش بھی برابر ہوتی چلی آتی ہے، اسی آرزو نے مذہبی روایات میں بھی اظہار پایا ہے۔ بائبل کے پہلے حصہ میں جسے توریت کہتے ہیں ایسے بزرگوں کا ذکر پایا جاتا ہے جن کی عمریں کم بیش ہزار سال ہوا کرتی تھیں۔

اگر پورانوں کی ورق گردانی کی جائے تو وہاں پر رشیوں منیوں کے علاوہ حکمرانوں اور بڑے بڑے سورماؤں کی عمریں ہزاروں برسوں کی بیان کی گئی ہیں، اس اعتبار سے اسلاف بائبل محض بچے معلوم ہوتے ہیں۔ قدیم زمانوں کے مصریوں، بابلیوں، اشوریوں اور دیگر قوموں کے درمیان بھی آب حیات کا خیال مروج تھا، جیسا کہ خط نقشہ دار اور خط میخی کی تحریروں اور دیگر مذہبی نشانوں سے ثابت ہے، اس اجمالی بحث سے اس قدر عیاں ہوگیا ہے کہ آب حیات کا مفہوم حقیقی قدیم زمانہ سے ہر زمانہ اور ہر متمدن قوم میں رائج چلا آتا ہے،

اگلے وقتوں کے حکما نے دو مسائل حل کرنے کے لئے اپنی دماغی قوتیں وقف کر رکھی تھیں، اور ان کے سائنس کا مقصد اولیٰ بھی انہی مسائل کا حل کرنا تھا۔ اطبا

کے دماغ نے آب حیات کے نسخے وضع کرنے کا اجارہ حاصل کر رکھا تھا۔ اور دیگر حکماء نے کیمیا بنانے کی دھن میں اپنی عقلی مصروفیتیں قربان کر دی تھیں، زمانہ سلف کا کوئی حکیم ایسا نہ تھا جس نے درازیٔ عمر کے ٹوٹکے وضع نہ کئے ہوں، اور کوئی فیلسوف ایسا نہ تھا جو کیمیا کے وسیلے سے تانبہ وغیرہ کو سونے میں تبدیل کرنے کا متمنی اور اس کے لئے کوشاں نہ رہا ہو، یونان۔ روم، ہندوستان، مصر، چین وغیرہ کے اسلاف سے قطع نظر، آزمنہ وسطیٰ کے یورپ اور عرب بھی اس سودے میں مبتلا تھے، انیسوی صدی کے سائنسدان آب حیات کی تلاش کو جہلا کا مشغلہ اور فعل عبث تصور کرنے لگے، اور اسی طرح کیمیا بھی خیال باطل قرار دیا گیا۔
مگر بیسویں صدی کے ممتاز سائنسدان اب ان پرانے تعلیمات کی تجدید کے درپے ہیں بلکہ سائنسی تجربات سے ان کی اہمیت اور امکان کامیابی ظاہر ہو رہا ہے، چند ماہ ہوئے جرمنی سے اس امر کا اعلان ہوا کہ ایک ماہر کیمیات نے پارہ کو عمل کیمیاوی سے سونے میں منتقل کر دیا ہے، گویا اس طرح پر الکیمیا کے خیال دیرینہ سال کو کامیاب کر دیا ہے۔ مگر آب حیات کی تلاش اس سے بھی پرانی ہے۔

فرانس کے لاثانی ماہر کیمیات کے مسائل علمیہ سے بیکٹریالوجی (علم جراثیم) کی بنیاد مستحکم ہوئی تھی۔ موسیو پاسٹر (پاسٹور انسٹی ٹیوٹ کے بانی) کے تجربات اور تحقیقات سے انسٹی ٹیوٹ ہذا نے کوئی ۲۰ سال کی مسلسل تحقیقات کے بعد یہ نظریہ پیش کیا تھا۔ کہ انسان دو ڈھائی سو برس تک بخوبی زندہ رہ سکتا ہے۔ نظریہ تو علمی تحقیقات کے نتائج سے ماخوذ کیا گیا تھا، مگر اس کی تائید و تصدیق زندہ مثالوں سے ہوئی ہے۔ مختلف قوموں کی غذا اور طرز معاشرت کو بعض قوموں کے سو سال سے زیادہ عمر کے آدمیوں کے بڑھے ہوئے اوسط کو ذمہ دار قرار دیا گیا۔ بلغاریہ میں سب ملکوں سے زیادہ دراز عمر کے آدمیوں کی تعداد

پائی گئی ہے۔ اس سے دوسرے درجہ پر تاروسمولیٹن اور تاتار کے آدمی پائے جاتے ہین لیکن کاف نے اس امر پر زور دیا ۔ کہ بلغاریہ کے کسان وہی بہ کثرت کھاتے ہین جس کے اندر ایسے جراثیم پائے جاتے ہین جو انسان کا رشتۂ حیات قطع کرنے کے درپے رہتے ہین ۔ چنانچہ برسون تک یورپ اور امریکہ مین شیر ترش د Buttermilk) کا بہت رواج رہا اب شاید یہ خبط کم ہوگیا ہے ۔

گذشتہ ۳۰ و ۴۰ سال سے ماہران فزیالوجی د علم افعال اعضاء) غددون کی ماہیت اور ان کے افعال طبعی کی تحقیقات مین مصروف ہین ۔ آخر کار انھون نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ انسان کے جسم کے اعضاء اور قوا کی نمو غددون کے افعال فطری کے تابع ہے اگر کسی فطری یا غیر فطری وجہ سے ان کے افعال مین کوئی رخنہ یا سرعت پیدا ہو جائے تو جسم کے نمو کی رفتار سست یا تیز ہو جاتی ہے ۔ اس نظریہ کی رو سے بارہ تیرہ سال یا اس سے کم عمر کی لڑکیون کے اولاد کا امکان اور دس بارہ برس کے لڑکون مین مردانہ صفات اور قوت کا پیدا ہونا ممکنات سے ہے ، جو لڑکے صغر سنی مین تنومند بن جاتے ہین اس کا سبب یہی ہے یعنی ان کے کسی غدود کے طبعی فعل مین تیزی پیدا ہوگئی ہے ۔ غدود پانچ قسم کے ہین کہ جو جسم کی داخل اور خارجی نمو کے محرک ہوتے ہین ، ایک دماغ کے اندر ہوتا ہے جو دماغی قوتون کی ترقی بڑھا دیتا ہے ۔ دوسرا گلے کے نیچے ہوتا ہے جسے تھائی رائڈ کہتے ہین ۔ اس کے فعل کے نقص سے پستہ قد اور بونے پیدا ہوتے ہین ۔ مرض گھینگھا بھی اسی سے پیدا ہوتا ہے باقی کے تین قسم کے غدود گردون اور دیگر حصون مین ہین ۔ بعض ماہرون کا خیال ہے کہ انسان کے جسمانی جذبات اور خواہشات کی تحریک بھی انہی غددون کے فعل سے ہوتی ہے ۔ آسٹریا کے ایک ڈاکٹر نے اس حیرت انگیز تحقیقات سے اثر پذیر ہوکر عمر درازی کی کے تجربات

شروع کردیئے۔ پہلے بندروں۔ بکروں۔ بھیڑوں پر تجربے کئے گئے۔ نوجوان بندر کے غدود بوڑھے بندر کے پیوست کئے گئے تو اس کے اندر جوان بندروں کی سی چستی اور توانائی پیدا ہوگئی۔ اسی طرح اور جانوروں پر جراحی عمل سے تجربات کئے گئے۔ جب نتائج تسلی بخش مُرتب ہوئے تو بندر کے غدود بڈھے آدمیوں کے لگائے گئے۔ اور ان کی جسمانی حالت میں نمایاں تغیر واقع ہوگیا۔ اس سے یہ نظریہ وضع ہوا کہ میعاد مقررہ کے بعد غدود کے لگانے سے میعاد حیات میں مُعتد بہ اضافہ ہوسکتا ہے۔

بہت سی مرکب ادویات بھی ڈاکٹروں کی کوشش سے تیار ہوئی ہیں جن کی بدولت انسان کی عمر میں بہت اضافہ ہوسکتا ہے۔ یہ خاص اصطلاح میں ہرمون (Hormones) یعنی اکسیر حیات کہلاتے ہیں۔ ان کے استعمال سے جسم کے مختلف اعضا کے افعال پر خاص اثر پڑتا ہے۔ اگر زیادہ مقدار میں کھائی جائے تو بیماری کی محرک ہوتی ہے۔ مگر مناسب مقدار کھانے سے غذا تحلیل ہوکر ایسے عروق شکلی پیدا کرنے کی موجب ہوتی ہے جس سے قوار حیاتی استحکام پاتی ہیں۔

ایک جرمن سائنسدان نے تھوڑے دن ہوئے۔ یہ اعلان کیا تھا کہ ماہران سائنس کی مساعی حسنہ سے رفتہ رفتہ وہ اسباب نابود ہوجائیں گے۔ کہ جن سے رشتۂ حیات منقطع ہوجاتا ہے۔ اور اس خیال کو اس امر سے بے نظیر استحکام پہنچتا ہے کہ "ان سولین" (Insulin دیکھاری)، اختراع ہوگئی ہے۔ اس سے ایک ہزار سال تک زندہ رہنا ممکنات سے ہے۔ یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا پانچ سات سو برس تک زندہ رہنا لعنت ہے یا رحمت؟ اس کا جواب مشکل ہے۔ زندگی کا لطف اجتماع ضدین سے ہے۔ اور اس میں میعاد کو بھی تعلق ہے۔ اگر یہ سلسلہ غیر فنا ہی یا طوالت غیر معین ہو تو انسان کی زندگی بےمزہ اور تلخ ہوجائے گی۔

بین الاقوام انجمن عملی سائیکالوجی کے پریسیڈنٹ ڈاکٹر ایس ہول ہین- ان کی عمر اب ساٹھ برس کی ہے مگر ان کے نونو سے ان کی عمر ۳۰ - ۴۲ سال سے زیادہ معلوم نہین ہوتی وہ بیان کرتے ہین کہ انسان دو تین سو برس تک زندہ رہ سکتا ہے- اور خود ڈھائی سو سال تک زندہ رہنے کی متمنی ہین- اب ڈاکٹر یہ کوشش کر رہے ہین کہ جو مادے اور عرق غدودن کے فعل طبعی سے پیدا ہوتے ہین وہ کیمیا خانے مین پیدا کرکے انسان کے جسم مین داخل کئے جائین- کہ جس سے اس کی قوت دماغی اور جسمانی سدا بہار پودے کی طرح اپنے پورے شباب مین قائم رہے-

اس مختصر بحث سے ظاہر ہے کہ آب حیات جو پہلے جہلا کا وہم تھا سائنسدانون کی تحقیقات کا دلفریب موضوع بنا ہوا ہے- فقط

محکومیت نسواں کا سلسلہ

سال رواں میں ختم نہ ہو سکا، یہ معرکۃ الآرا مضمون ۱۹۲۷ء میں بھی جاری رہیگا، آیندہ قسط نہایت لطیف ہے،

مینیجر رسالہ "شمع"

تبصرہ

(از جناب ڈاکٹر عبدالستار صدیقی صاحب، ایم اے، پی، ایچ، ڈی کے قلم سے)

(اصلاح سخن)

(۱)

ایک وہ زمانہ تھا کہ ہندوستان مین فارسی کا دور دورہ تھا، اور کچھ شہرون ہی مین نہین چھوٹے چھوٹے قصبون تک مین نظم ونثر کے اساتذہ کثرت سے موجود تھے، اور ہر اُستاد کے شاگردون کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ اُس زمانے کے نوجوان اپنی عمر کے عزیز ترین وقت کو مشق سخن مین صرف کرتے اور نظم اور نثر کے ایک ایک نکتے کو اُستاد سے حل کرتے۔ جب اُردو شاعری کو عروج ہوا تو ادھر بھی تھوڑے ہی دنون مین اساتذۂ فن کا ایک بڑا گروہ پیدا ہوگیا) بلکہ فارسی شعر شاعری سے بڑھ کر اُردو کا چرچا ہونے لگا مگر اُردو نثر کی طرف کسی نے رُخ نہ کیا۔ جو لوگ اُردو ہی مین شعر کہتے وہ بھی جب کبھی نثر لکھتے تو فارسی ہی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مشق و اصلاح کے دائرے سے نثر مطلقاً خارج رہی مگر اُردو شعر پر اصلاح لینے والون اور اصلاح دینے والون کا ایک ممتاز گروہ پیدا ہوگیا اور خوشی اور شکر کا مقام ہے کہ اس انحطاط کے زمانے مین بھی یہ مبارک سلسلہ جاری ہے:

کچھ اوپر سو برس ہوئے کہ اُردو نثر کی طرف بھی توجہ ہوئی۔ پہلے مقفیٰ اور مسجع عبارت بالکل فارسی کے قدم بقدم لکھی گئی اور ایک مدت تک یہ رنگ جما رہا، غالب نے جہان اُردو شعر مین فارسیت کا گہرا اور شوخ رنگ، دے کے اُردو شاعری کو ایک شان دیدی، وہان سیدھی

سادہی اردو لکھ کے اردو نثر کی بنیاد ڈالی۔ افسوس یہ ہی کہ سادہ اردو نثر کو عام طور پر لوگون نے اس قابل نہ سمجھا کہ اُس کی طرف پوری توجہ اور اُس کی اصلاح مین جتنی چاہئے تھی کوشش کرتے۔ اسی کا خمیازہ ہی کہ آج نثر کی جو کتاب اُٹھا کے دیکھیے خرابیون اور غلطیون سے لبریز ہی نثر کی یہ ناگفتہ بہ حالت دیکھ کے بہت ہی غنیمت معلوم ہوتا ہی کہ نظم کے سنوارنے والے خدا کے فضل سے اب بھی موجود ہین۔ افسوس اسیقدر ہی کہ سیکڑون اساتذۂ فن کی مفید اصلاحین شاگردون کے ایک چھوٹے سے دائرے تک محدود رہین یا اُن کے شایع کرنے کا بہت کم کسی کو خیال ہوا۔ ابھی تھوڑے ہی دن ہوئے مقتدر مرزا پوری نے بہت تلاش اور کوشش سے کچھ اصلاحین جمع کین اور اُن کو "مشاطۂ سخن" کے نام سے کتاب کی شکل مین شایع کر کے اردو پر بڑا احسان کیا۔ اور اب شوق سندیلوی کی اعجوبہ کتاب "اصلاح سخن" چھپ کر نکلنے کو ہی "اعجوبہ" اس لئے کہتا ہون کہ اس کتاب مین ایک ایک شعر پر کئی کئی اُستادون کی اصلاحین درج ہین اور یہ بلاشبہ ایک بدعت ہی جسے عموماً لوگ شاید "بدعت سیئہ" کہیں گے اور حضرات اساتذہ کی شان مین گُستاخی قرار دین گے لیکن اگر انصاف کی آنکھ سے دیکھئے تو شوق صاحب کی یہ جدّت نہ تو بدعتِ سیئہ ہی نہ اُستادون کی شان مین گُستاخی۔ یہ تو ایک ایسی بدعتِ حسنہ ہی جس کا شکر گزار اردو کے ہر قدرشناس پر واجب ہی۔ مؤلف کی سعی بلیغ کی داد دینا چاہئے کہ انھون نے ایک دو نہین پچیس تیس نامور اُستادون کی طبع آزمائیون کو یکجا کر کے ایک عجیب مجموعہ پیش کیا ہی جس سے اپنی قابلیت کے مطابق ہر مبتدی و منتہی مستفید و محظوظ ہو سکتا ہی مختلف اصلاحون پر ذرا سا غور کرنے سے شعر کے سارے حُسن و قبح واضح ہو جاتے ہین اور اصلاح کے اصول نظر کے سامنے آجاتے ہین۔

اکثر اُستادون کے اصلاح دینے کا ڈھنگ یہ ہے کہ کوئی سقم دکھائی دیا تو لفظون کو ہیر پھیر کے ٹھیک کر دیا اس سے کام نہ چلا تو پورے شعر کو کاٹ کر اپنی طرف سے شاگرد کو ایک تازہ شعر عطا فرما دیا چلیے غزل بن گئی اور مشاعرے کی محفل گرم ہوگئی، مگر سچ پوچھیے تو شاگرد کو نفع واجبی ہی واجبی ہوا۔ بخلاف اس کے دوسرے حضرات کا طرز یہ ہے کہ غلطیون اور عیبون سے شاگرد کو متنبہ کر دیا اور شاگرد ہی سے غزل کو ٹھیک کروا دیا۔ یہ دوسرا طریقہ یقیناً زیادہ بہتر ہے لیکن زیادہ وقت اور اطمینان چاہتا ہے۔ اس بات کو کبھی نہ بھولنا چاہیے کہ اُستادون کی طبیعتون اور رایون مین بھی فرق ہونا ضروری ہے۔ ایک کے نزدیک اسی قدر اصلاح کافی ہے کہ نحوی اور عروضی غلطیان دُور ہو جائین، دوسرا اس پر بس نہین کرتا۔ بلکہ چاہتا ہے کہ اس کا ہر شاگرد میر و میرزا سے ٹکر لے۔ یہ "اصلاحِ سخن" میں یہ سب رنگ دکھائی دیتے ہین بعض حضرات جیسے جلیل، ریاض، شاد عظیم آبادی، ثاقب وغیرہ شاگرد کے شعر مین کم سے کم تصرف کرتے ہین، مگر جہان قلم لگا دیتے ہین ادنیٰ تغیر سے شعر کو کہیں سے کہیں پہنچا دیتے ہین، وجوہ اصلاح کے بیان کرنے کو بے ضرورت جانتے ہین اس لئے کہ سمجھنے والا یون بھی سمجھ لیگا اور نہ سمجھنے والا شاگردی کے قابل نہین۔ دوسرے حضرات جہان کہین ضرورت دیکھتے ہین دلائل بھی لکھ دیتے ہین اس خصوص مین آرزو، باقی، بیخود، موہانی، شوق قدوائی، نیاز، وحشت اور دیگر حضرات کی تشریح و تنبیہ خاص توجہ کے قابل ہوتی ہے۔ ان تشریحون کے ساتھ ساتھ اصلاحون کو دیکھیے تو اصلاحون کی قدر و قیمت یقیناً دوبالا ہو جاتی ہے مثلاً اس شعر پر:-

آج پورا ہوا مقدر کا لکھا ہو جانا ۔۔۔ یون ترے عشق میں انگشت نما ہو جانا (وحشت)

پہلے وحشت کی تشریح ملاحظہ کیجیے اور پھر آرزو کی اصلاح کا لطف اٹھائیے۔ کیا خوب گرہ لگائی ہے:

آرزو [میری تقدیر کو چمکا کے بنا دے گا ہلال] ۔۔۔ یون ترے عشق مین انگشت نما ہو جانا

اسی سلسلہ میں چند اور گرہیں بھی ملاحظہ ہوں :-

جلیل [کیا بگڑنے کی ادا تھی کہ قضا بن کے رہی] روٹھنا اُن کا، اِدھر دم کا خفا ہو جانا ہے"
ریاض [کیا برابر کا دیا ہے دمِ آخر نے جواب] روٹھنا اُن کا، اِدھر دم کا خفا ہو جانا رہے"
آرزو [پھر قیمت کا ہی اُس لفٹ کی الفت، اے شوق!] نہ خدا کے لئے مخصور بلا ہو جانا (ص)"
نوح [اُن کی کاکل کو کہیں چھیڑ کے اے حضرتِ شوق!] نہ خدا کے لئے محصورِ بلا ہو جانا (ص۳)"
آرزو [قبر سے اٹھا بگولا بن کے یوں وحشی ترا] گرد جس کے سامنے آشوبِ محشر ہو گیا (ص۳)"

اب کچھ اور اصلاحیں بھی ملاحظہ ہوں :-
شاگرد کا شعر تھا

بوئے خونِ دلِ عاشق تو نہیں چھپ سکتی گو بہت سہل ہے ہم رنگِ حنا ہو جانا (ص۴)

اس پر خوب خوب اصلاحیں ہوئی ہیں لیکن شعر میں جو سب سے بڑی خرابی تھی اس کی طرف کم توجہ ہوئی وہ یہ کہ پہلے مصرعے میں ایک فارسی اضافت نے مضمون کو سست اور شعر کو نکما کر رکھا تھا، اس لئے کہ "بو" کے "ہم رنگِ حنا ہو جانے" کا دھوکا ہوتا تھا اور یہ خود شاعر کے بھی پیش نظر نہ تھا۔ اس خرابی کو چند اصلاحوں نے یوں دور کر دیا ہے :-

مضطر [خونِ عاشق سے وہ کہتے ہیں کہ تو حشر کے دن
دو گھڑی کے لئے] ہم رنگِ حنا ہو جانا (ص۴)

حضرت مضطر نے اس شعر کو بالکل اپنے رنگ میں رنگ دیا۔
حضرت مومن نے "بو" کے مقابلے میں "رنگ" کا لفظ دوسرے مصرعے میں داخل کر کے شعر کو بنایا ہے :-

مومن ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ دا [سہل ہی رنگ کا ہم رنگِ حنا ہو جانا (ص۵)

مومن .... (۲) [یہ بھی کیا رنگ کا ہی رنگ] حنا ہو جانا (ص ۵)

حضرت نیاز نے پہلے مصرعے کو بدل کے شعر کو شعر بنا دیا :-

نیاز : بوے خوں [اے دلِ پامال ! کہاں جائے گی ؟

تجھ کو تو] سہل ہی ہم رنگِ حنا ہو جانا (ص ۵)

ماشاء اللہ

(۲) دیکھ ظالم ، تیرے فریادی نے وقتِ بازپرس

وہ ہوا باندھی کہ سم سے میدانِ محشر ہو گیا (ص ۳)

اس شعر میں سم کے لفظ کو سوا پانچ صاحبوں (آرزو، بیخود موہانی، شاد، صفی، عزیز) کے سب ہی نے غلط تصور کیا۔ بعض اصلاحوں میں "صُم" بنایا گیا اور بعض میں "سن" اور بعضوں نے "سم" (زہر کے معنوں میں) جان کر یہ فرمایا کہ "میدان محشر سم نہیں ہو سکتا ہی"۔ ان مشوروں کے سمجھنے سے میں قاصر ہوں۔ "صُم" اردو میں بولا ہی کہاں جاتا ہی سوا "گم صُم" یا "صُمٌ بُکمٌ" کے اور "میدان" کو "صُم" کہنا بھی محاورے سے بعید ہی۔ اور "میدان" کا "مسموم" ہونا تو کوئی معنی ہی نہیں رکھتا۔ "سن" بھی میدان کے لئے نہیں بولتے ، ہاتھ ، پانو کا "سُن" ہو جانا البتہ سنا ہی اور میدان کا "سُن سان" ہونا۔

میں نے جہاں تک غور اور تحقیق کی شاعر کا مقصود ہی موسیقی کا "موسم" اور اس لحاظ سے مصرعہ نہایت خوب ہی۔

(۳) آہ ظالم ہو چکی اِک منتظر کی آنکھ بند اب ترا آنا نہ آنا سب برابر ہو گیا (ص ۳۲)

سبحان اللہ۔ دوسرے مصرعے میں کسی قسم کا تصرف کرنا سخت ظلم ہی۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ حضرت عاشق کے اعتراض کو کیا کہوں۔

(۴) "زاہد بدیں" والے شعر پر حضرت ریاض کی اصلاح کا کیا کہنا، فرماتے ہیں:-

پڑ گئی زاہد کی شاید آنکھ للچائی ہوئی — ٹکڑے ٹکڑے ہاتھ میں ساقی کے ساغر ہو گیا (ص ۳۱)

اور حضرات نے بھی خوب خوب اصلاحیں دی ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ بگڑے ہوئے شعر کو کن کن تدبیروں سے سنبھالتے ہیں۔

(۵) اب کہاں ہے وہ جوانی کا طلسم دل فریب — اک تماشا تھا کہ جو اے شوق شب بھر ہو گیا (ص ۳۰)

شعر خوب تھا مگر "کہ جو" نے سارا مزا کرکرا کر دیا۔ آرزو، اطہر، سائل، شاد اور فانی کی اصلاحوں نے مختلف پہلوؤں سے شعر کی کمزوریوں کو دور کیا ہے۔ بعض صاحبوں کو "شب بھر" پر اعتراض ہے، چنانچہ حضرت احسن فرماتے ہیں: "شب بھر کا التباس ہوتا" ہے۔ اس قسم کے وہمی التباسوں پر اگر لحاظ کیجئے تو اس کثرت سے لفظوں اور ترکیبوں کو ترک کرنا پڑے گا کہ اردو بیچاری آدھی بھی نہ رہے گی۔ احسن صاحب نے دوسرے مصرعے کو یوں بنایا ہے "اک تماشا تھا جو حسب شوق دن بھر ہو گیا" اس میں (گستاخی معاف) ایک تو "دن" کا لفظ کچھ زیادہ برمحل نہیں، دوسرے "حسب شوق" کچھ برائے بیت سا معلوم ہوتا ہے اور حضرت احسن کو تو اور بھی اس ترکیب سے پرہیز لازم تھا اس لئے کہ صاحب شعر کا تخلص بھی تو شوق ہی ہے پس "حسب شوق" سے "ہنس بے شوق" کا پہلو نکلتا ہے اور وہی "لت بر سرت" والا مضمون ہوا جاتا ہے۔

(۶) یہی دو حرف آہ سرد کے شرح غم دل ہیں — طویل اک داستاں ہے جس کو تم نے مختصر جانا (ص ۲۴)

حضرت شفق کا اعتراض کہ "سرد کی قید لگانے سے دو حرف نہیں باقی رہتے" کچھ زیادہ حق بجانب نہیں معلوم ہوتا۔ ظاہر ہے کہ اس شعر میں "حرف" نحو کی اصطلاح کے طور پر استعمال نہیں ہوا ہے۔ عربی، فارسی، اردو تینوں زبانوں میں "حرف" "لفظ" اور "بات" وغیرہ کے معنوں میں مستعمل ہے۔ خواجہ حافظ کا شعر تو بہت ہی مشہور ہے:-

آسائشِ دو گیتی تفسیر این دو حرف است | با دوستان تلطف، با دشمنان مدارا

(۷) خندہ زن مجھ پہ مری خوبیِ تقدیر۔ الخ۔ (ص ۶۵) نہایت خوب۔

ذرا سے تغیر سے حضرت ریاض نے شعر کو کتنا بلند کر دیا ہے:۔

منتشر پھر کہیں شیرازۂ تدبیر نہ ہو | خندہ زن اور بھی مجھ پر مری تقدیر نہ ہو

(۸) کیوں اُلجھتے ہو...... الخ۔ (ص ۶۵) اچھا شعر ہے۔

حضرات اساتذہ نے اسے خوب خوب سنوارا ہے، (احسن، جلیل، شاد) وحشت نے کیا خوب مصرع لگایا ہے:۔

وحشت [ہر شکن در شکن آج آپ کی زلفِ برہم] | کہیں تو بھی مری بگڑی ہوئی تقدیر نہ ہو۔ (ص ۶۶)

(۹) اس شعر میں :۔

یہ دل کے بہلنے کی تدبیر نظر آئی | بند آنکھ جو کی، تیری تصویر نظر آئی (ص ۹۰)

حضرت ریاض اور حضرت نیاز نے "یہ" کی جگہ "کیا" بنا دیا ہے۔ بس اتنی ہی گنجائش اصلاح کی تھی۔

(۱۰) ہنس کر منہ چھپا لینے نے تیرے ذبح کر ڈالا | ارے میٹھی چھری ظالم ادائے شرمگیں نکلی (ص ۹۹)

اس شعر پر تقریباً سب اصلاحیں ایسی ہیں کہ دو ایک لفظ بدل دیے گئے ہیں سوا حضرت ریاض کے شعر کے جسے گویا "عطیہ" سمجھنا چاہیے:۔

بھری محفل میں تیری آنکھ کیا تھی ؟ کیا ہے خلوت میں ؟

جسے ہم شوخ سمجھے تھے، بہت ہی شرمگیں نکلی۔

اس لاجواب شعر کی تعریف کیوں کر ہو ؟

(۱۱) مقام افسوس کا ہے تجھ پہ دیدی جس نے جاں آخر | نہ اس کے واسطے دل سے ترے دو گز زمیں نکلی (ص ۹۹)

شاعر کا معشوق، قبرستان کا مجاور ہوگا۔

"کوچہ" یا "گلی" کا لفظ لا کر بعض حضرات نے شعر کے عیب کو رفع کر دیا ہے۔

(۱۶) نگاہِ شوق کی گرمی سے اڑ جاتا ہے رنگ اس کا

تری تصویر تجھ سے بھی زیادہ نازنیں نکلی (ص ۱۰۲)

کیا اچھا شعر ہے۔

یہ چند مثالیں مشت نمونہ ہیں "اصلاحِ سخن" اسی قسم کی سیکڑوں خوبیوں سے پُر ہے مگر پھر بھی یہ ضرور کہونگا کہ بعض اصلاحوں اور شعروں میں تامل کی گنجایش ہے:۔

(۱) صفحہ ۶، سطر ۱۹: کس کو "ہدفِ تیرِ قضا ہو جانا" مقصود ہے؟ میرا یا تمھارا؟ اس موقع پر متکلم کی ضمیر کا اظہار کرنا ضروری تھا۔

(۲) ص ۲۷، س ۱۹: "کہ جو" میں سے ایک لفظ کافی تھا۔

(۳) ص ۳۲، س ۶: "ایک ہی آنکھ...... الخ" یہ اعتراض اعتنا کے قابل نہیں۔

(۴) ص ۳۶، اخیر سطر: "یہ" کا تو شاید محل نہیں یہی حال ہے ص ۱۴۱، س ۱۲ کے پہلی "یہ" کا۔

(۵) ص ۵۲، " " : "رنگ" اور "روپ" کے درمیان میں فارسی عطف کی گنجائش کہاں۔ کیا عجب کہ یہ حضرت کاتب کی اصلاح ہو۔ "رنگ روپ" میں تو کسی عطفِ لفظی کا داخل کرنا جائز نہیں۔ اسی طرح اُدھیڑ بُن، کھیل کود، رنگ ڈھنگ، ہاتھ پاؤں، ڈیل ڈول، دیکھ بھال، جانچ پڑتال وغیرہ۔ اور "رنگ روپ" میں تو یوں بھی فارسی عطف نہیں آسکتا کہ پہلا لفظ فارسی مگر دوسرا ہندی ہے۔

(۶) ص ۹۰، س ۱۱: "تعجیل کی جانے میں" اس جملے میں "کی" فعل ہے، اس کی "ی" کو پوری آواز کے ساتھ ظاہر ہونا چاہیے۔

(۷) ص ۹۸، س ۶: تنافر کا عیب تھا کہاں؟

(۸) ص ۹۸، س ۲۰: "مگر" حرفِ شرط نہیں، حرفِ تردید ہے۔

(۹) ص ۱۱۶، س ۱۱: "اگر ہستی کی یائے تحتانی کو ذرا زور دے کر پڑھیے"۔ یہ تو درست نہیں اس عبارت کو یوں ہونا چاہیے تھا "اگر تا کے الف کو پورا کھینچ کر پڑھیے"۔

(۱۰) ص ۱۳۳، س ۲: طبیب تو دل پر ہاتھ رکھتے ہیں، اناڑی نہ رکھے تو نہ رکھے۔

(۱۱) ص ۱۳۴، س ۱۳: "یہ گلا" سے کون سا گلہ مقصود ہے؟ اس سے تو شاگرد ہی بیچارے کا شعر زیادہ صاف تھا۔

(۱۲) ص ۱۳۰، س ۲: "وابستۂ حق سوا خدا کے   دلدادۂ ماسوا نہیں ہے"

اس شعر کو بار بار پڑھا مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ معما ہے یا پہیلیاں یا کوئی منطقی مغالطہ۔ توبہ، توبہ، خدا کو ماسوا میں شمار کیجیے یا خدا کو، نعوذ باللہ، وابستۂ حق سمجھ کر جملے کی ترکیب لفظی ہو سکے مگر پھر آخر مطلب کہاں سے لائیے اور معنی کیونکر پیدا کیجیے؟

(۱۳) ص ۱۳۹، س ۱۵: اردو میں "خوشخبری" ہی بولتے ہیں۔

(۱۴) ص ۱۴۱، س ۱۰: (نیز ص ۱۸، آخیر سطر): اس قسم کی رائیں ہرگز اعتنا کے قابل نہیں۔

یہ جو چودہ، پندرہ چیزیں بیان ہوئیں ان کو "صلاحِ سخن" کے عیب نہ سمجھنا چاہیے۔ یہ تو اس کے رُخِ زیبا کے خال ہیں اور جو کہیں کوئی خال بڑھ کے مسا ہو گیا تو اُسے اَلنَّادِرُ کَالْمَعْدُوْم تصور کرنا چاہیے۔

حضرتِ شوق کو اس نامۂ شگرف کی اشاعت مبارک ہو اور خدا کرے وہ ایسی بہت سی تالیفیں شایع کر کے اردو کے شیدائیوں کو زیرِ بارِ احسان کریں۔

حجم ۲۶۰ صفحے قیمت ۳ ۔ ملنے کا پتہ۔ حکیم بہاء الدین صدیقی۔ وانسٹ گنج، ہردوئی

دکن میں اردو

یعنی

جنوبی ہند میں اردو کی ابتدا اور اُس کی ترقی

مصنفہ

(جناب نصیرالدین ہاشمی صاحب منشی فاضل)

ابتک تو یہی ایک جھگڑا تھا کہ اردو نے آگرہ مین جنم لیا یا دلی مین، مگر اب ایک نیا اسکول وجود میں آیا ہے، جو دکن کو اردو کی ماں ہونے سے متصف کرتا ہے اور اپنی تائید میں بیشمار تاریخی اور تحریری ثبوت پیش کرتا ہے۔ آخری قسم کے مدعی ہاشمی صاحب ہین جنھوں نے دو برس کی محنت کے بعد ایک مستقل کتاب لکھ کر آگرہ اور دلی کے طرفدارون کی زبان بند کرنیکا مصمم تہیہ کرلیا ہے۔ دلی والے تو آگرہ کے حق مین دست بردار ہوچکے تھے مگر خدا بھلا کرے مولوی عبد الحق صاحب دہلوی کا کہ جو شمس العلماء آزاد مرحوم کے عطیہ کو کہ اردو دہلی مین پیدا ہوئی ہے، دہلی کے ہاتھوں سے نکلتے دیکھکر آگرہ کی کامیابی کو نہ دیکھ سکے اور بالآخر دکن مین بیٹھکر برسون کی بنی ہوئی بات بگاڑ دی اور اپنی تلاش اور جستجو سے (جس کے علمی حیثیت سے دایم المرض ہین) بھانڈا پھوڑ ڈالا نتیجہ یہ ہوا کہ اردو نہ تو دلی کی میراث رہی اور نہ آگرہ کی۔ بلکہ دکھنیون کا ترکہ قرار پائی۔

لائق مصنف نے کافی ریاض کیا ہے۔ اور اپنے ثبوت کو پبلک کے سامنے سلیقہ کے ساتھ پیش کیا ہے، کتاب کی مقبولیت کا ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ ایک سال کے اندر ہی اندر دوسرے اڈیشن کی نوبت

آگئی، یہ کامیابی اُردو مین ایک صاحب تصنیف کے لئے نیک فال ہے۔

لائق مصنف نے عہد قدیم سے ابتک اُردو نے جونشو ونما سرزمین دکن مین پائی ہے اُسکو دکھانیکی کوشش کی ہے، اور وہان کے قدیم ترین شعرا وجدی۔ وسعدی وغیرہ کا کلام پیش کیا ہے اور پھر عہد بہ عہد کی ترقی کا ذکر کیا ہے۔ وجدی کا تحفۂ عاشقان ۵۰۰ھ مین تصنیف ہوا ہے اور کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے:-

الٰہی بحق محمد رسول مری رنج ومحنت کون کرتون قبول

زبان کی صفائی کو دیکھتے ہوئے ہم کو تامل ہے کہ وجدی اُردو کا پہلا شاعر ہے۔ لیکن بقول مصنف چونکہ اس سے پہلے کا کلام دستیاب نہ ہوسکا اس لئے اس کو پہلا اُردو شاعر ماننا پڑیگا، چونکہ دکن مین تحقیقات جاری ہے اور ابھی یورپ کے کتب خانے ہمارے نقادوں سے "محفوظ" ہین اس لئے جبتک کہ وجدی سے پہلے کا کلام سامنے نہ لایا جائے اُس وقت تک کے لئے ہم کو اس مسئلہ پر خاموش رہنا پڑے گا۔

ہماری رائے مین اس امر کا فیصلہ کہ اُردو کہان پیدا ہوئی ہے بہت دشوار ہے۔ اور جہان اُردو دان اپنی تحقیقات کو ختم کردیتے ہین وہان اُن کو ہندی کی طرف رجوع ہونا چاہیے اور ہندی کے قلمی نسخون سے پتہ لگانا چاہئے ممکن ہے کہ مرہٹی اور تلنگی زبانین بھی اس تحقیقات مین معاونت کریں۔

غرض اس تحریر سے یہ ہے کہ اُردو زبان کی "پیدائش کا مقام" اور "زمانہ" کے متعلق کتاب مین کوئی بات ایسی نہیں ہے جو تاریخی حیثیت سے قابل قبول ہو، اور مٹیریل کے دستیاب نہ ہونے کے باعث لائق مصنف نے بھی اپنی دماغ کو قیاسات کے چکرون مین نہین ڈالا ہے۔ بلکہ اس موضوع کو تقریباً کورا چھوڑدیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس موضوع پر کوئی تحقیقات نہین

ہوئی ہی اور تحقیق کا میدان بالکل خالی ہی!

شمس العلما آزاد نے نظم و نثر کی ابتدا کے متعلق جو تحقیقات کی تھی وہ عرصہ ہوا کہ غلط ثابت ہو چکی ہی۔ اور اُن کی بتائی ہوئی تصانیف سے پہر کی تصانیف نکل آئی ہین، چنانچہ محمد شاہ کے عہد ۱۱۴۵ھ مین فضلی کی وہ مجلس سے قبل یعنی ۱۰۳۲ھ کی تصنیف موجود ہی جسکی عبارت کا نمونہ یہ ہی۔

"اول کلمہ طیب۔ پہلا کلمہ بولتا ہوں میں پاکی کا۔ پاکی کائیکی؟ پاکی ایمان کی!"

نثر کی صفائی دیکھتے ہوے قایل ہونا پڑتا ہی کہ یہ بھی عرصہ کی منجھی منجھائی زبان ہی!

غرضکہ ۱۵۰۰ء کی نظم، اور ۱۰۳۲ھ کی نثر کا قلمی ثبوت دیکھنے کے بعد بھی ہم کو تحقیق اور تفتیش کی ضرورت باقی رہتی ہی۔ اگرچہ ہم تسلیم کرتے ہین کہ ۸۰۰ھ مین دکن مین اردو رائج تھی، لایق مصنف نے جو کچھ گیارہوین صدی اور اُس کے بعد کے زمانہ کے متعلق لکھا ہی وہی قابل وثوق ہی اور اس سے قبل کی بابت محض رائے زنی ہی جو تاریخی دنیا مین کچھ زیادہ وقعت نہین رکھتی ہی۔ پھر بھی مصنف نے اردو پر یہ احسان کیا ہی کہ گیارہوین صدی سے لیکر ابتک کی تدریجی ترقی کو ایک جگہ دکھا دیا ہی۔ یہ کام بھی معمولی نہ تھا، اور نوعیت کے لحاظ سے اردو مین ایک ہی کام ہوا ہی۔

دکن میں اردو، ایک ایسا دلچسپ موضوع ہی جسپر عرصہ تک تحقیقات جاری رہیگی اور ابھی بہت سی باتیں ایسی نکلیں گی جو لایق مصنف کو اپنی تصنیف مین اضافہ کرنی پڑین گی، اور اکثر مواقع پر اپنے خیالات کو بھی تبدیل کرنا پڑے گا، مگر آیندہ کی تحقیقات کا خوف ہم کو موجودہ تصانیف سے بے نیاز نہیں کرسکتا ہی۔

کتاب کی بڑی خوبی یہ ہی کہ مصنف نے دکن مین اردو نظم و نثر کی آجتک کی عہد بہ عہد ترقی

کی مسلسل تاریخ لکھی ہی۔ اور ایسا ذخیرہ فراہم کردیا ہی جس سے محققین کو کافی مدد ملے گی۔ ہر عہد کی نظم ونثر کے نمونے داخل کرنے سے کتاب کی وقعت بڑھ گئی ہی اور ذرا سی توجہ سے دکن مین اردو کی نشو ونما کا نقشہ آنکھون کے سامنے آجاتا ہی۔ مولوی مسیح اللہ بیگ صاحب نے بالکل صحیح فرمایا ہی کہ " اس (کتاب کی ترتیب مضامین) سے دکن میں اردو زبان کا بچپن وشباب علیحدہ علیحدہ نظر آرہا ہی۔ بولنے والی زبان کی ترقی مین جسمانی زبان کو بہت کچھ دخل ہوا کرتا ہی جسمانی زبان ہر اس حرف کو حذف کرنا چاہتی ہی جس کے نکالنے سے اس کو زحمت ہو مثلاً "نا ؤن" کی بجائے " نام " کہنا..... جسمانی زبان کو اچھا معلوم ہوتا ہی۔ اس مین جسمانی زبان کو غیر ضروری مڑ وڑ اور حرکت کم دینا پڑ لی ہی "

مصنف نے داغ کے ساتھ امیر کو بھی شعرا دکن مین شامل کیا ہی، حالانکہ امیر کو دکن مین بہت ہی کم قیام کا موقع ملا۔ اس اصول پر محسن الملک مرحوم، شرر، سرشار، نذیر احمد، اور شبلی کی تحریر کے نمونے بھی کتاب میں داخل ہوتے تو اس کی جامعیت بڑھ جاتی۔

اخیر میں اخبارات اور رسائل کی فہرست ہی جو حیدر آباد سے جاری ہوئے تھے، اور سب سے اخیر مین جامعہ عثمانیہ کی تحریک اور اس کے قیام کی سرگذشت ہی اور اسی کے ساتھ ساتھ موجودہ رسایل اور اخبارات کی فہرست ہی جو حیدر آباد میں جاری ہیں۔

غرض کہ لایق مصنف نے کتاب کو دلچسپ اور مفید بنانے میں کوتاہی نہین کی ہی، اور فی الحقیقت ادب اردو مین ایک مفید اضافہ کیا ہی جس کے لئے مصنف ہمارے شکریہ کے مستحق ہین، کتاب چھوٹی تقطیع کے ۲۲۴ صفحات پر ختم ہوئی ہی، لکھائی چھپائی صاف اور روشن ہی، قیمت ۲ روپے، "ملنے کا پتہ" نصیر الدین ہاشمی صاحب۔ ترپ بازار حیدر آباد، دکن ہی۔

" ح "

آپ بیتی

اختتام سال وہ منزل ہے جہاں دنیا کا مسافر دم لینے کے لئے ٹھہرتا ہے، طے کئے ہوئے سفر کے تجربات اس کی نیرنگیوں اور دلچسپیوں پر نظر ڈالتا ہے۔ اور آئندہ سفر کے لئے تازہ دم ہوکر کمر بستہ ہوتا ہے،

شمع چوتھی منزل طے کر کے پانچویں منزل میں قدم رکھتا ہے۔ ا ور یہی موقع پورے ایک سال کی جانچ پڑتال کا ہے۔ کیونکہ اسی ایک سال کے تجربات کی بنا پر اس کو آگے بڑھنا ہے،

افسوس ہے کہ سال رواں، مصائب آسمانی کے باعث، شمع کے لئے بدنصیب ثابت ہوا، اوّل سال تو پلیگ کی زیادتی کے سبب عرصہ تک آگرہ کے کاروبار درہم و برہم رہے چنانچہ شمع بھی جو آگرہ سے شایع ہوتا ہے، ان اثرات سے محفوظ نہ رہ سکا جو آگرہ کے ہر کاروبار کو مجبوراً برداشت کرنا پڑے۔

پلیگ کے نقصانات سے، ابھی دم لینے کی مہلت نہ ملی تھی کہ مسٹر حسن عابد جعفری بیرسٹر ویٹ لار۔ اڈیٹر شمع ماہ مئی میں یکایک سخت علیل ہوگئے۔ تقریباً بہ یک وقت جناب پروفیسر محمد حبیب صاحب بیرسٹرایٹ لار اڈیٹر شمع بھی عارضۂ چشم میں مبتلا ہوگئے اور عرصہ تک صحت یاب نہ ہوسکے، اور پھر فوراً ہی اس صوبہ میں کونسلوں کے انتخاب کی سرگرمیاں شروع ہوگئیں، اور جناب ممدوح کو سابقہ وعدے کی تائید میں مجبوراً اپنے الیکشن کی طرف متوجہ ہونا، اور باوجود صحت کی خرابی کے، زیادہ تر باہر رہنا پڑا۔ مگر شکر ہے کہ وہ کونسل میں منتخب ہوگئے۔

مسٹر جعفری کی علالت نے غیر معمولی طول کھینچ لیا۔ اور صوبہ کے مشہور ڈاکٹروں کی رایوں

مین سخت اختلاف پیدا ہو جانے کے باعث تشخیص مرض مین دشواریان پیدا ہو گئین، مرض نے
زور پکڑ لیا اور کئی ہفتہ تک انکی حالت نہایت مخدوش رہی اور جانبری کی امیدین منقطع ہو گئین،
ذرا طبیعت سنبھلی تھی کہ ڈاکٹرون نے اُن کو پہاڑ پر بھیجدیا، اور منیجر کو تیمار داری کے سلسلہ مین عرصہ
تک انکی خدمت مین حاضر رہنا پڑا۔ یہ زمانہ انتہائی تشویش اور پریشانی کے عالم مین گذرا۔ خدا کا
شکر ہی اور احسان ہی کہ رفتہ رفتہ ہماری مصیبتین تو دُور ہو گئین لیکن افسوس اس امر کا ہی کہ شمع کو پابندی
اوقات کے ساتھ شائع کرنے کے جو انتظامات ہم نے کئے تھے وہ چشم زدن مین درہم برہم ہو گئے۔

اگر ایسے تاریک بادلون کا رُوپہلی استر نہ ہوتا۔ تو ممکن تھا کہ ہماری ہمتین شکست ہو جاتین
لیکن شکر ہے کہ اس زمانہ مین جبکہ ہم کو دنیا و مافیہا کی مطلق خبر نہ تھی، شمع کے قدردان حضرات نے
ہماری ہمتین قائم رکھین۔ بلا کسی تحریک کے رسالہ کی اشاعت مین ترقی ہوتی رہی، اور ہندوستان کے
ہر گوشہ سے ہر قسم کے مضامین آتے رہے۔ انتہا درجہ کی ناشکری ہوگی اگر ان حضرات کی مہربانیون
کا اعتراف نہ کیا جائے جنکی اعانت اور سچی ہمدردی ہماری رفیق حال رہی، اور وہ بزرگ بھی ہمارے
دلی شکریہ کے مستحق ہین جنھون نے امسال اپنا ہاتھ بڑھا کر رسالہ کی خریداری سے اعانت فرمائی۔
یہ شمع کے ہمدرد بزرگون کے خلوص کا نتیجہ ہی کہ اگرچہ رسالہ تاخیر کے ساتھ شائع ہوا۔ مگر اُس کے
معیار مین کمی نہ آنے پائی۔ اور اگرچہ ہم نے ہر ماہ تصاویر دینے کا وعدہ نہ کیا تھا لیکن ہر ماہ تصاویر
شائع ہوتی رہین۔ اور ایک مہینہ مین تو ان کی تعداد چھ تک پہنچ گئی۔ بہتر سے بہتر مضامین نکلتے رہے
اور نظم کا حصہ سابق کی بنسبت زیادہ شاندار ہو گیا۔ چنانچہ سرسری نظر ڈالنے سے معلوم ہو جائیگا
کہ سال رواں مین شمع نے علم اور ادب کی کیا خدمت کی ہے:-

تاریخی مضامین ۲۵

سیاسی مضامین	۶
ادبی مضامین	۸
ڈراما اور افسانے	۱۱
مذہبی اور تمدنی مضامین	۵
سائنس، فلسفہ اور تعلیم پر مضامین	۱۱
فارسی	۳
غزلیں	۲۶
نظمیں	۲۰

یہ موٹی موٹی سرخیاں ہیں جن کے تحت میں شاندار مضامین کی اشاعت ہوتی رہی۔ مستقل مضامین سے قطع نظر، رسالہ میں "معلومات" اور "شذرات" کے صفحات کی تعداد بھی زیادہ رہی، اور کم و بیش بیس بائیس کتابوں پر مفصل ریویو لکھے گئے۔ اور یہ حصہ بھی نہایت دلچسپ رہا۔ غرضکہ جہانتک انکشافات علمی اور ذہنی کا تعلق ہے، شمع اردو زبان میں پیش پیش رہا، اور تاریخی مضامین کے اعتبار سے تو یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ملک میں صرف یہی ایک رسالہ ہے جو تاریخی تحقیقات کا علم بردار ہے۔ اس سال پچیس تصاویر دی گئیں جنمیں ایک رنگین بھی تھی۔

غرض اس مختصر خاکہ سے صرف اسقدر ہے کہ ہجوم افکار میں بھی شمع کا معیار بلند ہی ہوتا گیا۔ اور سال کے آخر تک تقریباً چودہ سو صفحات کا پاک اور صاف لٹریچر شایع ہوا۔

گو میں رہا، رہین ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

"شمع" کے اجراء کی اہم غرض یہ ہے کہ مدیران شمع اور معاونین شمع کے درمیان ایک علمی رابطہ اتحاد اور تبادلۂ خیالات کا مستقل ذریعہ قائم ہوجائے۔ اس معاملہ مین ہم کو مایوس نہ ہونا پڑا۔ اور ملک کی اطراف و جوانب سے انگریزی دان حضرات نے اُردو مین مضامین لکھنے کی زحمت گوارا فرمائی۔ کئی مثالین تو حیرت انگیز ہین یعنی جو نوجوان، انگلستان کی تعلیم حاصل کر کے، اُردو کو بالکل فراموش کر چکے تھے وہ بھی متوجہ ہوگئے۔ شمع کی بہترین کوشش یہ ہے کہ انگریزی دان حضرات کی طبیعتین اُردو سے اُچاٹ نہ ہونے پائین، اور اُن کو اس کی ترقی اور احیا مین عملی حصہ لینے کا شوق پیدا ہو۔ الحمدللہ یہ بھی مشکور ہو رہی ہے۔

اسی سلسلہ مین ایک اہم سوال یہ ہے کہ "آیندہ ہمارا طرز عمل کیا ہوگا؟" اس کے متعلق صاف صاف عرض کر دینا ضروری ہے کہ جہانتک رسالہ کے قیام کا تعلق ہے، ناظرین کرام کو کبھی متفکر نہ ہونا چاہئے، لایق مدیران نے اسکو بہت شوق سے جاری کیا ہے اور جاری رکھین گے، چنانچہ باوجود کثیر مالی نقصانات کے، جو مدیران اور خاکسار مینیجر کو پہونچتے رہے ہین، اور مستقلاً پہنچ رہے ہین۔ ہم نے کبھی شکایت نہ کی، کیونکہ جو لوگ اُردو مین رسائل کے نکالنے کا تجربہ رکھتے ہین وہ اچھی طرح جانتے ہین کہ علمی اور ادبی رسالہ کی اشاعت سے اس ملک مین کسی مالی فائدہ کی توقع رکھنا بدترین حماقت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے شمع کو کبھی تجارتی ڈھنگ پر نہ ڈالا لیکن نقصانات کی بھی ایک حد ہوا کرتی ہے، شمع کی پانچوین جلد شروع ہوتی ہے لیکن اس عرصہ مین ایک مہینہ بھی ایسا نہین گذرا جسمین مالی نقصانات سے سابقہ نہ پڑا ہو۔ اسمین کلام نہین کہ جوں جوں وقت گذرتا گیا رسالہ کی یافت مین بھی ترقی ہوتی گئی۔ لیکن اسی کے ساتھ رسالہ کا کام بھی بڑھتا گیا اور اخراجات بھی زیادہ ہوتے چلے گئے۔ معمولی سوالات کے جوابات کی ہم سے توقع کی جاتی ہے، اور اگر ہم جواب

نہ دین تو اسکو بد اخلاقی پر محمول کیا جاتا ہے - ڈاک کے اخراجات کی زیادتی، دفتر کے عملہ مین ترقی ہے کے علاوہ خود شمع کے مصارف مین بہت اضافہ ہوگیا ہے - جو رسالہ ہم نے ۸۰ صفحات کا نکالا تھا اب ۱۱۲ صفحات کا ہے اور اب ہر ماہ تصاویر کے ساتھ چھپتا ہے - مانگے تانگے کے بلاکس سے ہم نے حتی الوسع گریز کیا چنانچہ ہر مہینہ ہم کو کثیر رقم اپنے بلاکس کے بنوانے اور اُن کے چھپوانے مین صرف کرنی ہوتی ہے - اور پھر اُن سب سے قطع نظر اہل پریس اور کاتبون کی عنایتون سے بھی ہر ماہ کچھ نہ کچھ نقصان اٹھانا پڑتا ہے - اس موقع پر یہ شکایت بیجا نہ ہوگی کہ ہم کو مفت مین اُن حضرات کی عدم توجہی سے بہت زیادہ زیر بار ہونا پڑتا ہے - جو رسالہ کو منگا کر ڈاک خانہ مین جمع کرا دیتے ہین - اور وی پی کو نہین چھڑاتے - کئی کئی مرتبہ یاد دہانی کی نوبت آتی ہے اور عموماً رسالہ واپس آتا ہے - رسالہ کی خریداری کو وہ ہم پر احسان کرنے کی برابر سمجھتے ہین، اور اخلاق سے اسقدر بیگانہ ہین کہ ایک پوسٹ کارڈ کا بیرنگ بھیجنا بھی اُن کے لئے عار ہے - حالانکہ اُنکی ذراسی غفلت سے شمع کو سخت نقصان پہونچ جاتا ہے - اور اگر سال بھر کے ایسے نقصانات کی میزان کی جائے تو ہر سال کئی سو روپیہ مفت مین ڈاک خانہ کو نذر کرنے پڑتے ہین اور کام الگ پھیل جاتا ہے - کاش کہ یہ رقم شمع کی ترقی مین صرف ہوا کرتی! امسال صرف اسی قسم کے نقصانات کی تعداد بقدر ۶۰۰ روپیہ ہے ہم اس معاملہ مین کبھی لب کشائی نہ کرتے لیکن جیسا کہ اوپر عرض کر چکے ہین نقصان کی بھی حد ہوا کرتی ہے - ہمارے لئے یہی امر کافی ہے کہ ہم اپنا وقت صرف کرتے ہین اور طرح طرح سے نقصانات اٹھاتے ہین - اور ہر مہینہ اپنے شوق اور آپکی خاطر داری کی پاداش مین زیر بار ہوتے ہین - اگر ہمارے دوستون نے اس طرف توجہ نہ فرمائی تو ہم آئندہ رسالہ کو وی پی کے ذریعہ سے بھیجنا قطعی بند کر دین گے - اور جبتک زر چندہ بذریعہ منی آرڈر وصول نہ ہو جائے گا، رسالہ کا ایک نمبر بھی ارسال نہ ہوگا -

افسوس ہے کہ آپ بیتی کے بیان نے بہت وسعت اختیار کر لی، اور ہم کو چند ناگوار گرم و سرد

امور کے اظہار کی ضرورت محسوس ہوئی۔ بہرکیف سال رواں ختم ہوتا ہے اور اپنی کلفتوں اور زمانہ کی پریشانیوں کے ساتھ ہم سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہوتا ہے۔ امید ہے کہ آیندہ سال گوناگون خوشیوں کا حامل ہوگا۔ اور ہم رسالہ کو زیادہ دلچسپ اور زیادہ شاندار بنا سکیں گے۔ ہمارا ارادہ ذاتی پریس قائم کرنے کا ہو رہا ہے اور اب تک اسی امید میں رہے کہ یورپ سے خوبصورت خط نسخ کا ٹائپ مل جائے تو پریس قائم کریں۔ مگر افسوس ہے کہ ابھی چندے اور توقف کرنا ہوگا۔ لیکن یقین ہے کہ یہ عرصۂ انتظار زیادہ نہ ہوگا۔ اور بہت جلد شمع خط نسخ میں، یا اگر جرمنی میں کوششیں کامیاب ہوگئیں تو خط نستعلیق کے ٹائپ میں آپکی خدمت میں حاضر ہوا کرے گا۔

جو کچھ ہمارے امکان میں تھا ہم نے کیا، کر رہے ہیں، اور کریں گے، لیکن کیا ہماری ان تمام کاوشوں کا یہ معاوضہ بھی آپ نہ دیں گے کہ شمع کے لئے ایک ایک خریدار فراہم کر دیں، تاکہ ہم اس کا حجم اسی قیمت پر اور بڑھا دیں، اور نہایت دلچسپ اور مفید مضامین اور تصاویر میں اضافہ کر سکیں۔

سال آیندہ کے لئے ہم نے جو انتظامات کئے ہیں وہ یقیناً بہت ہمت افزا ہیں۔ چنانچہ نسان اردو، اور شعراء و امراء اودھ کا جو سلسلہ سال رواں میں جاری نہ ہو سکا جنوری ۱۹۲۷ء سے شروع ہو جائے گا۔ اور اس امر کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے کہ مضامین کے ہمراہ تصاویر بھی شائع ہوتی رہیں۔ چنانچہ متعدد مضامین کے لئے ہم نے بلاک بنوائے ہیں، انکشافات علمی اور ذہنی کے لئے غالباً یہ طریقہ نہایت موثر ہوگا، اور یہ تصاویر مستقل دلچسپی کا ذریعہ ہونگی، ہم نے قصداً ایسی تصاویر سے اجتناب کیا ہے جو محض فوری دلچسپی کا تو باعث ہوتی ہیں لیکن چندنوں کے بعد اون کی جگہہ صرف ردی کی ٹوکری میں نظر آتی ہے اور نہ ہم ایسی تصاویر کو کبھی پبلک کے سامنے پیش کریں گے جنکی قدامت، یا جن کے معتبر ہونے میں کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجایش

ہوگی۔ آج کل تو عام رواج ہے کہ حال کی بنی ہوئی تصاویر کو قدیم تاریخی ناموں کے ساتھ فخریہ پیش کیا جاتا ہے۔ حالانکہ فن مصوری سے واقف کار بلا تأمل کسی چھپی ہوئی تصویروں میں بھی امتیاز کر سکتے ہیں کہ یہ جدید ہے یا قدیم! مگر افسوس ہے ان کی بابت پر جو ان تصاویر کو اصلی بتا کر بہ رسالوں میں نکال رہے ہیں اور عوام میں وہ تصاویر مقبول ہو رہی ہیں۔ ہم نہایت صفائی سے عرض کئے دیتے ہیں کہ شمع کے مجاہدات اور اختراعات واقعہ ہرگز متحمل نہ ہوں گے۔ اور نہ شمع ایسے لوگوں کا ملبی جاری ہے جو ظاہری اور بناوٹی آب و رنگ سے متاثر ہو کر رسالہ اور اسکی زیبائش کو تھوڑی دیر میں فراموش کردیں۔

ہم شمع کے اس امتیاز کو جو تاریخی مضامین کی وجہ سے اسکو حاصل ہے، قائم رکھیں گے اور چونکہ اچھے تاریخی مضامین کی گنجائش ہے اس لئے ہم انکی اشاعت میں خاص طور سے دلچسپی لینگے اور اگر حضرات مضامین نگار مضامین کے ساتھ تاریخی تصاویر کی اشاعت ضروری سمجھیں گے تو ہم تصاویر کے اخراجات کو بھی بخوشی برداشت کریں گے۔ امید ہے کہ قارئین کرام اس طرف ضرور توجہ فرمائیں گے اور سال نو کی آمد کے ساتھ شمع کی اعانت بھی فرمائیں گے۔

چونکہ شمع کی موجودہ سائز پر تصاویر کی چھپائی میں دشواریاں ہوتی تھیں اور اکثر مضامین بھی شائع ہونے سے رہ جاتے تھے اسلئے جنوری ۱۹۲۷ء سے شمع کا حجم بڑھا دیا گیا ہے، اور قیمت سالانہ سے چھ روپیہ میں کوئی اضافہ نہیں کیا گیا ہے۔

منیجر شمع

ایک

باوقار اور کامیاب رسالہ

اشتہار کی کامیابی

کا یقینی ذریعہ ہے

جو اشتہار شمع میں چھپتے ہیں

ہندوستان کے ہر حصہ میں پہنچ جاتے ہیں۔ بہترین لوگوں کی نظر سے گذرتے ہیں۔ قابل اعتماد سمجھے جاتے ہیں۔ ان پر اعتماد کیا جاتا ہے۔ رسالہ کے ساتھ محفوظ رکھے جاتے ہیں۔ تاکہ آئندہ بھی کام آویں۔ شرح اجرت کے لئے سرورق کی پشت ملاحظہ فرمائیے

(منیجر)

مطبوعات جدید

پر

نہایت توجہ اور احتیاط کے ساتھ **شمع** میں ریویو لکھے جاتے ہیں! شمع اردو زبان کا رسالہ
ہے جس کا فرض ہے کہ اردو مطبوعات کو پبلک کے سامنے لائے اور مصنفین و اہالیان
مطابع، اور تاجران کتب کی ہمت افزائی کرے، شمع کی روز افزوں
اشاعت اور ہر دلعزیزی اس امر کی ضامن ہیں کہ آپ کی کتاب
پر جو ریویو اسمیں شائع ہوگا وہ توجہ کے ساتھ ہزاروں
جگہ پڑھا جائیگا، آپ کی کتاب پر محنت اور
کوشش سے ریویو لکھا جائیگا اور یقین ہے
کہ آپ ہماری اس ادبی توجہ سے
اسطرح فائدہ حاصل کرینگے

منیجر

گذارش

قارئین کرام ملاحظہ فرمائینگے کہ شمع میں جو تصاویر شائع ہوئی ہیں اپنی مخصوص خوبیوں کے لحاظ سے کسی تعریف کی محتاج نہیں ہیں۔ ہم نے اسپر بھی قناعت نہیں کی اور اس اصول کو پیش نظر رکھ کر کہ دنیا میں ترقی نہایت ضروری ہے۔ ایسی تصاویر فراہم کی ہیں جو یقیناً بے مثل ہیں اور اُن کے بلاک انگلستان میں تیار کرائے ہیں۔ عہد مغلیہ کی مشہور اور نادر الوجود تصاویر اودھ کے بادشاہ اُن کے اُمرا اور شعرا کے مرقعے۔ تاریخی اور یادگار تصویریں۔ غرضیکہ یہ ایک ایسا دلچسپ خزانہ ہے جس کی اشاعت بہرطور ایک علمی خدمت ہے اور جس کو پبلک کے سامنے لانے میں ہم نے کثیر اخراجات کا مطلق خیال نہیں کیا۔

عمدہ اور پاکیزہ مضامین فراہم کرنا بیحد دشوار ہوتا ہے لیکن الحمد للہ ہم نے اس خدمت کو بھی بہ حسن و خوبی انجام دیا اکثر مضامین دیگر زبانوں میں ترجمہ ہو کر شائع ہوئے ہیں اور اردو کے متعدد اخبارات اور رسائل کے حوالہ دیکر اور اکثر بلاحوالہ اور بعض اوقات ہمارے مضامین کو تخفیف و تحریف کرکے بلاتکلف شائع کر دیا۔ صحافت کے اعتبار سے اس قسم کے افعال کسی حیثیت سے ہوں مگر ہم کو مسرت ہے کہ ملک نے ہماری کوششوں کی قدر کی۔

شمع اگر ہمارا علمی مشغلہ ہے تو آپکی دلچسپیوں اور دماغی ضیافتوں کا بھی ذریعہ ہے کیا شمع آپ کی علو ہمت۔ فراخدلی اور علمی فیاضی سے اسقدر توقع بھی نہ رکھے اس کو مستحکم بنانے میں آپ اپنے احباب کو خریداری پر آمادہ فرمادیں۔

یاد رفرمائیے کہ

شمع کے خریداران میں جسقدر اضافہ ہوگا اسی قدر شمع کے حجم اور تصاویر میں اضافہ ہوگا۔ کیونکہ شمع کی آمدنی اسی میں صرف ہوتی ہے۔ آپ اپنی اعانت سے کسی کو ذاتی یا شخصی فائدہ پہونچائیں گے۔ بلکہ خود اپنی اور اپنے احباب کی دلچسپیوں کے شاندار انتظام میں مدد دینگے

اور یہ سب کچھ

محض آپ کی ادنیٰ توجہ پر منحصر ہے

منیجر شمع

عرض حال

ہندوستان کی تاریخ میں وہ عہد زریں بھی گذر چکا ہے جبکہ اہل ہند کیا بلحاظ علم وفضل اور بلحاظ فنون لطیفہ و سائنس. خدا کی خدائی میں کسی سے پیچھے نہ تھے۔ انکی معاشرتی زندگی خرافات سے پاک تھی۔ ان کا نظام حکومت قوی تھا جس میں تنگ دلی کی گنجائش نہ تھی اور اُن کی حکومت رعایا کے لئے رحمت تھی لیکن وہ زمانہ اب خواب وخیال سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا ہے یعنی ماضیہ کے ہمارے تاریخی کارنامے محض افسانے ہیں! آج دنیا کی دیگر اقوام میدان ترقی میں فروغ حاصل کر رہی ہیں اور ہم تاریکی میں اُن کے پیچھے بھٹکتے پھر رہے ہیں۔ ہماری روحانی اور مادی عسرت سے متاثر ہوکر انگلستان کے ایک مضمون نگار مسٹر ولیم آرچر کو کہنا پڑا کہ ہم ہندیا تو دنیا کی مہذب اقوام میں سب سے زیادہ غیر تربیت یافتہ ہیں۔ یا سب سے زیادہ مہذب ہیں۔

ہماری قومی زندگی کے انحطاط کے ساتھ ہمارا قومی ادب بھی برباد ہوگیا۔ چنانچہ فی زمانہ حصول علم کی راہیں مسدود۔ ہمارے متقدمین کے علمی کارنامے فراموش اور ان کی بے مثل تصانیف کرم خوردہ یا احسان فراموش اولاد کی نالائقی کے باعث فروخت ہوکر اغیار کے کتب خانوں کی رونق ہیں۔

ہم کو اپنی بدنصیبی سے انکار نہیں لیکن ہمت اور استقلال کے ساتھ اُن خرابیوں کو جو شاہراہ ترقی میں حائل ہیں رفع کرنیکے مستحکم تہیہ کے مقابلہ میں بدقسمتی یا بدنصیبی کی شکایت کوئی نہیں رہتی ہے جس طرح مریض کے لئے سابقہ زندگی کے بدلنے کے واسطے مرض کا وجود باری تعالیٰ کی جانب سے تنبیہ کا حکم رکھتا ہے اسی طرح ایک قوم کی بدقسمتی دعوت آسمانی ہے کہ وہ اپنی اصلاح کی طرف متوجہ ہو۔

ہماری قومی حیات کے لئے منجملہ دیگر اصناف کے "ادب" کی تجدید تعمیر کی بھی ضرورت ہے اور اس مرتبہ کے لحاظ سے جو خوش نصیبی سے ہندوستانی زبان کو حاصل ہے ہماری قومی زبان بننے کی اس میں صلاحیت بدرجہ اتم موجود ہے لیکن جب تک اسکو حصول علم کا مستقل ذریعہ قرار دیکر اس کے ادب کو دنیا کی اور زبانوں کی طرح وسعت نہ دی جاتے کامیابی ممکن نہیں ہے

سائنس کے جدید ترین انکشافات سے لیکر دنیا کی قدیم ترین اقوام کی فراموش شدہ تاریخ میں نہایت ابتدائی تحقیقات تک ایک انگریز کو اپنی مادری زبان میں مل سکتی ہیں اسی طرح عہدہائے ماضی و حال کے ذہنی انکشافات یعنی ہنود اور بدھ حکماء کی نصائح سے شروع کرکے گوئٹے کی شاعری اور افلاطون کے فلسفہ کی تمام مفید اور محرک غور و فکر خصوصیات اُسکے پیش نظر رہتی ہیں لیکن ہر ایک اردو داں ان نعمتوں سے محروم ہے اور یہی وجہ ہو کہ اس کا مبلغ علم اس کی زبان کی طرح محدود ہے۔

کارکنان شمع کی دلی تمنا ہے کہ ادب اردو کی خدمت میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھیں اور اس کے فروغ اور ثبات کے لئے امکانی کوششوں سے دریغ نہ کریں اسی لئے پبلک کے سامنے لمبے چوڑے مقاصد کا اظہار ہمارے لئے زیبا نہیں ہو البتہ ہم اسقدر ضرور عرض کرینگے کہ اسقدر قلیل مدت میں شمع نے جو ہر دلعزیزی اور کامیابی حاصل کی ہے اور جس خلوص اور جوش کے ساتھ ملک کے مقتدر جرائد اہل الرائے حضرات نے شمع کا خیر مقدم کیا ہے اس کی بناء پر یقین ہے کہ اہل وطن ہمارے مقاصد کو کامیاب بنانے میں ہماری امداد دلسے دل سے کریں گے۔ اور بہت جلد اسکو ملک کا نہایت کامیاب رسالہ بنا دیں گے حصول مقصد سے قبل نہ ہم کسی تعریف کے مستحق ہیں اور نہ طلب گار۔ لیکن ہم اس اصول کو کبھی فراموش نہ کریں گے کہ ناظرین کے خیالات میں غور و فکر کی تحریک پیدا کردینا رسالہ کا اصلی مقصد ہے۔

ادب اردو میں ایک بڑا نقص ہے جو بدقسمتی سے ہنوز موجود ہے وہ یہ کہ زبان کو اظہار خیالات کا ذریعہ بنانے کے بجائے محض زبان کی طرف توجہ کیجاتی ہے اس بارے میں ہم اپنی کسی ذاتی رائے سے ناظرین کو پابند نہیں کرتے ہیں۔ ہم ناظرین کے سامنے ایسے مضامین پیش کرتے ہیں جو معقول اور سنجیدہ رائے قائم کرنے میں معاون ہوں۔ اسی خیال سے ہمنے بھی اپنے لئے کوئی حد مقرر نہیں کی ہے۔ اس رسالہ میں ہر قسم کے مضامین کیواسطے جگہ موجود ہے تاریخ، فلسفہ، سیاست، سائنس، مذہب، تنقید وغیرہ وغیرہ کے متعلق ہم اس قسم کے مضامین شائع کرتے ہیں جن سے فی زمانہ ایک تعلیم یافتہ آدمی کو دلچسپی ہوتی ہے یا ہونی چاہئے۔

شمع کا اجرا کسی ذاتی مقصد کی غرض سے نہیں کیا گیا ہے اور نہ کسی مالی فائدہ کی نیت سے ہماری کاوشوں اور صرف شدہ زندگیوں کے لمحات کا بہترین معاوضہ اور ہماری تمناؤں کی حقیقی کامیابی یہ ہے کہ شمع اپنے نام کی صحیح معنوی رعایت کے ساتھ محرک خیالات ثابت ہو۔ اور یہ روشنی محفل ادب کے بعید ترین گوشوں میں بھی پہنچ سکے۔ اس عرض حال کے ذریعہ سے ہم اپنی صدا تمام ملک میں پہنچانا چاہتے ہیں۔ اور بہ وثوق یقین کرتے ہیں کہ ادب اردو کے سچے ہی خواہ ہماری حوصلہ افزائی فرمائیں گے اور شمع کی توسیع اشاعت میں اعانت فرمانا فرض تصور فرمائیں گے۔

خاکساران

محمد حبیب (آکسن) ایم۔ آر۔ اے۔ ایس۔ بیرسٹرایٹ لا پروفیسر تاریخ و سیاسات مسلم یونیورسٹی علی گڈھ۔

حسن عابد جعفری (آکسن) بیرسٹرایٹ لا ایڈووکیٹ

مدیران شمع۔ حسن منزل شاہ گنج آگرہ

اورینٹل کالج میگزین

ایک سہ ماہی علمی رسالہ

اغراض و مقاصد اس رسالہ کے اجراء سے غرض یہ ہے کہ احیا و ترویج علوم مشرقیہ کی تحریک کو تا حد امکان تقویت دیجاوے اور خصوصیت کیساتھ اُن طلبہ میں شوق تحقیق پیدا کیا جائے جو سنسکرت۔ عربی۔ فارسی اور دیسی زبانوں کے مطالعہ میں مصروف ہیں۔

کس قسم کے مضامین کا شائع کرنا مقصود ہے فقط اُنہی مضامین کو شائع کیا جاتا ہے جو مضمون نگاروں کی ذاتی تحقیق کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ غیر زبانوں مثلاً فرنچ۔ جرمنی۔ اطالی وغیرہا سے مفید مضامین کا ترجمہ بھی وقتاً فوقتاً شائع کیا جاتا ہے اور کم ضخامت کے بعض مفید قلمی رسالے بھی شائع ہوتے رہتے ہیں۔

رسالے کے دو حصے یہ رسالہ دو حصوں میں شائع ہوتا ہے۔ حصہ اردو۔ حصہ ہندی۔ ہر ایک حصہ

وقت اشاعت یہ رسالہ ہر سال میں چار بار یعنی ستمبر۔ نومبر۔ فروری اور مئی میں شائع ہوتا ہے۔

قیمت اشتراک سالانہ چندہ مکمل رسالہ کیلئے عہ ہے۔ ہر حصہ کیلئے الگ الگ عہ ۱۲؍

خط و کتابت و ترسیل زر خرید رسالہ کے متعلق جملہ خط و کتابت اور ترسیل زر پرنسپل اورینٹل کالج لاہور کے نام ہونی چاہئے۔ مضامین کے متعلق جملہ مراسلات چیف ایڈیٹر کے نام بھیجنے چاہئیں۔

محل فروخت یہ رسالہ اورینٹل کالج لاہور کے دفتر سے خریدا جا سکتا ہے۔

قلم تحریر چیف ایڈیٹر پروفیسر محمد شفیع ایم۔ اے وائس پرنسپل اورینٹل کالج لاہور حصہ اردو ڈاکٹر محمد اقبال ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی کی اعانت سے مرتب ہوتا ہے۔ حصہ سنسکرت و ہندی کے ایڈیٹر ڈاکٹر لکشمن سروپ ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی اور حصہ پنجابی کے ایڈیٹر بھائی بے انت سنگھ بی۔ اے ہیں۔

منیجر اورینٹل کالج میگزین لاہور

گذارش

قارئین کرام ملاحظہ فرمائنگے کہ شمع میں جو تصاویر شائع ہوتی ہیں اپنی مخصوص خوبیوں کے لحاظ سے کسی تعریف کی محتاج نہیں ہیں۔ ہم نے اسپر بھی قناعت نہیں کی اور اس اصول کو پیش نظر رکھکر کہ دنیا میں ترقی نہایت ضروری ہے۔ ایسی تصاویر فراہم کی ہیں جو یقیناً بیمثل ہیں اور ان کے بلاک انگلستان میں تیار کرائے ہیں۔ عہد مغلیہ کی مشہور اور نادر الوجود تصاویر اودھ کے بادشاہ ان کے امرا اور شعرا کے مرقعے۔ تاریخی اور یادگار تصویریں۔ غرضیکہ یہ ایک ایسا دلچسپ خزانہ ہے جس کی اشاعت بہرطور ایک علمی خدمت ہے اور جس کو پبلک کے سامنے لانے میں ہم نے کثیر اخراجات کا مطلق خیال نہیں کیا۔

عمدہ اور پاکیزہ مضامین فراہم کرنا بہت دشوار ہوتا ہے لیکن الحمد للہ ہم نے اس خدمت کو بھی بہ حسن و خوبی انجام دیا اکثر مضامین دیگر زبانوں میں ترجمہ ہو کر شائع ہوئے ہیں اور اردو کے متعدد اخبارات اور رسائل نے حوالہ دیکر اور اکثر بلا حوالہ اور بعض اوقات ہمارے مضامین کو تخفیف و تحریف کرکے بلا تکلف شائع کر دیا۔ صحافت کے اعتبار سے اس قسم کے افعال کسی حیثیت کے ہوں مگر ہم کو مسرت ہے کہ ملک نے ہماری کوششوں کی قدر کی۔

شمع اگر ہمارا علمی شغلہ ہے تو آپکی دلچسپیوں اور دماغی ضیافتوں کا بھی ذریعہ ہے کیا شمع آپ کی علو ہمت۔ فراخدلی اور علمی فیاضی سے اسقدر توقع بھی نہ رکھے اس کو مستحکم بنانے میں آپ اپنے احباب کو خریداری پر آمادہ فرمادیں۔

باور فرمائیے کہ

شمع کے خریداران میں جسقدر اضافہ ہوگا اسی قدر شمع کے حجم اور تصاویر میں اضافہ ہوگا۔ کیونکہ شمع کی آمدنی اسی میں صرف ہوتی ہے۔ آپ اپنی اعانت سے کسی کو ذاتی یا شخصی فائدہ پہونچائیں گے۔ بلکہ خود اپنی اور اپنے احباب کی دلچسپیوں کے شاندار انتظام میں مدد دینگے

اور یہ سب کچھ

محض آپ کی ادبی توجہ پر منحصر ہے

مینجر شمع

عرض حال

ہندوستان کی تاریخ میں وہ عہد زریں بھی گذر چکا ہے جبکہ اہل ہند کیا بلحاظ علم وفضل اور بلحاظ فنون ولطیفہ وسائنس۔ خدا کی خدائی میں کسی سے پیچھے نہ تھے۔ انکی معاشرتی زندگی عوارض سے پاک تھی۔ ان کا نظام حکومت قومی تھا جس میں تنگ دلی کی گنجائش نہ تھی اور ان کی حکومت رعایا کے لئے رحمت تھی لیکن وہ زمانہ اب خواب وخیال سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا ہے نیز ماضیہ کے ہمارے تاریخی کارنامے محض افسانے ہیں! آج دنیا کی دیگر اقوام میدان ترقی میں فروغ حاصل کر رہی ہیں اور ہم تاریکی میں اُن کے پیچھے بھٹکتے پھر رہے ہیں۔ ہماری روحانی اور مادی عسرت سے متاثر ہو کر انگلستان کے ایک مضمون نگار مسٹر ولیم آرچر کو کہنا پڑا کہ ہم یا تو دنیا کی مہذب اقوام میں سب سے زیادہ غیر تربیت یافتہ ہیں۔ یا سب سے زیادہ مہذب ہیں۔

ہماری قومی زندگی کے انحطاط کے ساتھ ہمارا قومی ادب بھی برباد ہو گیا۔ چنانچہ فی زمانہ حصول علم کی راہیں مسدود۔ ہمارے متقدمین کے علمی کارنامے فراموش اور ان کی بے مثل تصانیف کرم خوردہ یا احسان فراموش اولاد کی نالائقی کے باعث فروخت ہو کر اغیار کے کتب خانوں کی رونق ہیں۔

ہم کو اپنی بدنصیبی سے انکار نہیں لیکن ہمت اور استقلال کے ساتھ اُن خرابیوں کو جو شاہراہ ترقی میں حائل ہیں دفع کرنیکے مستحکم تہیہ کے مقابلہ میں بدقسمتی یا بدنصیبی کی شکایت کوئی نہیں رکھتی ہے جس طرح مریض کے لیے سابقہ زندگی کے بدلنے کے واسطے مرض کا وجود باری تعالیٰ کی جانب سے تنبیہ کا حکم رکھتا ہے اسی طرح ایک قوم کی بدقسمتی دعوت آسمانی ہے کہ وہ اپنی اصلاح کی طرف متوجہ ہو۔

ہماری قومی حیات کے لئے منجملہ دیگر اصناف کے "ادب" کی تجدید تعمیر کی بھی ضرورت ہے اور اس مرتبہ کے لحاظ سے جو خوش نصیبی سے ہندوستانی زبان کو حاصل ہے ہماری قومی زبان بننے کی اس میں صلاحیت بدرجہ اتم موجود ہے لیکن جب تک اسکو حصول علم کا مستقل ذریعہ قرار دیکر اس کے ادب کو دنیا کی اور زبانوں کی طرح وسعت نہ دی جائے کامیابی ممکن نہیں ہے

سائنس کے جدید ترین انکشافات سے لیکر دنیا کی قدیم ترین اقوام کی فراموش شدہ تاریخ میں نہایت ابتدائی تحقیقات تک ایک انگریز کو اپنی مادری زبان میں مل سکتی ہیں اسی طرح عہد ہائے ماضی و حال کے ذہنی انکشافات یعنی ہنود اور بدھ حکما کی نصائح سے شروع کر کے گوئٹے کی شاعری اور افلاطون کے فلسفہ کی تمام مفید اور محرک غور و فکر خصوصیات اسکے پیش نظر رہتی ہیں لیکن ہر ایک اردو داں ان نعمتوں سے محروم ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کا مبلغ علم اس کی زبان کی طرح محدود ہے۔

کارکنان شمع کی دلی تمنا ہے کہ ادب اردو کی خدمت میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھیں اور اس کے فروغ اور ثبات کے لئے امکانی کوششوں سے دریغ نہ کریں اسی لئے پبلک کے سامنے لمبے چوڑے مقاصد کا اظہار ہمارے لئے زیبا نہیں ہے البتہ ہم اسقدر ضرور عرض کرینگے کہ اسقدر قلیل مدت میں شمع نے جو ہر دلعزیزی اور کامیابی حاصل کی ہے اور جس خلوص اور جوش کے ساتھ ملک کے مقتدر جرائد اہل الرائے حضرات نے شمع کا خیر مقدم کیا ہے اس کی بناء پر یقین ہے کہ اہل وطن ہمارے مقاصد کو کامیاب بنانے میں ہماری امداد سچے دل سے کریں گے۔ اور بہت جلد اسکو ملک کا نہایت کامیاب رسالہ بنا دیں گے حصول مقصد سے قبل نہ ہم کسی تعریف کے مستحق ہیں اور نہ طلب گار۔ لیکن ہم اس اصول کو کبھی فراموش نہ کریں گے کہ ناظرین کے خیالات میں غور و فکر کی تحریک پیدا کر دینا رسالہ کا اصلی مقصد ہے۔

ادبِ اردو میں ایک بڑا نقص ہے جو بدقسمتی سے ہنوز موجود ہے وہ یہ کہ زبان کو اظہار خیالات کا ذریعہ بنانے کے بجائے محض زبان کی طرف توجہ کیجاتی ہے۔ اس بارے میں ہم اپنی کسی ذاتی رائے سے ناظرین کو پابند نہیں کرتے ہیں۔ ہم ناظرین کے سامنے ایسے مضامین پیش کرتے ہیں جو معقول اور سنجیدہ راستے قائم کرنے میں معاون ہوں۔ اسی خیال سے ہم نے بھی اپنے لئے کوئی حد مقرر نہیں کی ہے۔ اس رسالہ میں ہر قسم کے مضامین کیواسطے جگہ موجود ہے تاریخ۔ فلسفہ۔ سیاست۔ سائنس۔ تہذیب وغیرہ وغیرہ کے متعلق ہم اس قسم کے مضامین شائع کرتے ہیں جن سے ہر ایک تعلیم یافتہ آدمی کو دلچسپی ہوتی ہے یا ہونی چاہئے۔

شمع کا اجرا کسی ذاتی مقصد کی غرض سے نہیں کیا گیا ہے اور نہ کسی مالی فائدہ کی نیت سے ہماری کاوشوں اور مصروفیتوں کی تمام تلافیات کا بہترین معاوضہ اور ہماری تمناؤں کی حقیقی کامیابی یہ ہے کہ شمع اپنے نام کی صحیح معنوی رعایت کے ساتھ محرک خیالات ثابت ہو۔ اور یہ روشنی محفل ادب کے بعید ترین گوشوں میں بھی پہنچ سکے۔ اس عرض حال کے ذریعہ سے ہم اپنی صدا تمام ملک میں پہنچانا چاہتے ہیں۔ اور بہ وثوق یقین کرتے ہیں کہ ادب اردو کے سچے بہی خواہ ہماری حوصلہ افزائی فرمائیں گے اور شمع کی توسیع اشاعت میں اعانت فرمانا فرض تصور فرمائیں گے۔

خاکساران

محمد حبیب (آکسن) ایم۔ آر۔ اے۔ ایس۔ بیرسٹر ایٹ لا پروفیسر تاریخ و سیاسات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

حسن عابد جعفری (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا ایڈووکیٹ

مدیران شمع۔ حسن منزل شاہ گنج آگرہ

اورینٹل کالج میگزین

ایک سہ ماہی علمی رسالہ

اغراض و مقاصد اس رسالہ کے اجرا سے غرض یہ ہے کہ احیا و ترویج علوم شرقیہ کی تحریک کو تا حد امکان تقویت دی جاوے اور خصوصیت کیساتھ ان طلبہ میں شوق تحقیق پیدا کیا جائے جو سنسکرت۔ عربی۔ فارسی اور دیسی زبانوں کے مطالعہ میں مصروف ہیں۔

کس قسم کے مضامین کا شائع کرنا مقصود ہے فقط انہی مضامین کو شائع کیا جاتا ہے جو مضمون نگاروں کی ذاتی تحقیق کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ غیر زبانوں مثلاً فرنچ۔ جرمنی۔ اطالی وغیرہا سے مفید مضامین کا ترجمہ بھی وقتاً فوقتاً شائع کیا جاتا ہے اور کم ضخامت کے بعض مفید قلمی رسالے بھی شائع ہوتے رہتے ہیں۔

رسالے کے دو حصے یہ رسالہ دو حصوں میں شائع ہوتا ہے۔ حصہ اردو۔ حصہ ہندی۔ ہر ایک حصہ

وقت اشاعت یہ رسالہ ہر سال میں چار بار یعنی ستمبر۔ نومبر۔ فروری اور مئی میں شائع ہوتا ہے۔

قیمت اشتراک سالانہ چندہ مکمل رسالہ کیلئے ۲ ہے۔ ہر حصہ کیلئے الگ الگ عہ ۱۲ر

خط و کتابت و ترسیل زر خرید رسالہ کے متعلق جملہ خط و کتابت اور ترسیل زر پرنسپل اورینٹل کالج لاہور کے نام ہونی چاہئے۔ مضامین کے متعلق جملہ مراسلات چیف ایڈیٹر کے نام بھیجنے چاہئیں۔

محل فروخت یہ رسالہ اورینٹل کالج لاہور کے دفتر سے خریدا جا سکتا ہے۔

اقلم تحریر چیف ایڈیٹر پروفیسر محمد شفیع ایم۔ اے وائس پرنسپل اورینٹل کالج لاہور حصہ اردو ڈاکٹر محمد اقبال ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی کی اعانت سے مرتب ہوتا ہے۔ حصہ سنسکرت و ہندی کے ایڈیٹر ڈاکٹر لکشمن سروپ ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی اور حصہ پنجابی کے ایڈیٹر بھائی بے انت سنگھ بی۔ اے ہیں۔

منیجر اورینٹل کالج میگزین لاہور

جناب کوی راج ودیہ وید بھوشن پنڈت ٹھاکر دت شرما وید موجد امرت دھارا کی تیار کردہ

چند ادویات خوبصورتی

اُبٹن جیت سوہنی رجسٹرڈ

اس اُبٹن کو غسل کے وقت استعمال کرنے سے چہرے کے بدنما داغ کیل چھائیاں وغیرہ دور ہو جاتی ہیں چہرے کی رنگت دن بدن نکھرتی چلی جاتی ہے اور تعریف یہ ہے کہ بہتر پڑتی ہے

قیمت عہ نمونہ ۲

دل سُندری حسن افزا رجسٹرڈ

یہ غسل کے بعد استعمال ہوتا ہے یہ ایک قسم کا روغن ہے جو چہرہ کو چمکاتا ہے اور داغ دکیل وغیرہ کو دور کرتا ہے غسل کے پہلے اُبٹن اور غسل کے بعد حسن افزا استعمال ہو تو کہنا ہی کیا ہے

قیمت ۱۲ نمونہ ۲

بشرس رجسٹرڈ

یہ دوائی صرف چہرے کی چھائیوں کے واسطے ہے اس سے چھائیاں دور ہو جاتی ہیں

قیمت عا نمونہ ۸

بال اُڑانے کی دوائی

اس دوائی کو پانی میں گھول کر لگانے سے ایک منٹ کے اندر نرم سے نرم جگہ سے بال بہ صفائی کمال جڑھ سے دور ہو جاتے ہیں۔ جس نے منگوایا تعریف کی

قیمت فی ڈبیہ ۶ نمونہ ۱

بال دور کرنے کی دوائی

(بال عمر بھر نہ اگیں)

اس دوائی کے ملنے سے بال عمر بھر نہیں اگتے ہیں بالوں کو صاف کر کے لگایا جاتا ہے اس سے آئندہ بال نکلنے بند ہو جاتے ہیں

قیمت عہ نمونہ نہیں ملتا

مکھ رعب رجسٹرڈ

مونچھیں بڑھانے کا تیل۔ یہ تیل نہ صرف مونچھوں کو بڑھاتا ہے بلکہ ہر ایک جگہ کے بالوں کو کھوئی بڑھاتا ہے اور ان کی سیاہی کو قائم رکھتا ہے اور ملائم بناتا ہے رعب دار چہرہ کیا اچھا معلوم ہوتا ہے

قیمت عا نمونہ ۴

باغ پھول تیل رجسٹرڈ

بالوں پر تمام تیلوں کا سرتاج ہے بالوں کو نرم و ملائم کرتا ہے بڑھاتا ہے سر کو ٹھنڈا رکھتا ہے صرف خوشبودار ہی نہیں بلکہ دماغ کے لیے نہایت مفید ہے

قیمت ایک روپیہ عہ

پران سکھ رجسٹرڈ

پستانوں کو ڈھلکنے سے بچاتا ہے اور ڈھلکے ہوؤں کو اصلی حالت پر لاتا ہے بڑے پستان واقعی عورت کے لئے وبال جان ہوتے ہیں۔

قیمت للعہ نمونہ عہ

المشتہر منیجر امرت دھارا اوشدھالیہ امرت دھارا روڈ امرت دھارا ڈاکخانہ امرت دھارا لاہور — خط و کتابت ذیل کے پتہ پر ہو

شواس کاس (دمہ و کھانسی خشک و تر)

یہ موذی امراض جو برسوں انسان کو گھن کی طرح کھاتی رہتی ہیں۔ اور اگرچہ جب جاویں مگر جیتے نہیں چھوڑتیں۔ ان کو بیخ و بنیاد سے اکھاڑنے کے واسطے کوی ودہ نید جیو شن پنڈت ٹھاکر دت شرما وید نے بہت تجربوں کے بعد مندرجہ ذیل ادویات کو تیار کیا ہے۔ جو ہزاروں کو صحت یاب کر چکی ہیں!

اکسیر دمن

بعض لوگ دمہ بلغمی یا دمہ کو بیخ و بن سے آرام آہستہ آہستہ ہوتا ہے مگر مستقل از حالت جسم کے ساتھ بڑھتی ہے تپ دق تک اس سے دور ہو جاتے ہیں ایک صحت لوگ یقین سمجھا ہے کہ آپ شفا کرتے ہیں جو زیادہ تر آتشہ ادویات ان کا نہیں دیتے بیچوں سے لیکر بوڑھے تک کو دیجاتی ہے۔ بمزاج ادویہ

جیا گڑکا

یہ دوائی بلغمی دمہ یا پرانی کھانسی کے واسطے تیار کی گئی جیسا قبض ساتھ ہو۔ ۴۰ سال کی عمر کے بعد تو اکسیر ہی ہے۔ مریض اول ہی دن آرام معلوم کرتا ہے گویا گولا ہی جیرن ہی ہے۔ اور جی۔ وید مقصد دشکم وغیرہ کو بھی نافع ہیں قیمت ۳۲ گولی عہ محصول ۴ موسم ہی موافق آجاتی ہے قیمت ایک روپیہ نصف ۱۲

گولی کھانسی

نئی کھانسی کے واسطے جبکہ خشک ہو گلے میں خراش ہو اکسیر ہے قیمت ۶۰ گولی عہ نمونہ ۲

گولی کھانسی روشی

نئی کھانسی کے واسطے جبکہ تر ہو قیمت ایک روپیہ نصف نمونہ ۴

راحت

کھانسی دمہ بلغمی و تر دونوں کے واسطے یکساں

میستو

یہ نایاب نئی دوائی ہے جو سفوف کی شکل ہے کھانسی خشک و تر خاص کر دق کی کھانسی یا دبا کر والی کسی بھی کھانسی کو بہت مفید ہے بس دق کو بہت فائدہ بخشتی ہے۔ اچھے پاؤں دوائی بڑے بڑے تجربوں کے بعد تیار ہوئی ہے کثرت دلیل آرام آجاتا ہے خوراک ایک ایک صبح و شام قیمت فی شیشی دو روپے ۱۰

چیون پراش اولیہ

دید کا مشہور نسخہ ہے بیدوں کا نسخہ تا کہ لوگ دیکھیں۔ سخت جاڑا بادی گرمی اور لوٹ والا ٹھنڈی کو دور کرتا ہے قیمت فی شیشی ایک روپیہ آٹھ آنہ

کف کیتو رس

تیار ہو یا کھانسی بلغمی کے واسطے بے نظیر ہے قیمت ایک روپیہ نصف نمونہ ۸

امرت دھارا

بیشو ہر ایک گھر میں رکھنے کے قابل ایک پال ہے جو ہر بیماری میں ہر قسم دمہ و کھانسی کو دور کرتی ہے۔ اگر کسی دوائی کے ساتھ رکھا جائے تو سونے پر سہاگہ ہے قیمت عہ نمونہ میں ڈالا جاتا ہے جسم کو چست کرتا ہے طاقت بڑھاتا ہے۔ گرم مزاجوں کے موافق ہے قیمت ایک پاؤ ۲ روپیہ ۱۲

المشتہر منیجر امرت دھارا اوشدھالیہ۔ امرت دھارا بھون۔ امرت دھارا روڈ۔ امرت دھارا ڈاک خانہ لاہور

خط و کتابت و تار کا پتہ امرت دھارا "دمہ" لاہور

مردوں کو مرد بنانیوالی چھہ اکسیرین

تیار کردہ پنڈت ٹھاکر دت شرما وید موجد امرت دھارا و مالک رسشد ھالیہ لاہور

اکسیر نمبر ۵۰ مقوی ادویات کی سرتاج ہے۔ دنیا میں اسکے برابر مقوی دوائی نہیں ملسکتی ہے چند دنوں کے اندر وہ طاقت دکھاتی ہے جو پہلے کبھی تجربہ نہ کی ہوگی خود بخود

دلیر رفتار بناتی ہے اول ہی دن آرام معلوم ہونے لگتا ہے قیمت ۴۰ گولی للعہ ۲۰ گولی للعہ

رسالہ امراض مخصوصہ مردان یا حصہ ب
مفصل بیان مردانگی امراض کی وجہ بہتر علامات و علاج
درج ہے جو آدھ آنہ کا ٹکٹ آنے پر مفت ملتا ہے
رسالہ امرت سنجیونی مشہور و معروف دوائی
امرت دھارا کا ذکر ہے وہ بھی مفت
ملتا ہے

المشتہر منیجر امرت دھارا اوشدھالیہ۔ امرت دھارا بھون۔ امرت دھارا روڈ۔ امرت دھارا ڈاکخانہ لاہور خط و کتابت کا پتہ امرت دھارا (۱۰) لاہور